خطوطِ سلیمانی

[illegible]

عصر مولانا

ندوی مرحوم کے علمی، ادبی، تاریخی

کے خطوط کا گراں قدر مجموعہ۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

اِنَّہٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّہٗ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

خطوطِ سلیمانی

علامۂ دہر نابغۂ عصر مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے
علمی، ادبی، تاریخی اور نجی خطوط کا گراں قدر مجموعہ

ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان
کراچی

جملہ حقوقِ تالیف و تدوین محفوظ

خطوطِ سلیمانی

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے خطوط کا گراں قدر مجموعہ

ناشر
ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان - کراچی ۷۵۸۰۰
طابع
المخزن پرنٹرز (مکتبہ رشیدیہ)، پاکستان چوک - کراچی ۱

اشاعت:
۱۹۹۳ء

قیمت:

ملنے کا پتا
(۱)
مکتبہ شاہد
علی گڑھ کالونی - کراچی ۴۱
(۲)
مکتبہ رشیدیہ
مرادا سٹریٹ - پاکستان چوک
کراچی ۱

فہرست

پیش لفظ — ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری ۹
مکتوب نگار: علامہ سید سلیمان ندوی — پروفیسر سید شفقت رضوی ۱۱
نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۷ ۱۴ر نومبر ۱۹۱۴ء تا ۱۴ر اپریل ۱۹۴۹ء ۲۲
مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ۲ ۱۴ر نومبر ۱۹۱۵ء تا ۲۹ر دسمبر ۱۹۱۵ء ۴۰
نواب سید علی حسن خاں ۹ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۶ء تا ۱۶ر جولائی ۱۹۲۳ء ۴۱
ایک نواب عالم کی موت ۴۸
نامعلوم ۱ ۲۳ر نومبر ۱۹۲۱ء ۵۰
محمد عبداللہ قریشی ۴ ۲۷ر جنوری ۱۹۲۳ء تا ۲۱ر نومبر ۱۹۳۱ء ۵۱
عبدالقیوم ابن عبدالحکیم ۱ ۲۷ر جنوری ۱۹۲۵ء ۵۴
پروفیسر میمن عبدالعزیز ۱ ۱۸ر مئی ۱۹۲۵ء ۵۵
ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ۵ ۲۲ر اگست ۱۹۲۵ء تا ۲۳ر جولائی ۱۹۳۹ء ۵۶
مولانا محمد عمر خان ۲ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۲۵ء تا ۲۴ر جولائی ۱۹۳۰ء ۶۰
ایک مجاہد کا ماتم ۶۵
خواجہ عبدالوحید ۱۲ ۲۷ر مئی ۱۹۲۷ء تا ۲۶ر نومبر ۱۹۴۶ء ۶۶
ہمایوں مرزا بیرسٹر ۱ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۲۷ء ۷۹
صغرا ہمایوں مرزا ۱ ۲۲ر 〃 〃 ۸۰
ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ۱۸ ۲۵ر مارچ ۱۹۲۸ء تا ۶ر مئی ۱۹۳۹ء ۸۱
حفیظ جالندھری ۱ ۲۸ر جنوری ۱۹۲۹ء ۶۰۵

میری اور مخزن کی تاریخ			۰۵
نصیر الدین ہاشمی	۸	۲۰؍ اپریل ۱۹۲۹ء تا ۸؍ اکتوبر ۱۹۳۷ء	۱۰۶
مولانا اشرف علی تھانوی	۳	——— ۱۹۲۹ء تا ۲۲؍ جنوری ۱۹۳۰ء	۱۱۲
موت العالم موت العالم			۱۱۶
علامہ امتیاز علی خاں عرشی	۸	۲۲؍ مارچ ۱۹۳۰ء تا ۱۹؍ مئی ۱۹۳۵ء	۱۲۹
ساغر نظامی	۱	۱۹؍ اکتوبر ۱۹۳۲ء	۱۳۲
اثر صہبائی	۱	۱۵؍ ستمبر ۱۹۳۳ء	۱۳۴
مولوی احید الدین نظامی	۱	۲۷؍ ستمبر ۱۹۳۳ء	۱۳۵
مولانا غلام رسول مہرؔ	۱	۹؍ نومبر ۱۹۳۴ء	۱۳۶
سید رئیس احمد جعفری	۱	۲۵؍ اپریل ۱۹۳۶ء	۱۳۸
نواب سید شمس الحسن	۳	۱۹؍ نومبر ۱۹۳۶ء تا ۱۹؍ مارچ ۱۹۴۲ء	۱۴۰
سید الطاف علی بریلوی	۱	۳؍ جون ۱۹۳۸ء	۱۴۲
محمد امین زبیری	۱۱	۱۲؍ دسمبر ۱۹۳۸ء تا ۳۱؍ اکتوبر ۱۹۴۳ء	۱۴۳
ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان	۶	۲۷؍ دسمبر ۱۹۳۸ء تا ۳۱؍ اکتوبر ۱۹۴۰ء	۱۵۱
مولوی نظام الدین حسین نظامی	۵	۱۱؍ مارچ ۱۹۳۹ء تا ۲۵؍ فروری ۱۹۴۱ء	۱۵۶
علامہ محمد حسین محوی	۱	۲۳؍ مارچ ۱۹۳۹ء	۱۵۸
مالک رام	۵	۲۲؍ اپریل ۱۹۴۰ء تا ۱۶؍ جون ۱۹۴۶ء	۱۵۹
سید ابو عاصم ابو خالد	۱	۳؍ اکتوبر ۱۹۴۰ء	۱۶۲
مولوی مشیت اللہ قادری	۱	۲۴؍ جنوری ۱۹۴۱ء	۱۶۴
سید وحید احمد قیصر ندوی	۱۷	۱۰؍ فروری ۱۹۴۲ء تا ۱۳؍ فروری ۱۹۴۹ء	۱۶۵
اسلم	۱	۱۴؍ نومبر ۱۹۴۶ء	۱۷۲
مولانا عبد الرزاق کان پوری	۱	۸؍ مارچ ۱۹۴۳ء	۱۷۷

ماتم گسار برامکہ کا ماتم			۱۷۷
مولانا سعید اشرف ندوی	۱	۱۸/ اکتوبر ۱۹۴۴ء	۱۸۲
ڈاکٹر غلام محمد	۱۸	۱۰/ ستمبر ۱۹۴۵ء تا اگست ۱۹۵۳ء	۱۸۴
مولانا محمد علی حیدرآبادی	۱۷	۲۷/ ستمبر ۱۹۴۵ء تا مارچ ۱۹۵۳ء	۱۹۶
عبدالعزیز کمال	۱	۲۵/ اگست ۱۹۴۶ء	۲۱۸
تمکین کاظمی	۱	۱۲/ نومبر ۱۹۴۶ء	
مفتی محمد ابراہیم فریدی سمستی پوری	۱	۱۳/ جون ۱۹۴۸ء	۲۱۹
پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	۱	۲۸/ جون ۱۹۵۲ء	۲۲۰
محمد حسین شمیم	۱	۲۰/ اکتوبر ۱۹۵۲ء	۲۲۲
مولوی عبدالباری ندوی	۲	۲۲/ جولائی ۱۹۵۲ء تا ...	۲۲۴
بیگم سید محمد شفیق دیسنوی	۱		۲۲۵
مولوی عبدالرحیم	۱		۲۲۷
شیخ وحید احمد بدایونی	۱		۲۲۸

تذکرہ مکتوب الیہم

۲۳۱

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

پیش لفظ

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کے علم وفضل کی شخصیات کی تعداد ہند و پاکستان کی تاریخ میں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے عہد کی علمی شخصیات میں سربرآوردہ تھے بلکہ اگر مسلم ہند کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اسلاف کرام کے بلحاظ احترام اور ان کی بزرگی کے کمال اعتراف کے ساتھ جن کا احترام خود حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ بہت زیادہ کرتے تھے، علمی خدمات کے میدان میں ان کے ہم رتبہ بہت تھوڑے نکلیں گے۔

انھوں نے اپنی علمی و ادبی تحقیقات سے بیسویں صدی کے پاک و ہند کو متقدمین کے لیے قابلِ رشک بنا دیا ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا کا اُردو خدمات کا میدان بہت وسیع ہے لیکن سید صاحب مرحوم نے اردو کے علمی مقام کو جو افتخار بخشا ہے، اور اپنی گوناگوں تحقیقات سے اس کے دامن کو جس طرح زرنگار کیا ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا کی عظمتوں کے اعتراف کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جامعیت، معیار اور مقدار کے اعتبار سے اتنا کام سرسید یا ان کے کسی رفیق کا نہیں۔ جب تک دنیا میں اردو زبان موجود رہے گی سید سلیمان ندوی کا نام اردو زبان کے محقق، محسن اور علم و فضل کی علامت کے طور پر زندہ رہے گا۔

حضرت سید صاحب کی عظمت کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عظیم دیوبند کے اخلاف کے حلقہ بگوش تھے اور ان کے کیریکٹر کی اس خوبی کی کوئی مثال موجود نہیں کہ ۱۹۳۵ء سے انھوں نے سلوک و تصوف کی جو راہ اختیار کی تھی اور جن صوفیانہ مشاغل میں انہماک پیدا ہو گیا تھا، اس نے کتاب و سنت میں تحقیق کے باب کو مسدود کر دیا تھا۔ اس دور میں انھوں نے اپنے متبعین کو قرآن و سنت کے اعتصام و تمسک کے بجائے اپنے پیر و مرشد کے افادات سے استفادے کی دعوت دی اور اپنے کسی مخلص و عزیز کی تنقید و التجا کی کوئی پروا نہ کی، اور اپنی عزیمت اور استقلال سے ثابت کر دیا کہ طمانیت قلب اور حسن خاتمہ کی ضمانت اگر ہے تو تصوف کے ذوقِ کامل اور مشاغل کے انہماک میں ہے نہ کہ تمسک بالکتاب والسنۃ میں۔ یہ حضرت کے کیریکٹر کی بہت بڑی خوبی ہے جس کا ادراک حضرت مخدوم کے خاص متبعین کے سوا کسی کو نہیں۔

اِن فضائلِ علمی اور خصائصِ سیرت کے باوجود حضرت سید صاحب کی شخصیت اور سیرت کے بعض پہلو ایسے تھے جن کی بنا پر وہ اپنے بہت سے کم تر علمی درجے کے معاصرین سے بھی بلند نہ ہو سکے۔ شخصیت کے یہ پہلو میری کتاب "مولانا سید سلیمان ندوی ــــ تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں" کا موضوع ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے سید صاحب علیہ الرحمہ کے بارے میں علمی کاموں کے جائزے اور خود حضرت مرحوم و مغفور کی تصنیفات و تحریرات خصوصاً ان کے خطوط کی تلاش

ہوئی۔ اس کوشش میں غیر مدوّن خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہوگیا۔ ان خطوط سے میں اپنی تنقید میں استدلال کروں گا لیکن اس سے پہلے یہ خطوط شائع کر دینا مناسب معلوم ہوا تاکہ حضرت سید صاحب کے عقیدت مندوں اور دوسرے شائقین کے سامنے موجود ہوں۔

حضرت مرحوم کے جو خطوط فراہم ہوئے ہیں، انھیں دو مجموعوں میں مرتب کر دیا ہے!

مکاتیبِ سلیمانی : علامۂ دوراں مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کے عالمانہ، ادیبانہ، محققانہ اور عارفانہ مکتوباتِ گرامی کا نادر مجموعہ۔

خطوطِ سلیمانی : علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور کے علمی، ادبی، تاریخی اور نجی خطوط کا گراں قدر مجموعہ۔

اس وقت خطوطِ سلیمانی کی تدوین و اشاعت کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ اپنے گوناگوں خصائص کی بنا پر شائقینِ علم میں خصوصاً سید صاحب مرحوم کے حلقۂ ارادت میں ضرور پسند کیا جائے گا۔

حضرت سید صاحب کی شخصیت اور کارناموں کے تعارف میں پروفیسر سید شفقت رضوی کے مضمون کے لیے شکرگزار ہوں۔ (ایس یش)

مکتوب نگار

علامہ سید سلیمان ندوی

بھارت کے صوبہ بہار میں ایک چھوٹی سی بستی ہے جس کی کھدائیوں سے برآمد ہونے والے آثار اس بات کی شہادت دیتے ہیں کسی وقت یہاں بدھ مت اور جین مت کے ماننے والے رہتے تھے۔ گیا کے مقام پر نروان پانے والے گوتم بدھ کے نام لیواؤں کی اس سرزمین کو اب دیسنہ کہا جاتا ہے جہاں ایک ایسے سپوت نے آنکھیں کھولیں جس نے اسلام کو نروان (وسیلہ نجات) سمجھا اور دوسروں کے لیے راہنما بنا۔ اس ہستیِ بے بدل و بے مثال نے سلیمان نام پایا۔ جسے دنیا علامہ سید سلیمان کے نام سے جانتی ہے۔

ابتدائی حالات:

بت پرستوں کی سرزمین دیسنہ کو توحید کے جن فرزندوں کے ذریعہ نئی شناخت ملی ان میں سید سلیمان ندوی کے بزرگ بھی شامل تھے۔ سید صاحب کے مورث اعلیٰ مشہد مقدس سے شہاب الدین غوری کے ہمراہ برصغیر آئے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ نے عہد اکبری میں بہار میں سکونت اختیار کی۔ ان کے صاحبزادہ میر عثمان نے دیسنہ کو آباد کیا۔ سادات کے اس خاندان نے ویرانوں میں علم کی شمع روشن کی اور تاریخ کے مختلف ادوار میں علوم و فنون میں نامور ہوئے۔ حکیم سید ابوالحسن کا تعلق سادات کے اسی خاندان سے تھا کئی پشتوں سے اس خاندان کا پیشہ طبابت تھا۔ ان کے دو صاحبزادے ہوئے سید ابوحبیب اور سید ابونجیب۔ سید ابونجیب سید سلیمان کے نام نامی سے مشہور ہوئے۔ ان کی ولادت ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو ہوئی۔ ان کے دادا میر محمدی نے ان کی تاریخ ولادت پر یہ قطعہ کہا تھا ؎

چو جستیم تاریخ او از خرد   یکایک سروشے ز تاریخ وصال
بگفتا کہ بیدار شد مصرعہ   شدہ مہر تاباں ز برجِ کمالے

۱۳۰۲ھ

دادا کی اس پیشین گوئی کو وہ برجِ کمال کے مہر تاباں ہوں گے۔ تاریخ نے سچ کر دکھایا۔ ان کے بھائی سید ابو حبیب ان سے تقریباً اٹھارہ سال بڑے تھے اس لیے والد کے علاوہ تربیت میں ان کا بھی اہم کردار رہا۔ ان کے والد بزرگوار زہد و تقویٰ کی وجہ سے خاص و عام میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور آداب و تہذیب میں قابلِ تقلید سمجھے جاتے تھے۔ وہ اسلام پور میں اور سید ابو حبیب دیسنہ میں طبابت کرتے تھے۔

تعلیم:

ابتدائی عمر میں سید صاحب بڑے بھائی کے زیرِ نگرانی رہے۔ انھوں نے فارسی اور عربی کی باقاعدہ تعلیم دینی شروع کی۔ ابتدائی زمانہ تعلیم میں بھائی عورتوں کی مجلس میں ان سے شاہ اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان پڑھوایا کرتے تھے ان کے ذہن پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان کا بیان ہے کہ علم کلام کے مسائل، اشاعرہ اور معتزلہ کے تنازعات، غزالی، رازی اور ابن رشد کے دلائل اسی زمانے میں یکے بعد دیگرے ان کی نگاہوں سے گزرے۔ انھوں نے اپنے ایک عزیز مولانا بشارت کریم سے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے خاندان میں مذہبی تعلیم کا رواج تھا لیکن دیسنہ کے زیادہ تر لڑکے انگریزی ذریعۂ تعلیم میں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کا وقت اپنے ہم عمر ایسے ہی لڑکوں میں گزرتا تھا اس لیے ابتدا ہی سے ان پر مشرق و مغرب کے اثرات یکساں مرتب ہوتے رہے۔

سید صاحب کی عمر ۱۲، ۱۳ سال کی تھی کہ ان کے بھائی نے حج بیت اللہ کا قصد کیا اس لیے ان کے والد انھیں اسلام پور لے آئے اور چند ماہ بعد مزید تعلیم کے لیے خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف بھیج دیا۔ یہاں وہ مولانا شاہ محی الدین کے زیرِ سایہ رہے ان سے ہدایہ پڑھی اور مولانا عبدالرحمٰن کاکوی سے شرح تہذیب کا درس لیا خانقاہ میں باقاعدہ مجالس سماع منعقد ہوا کرتی تھیں ان میں شرکت کی وجہ سے سید صاحب میں جذب کی کیفیت بھی پیدا ہوتی اور شعری ذوق بھی پروان

پڑھا۔ وہیں انھوں نے عبدالحلیم شرر کا ناول ”منصور و موہنا“ پڑھا جس نے دل پر بے حد اثر کیا اور ناول ختم کرنے پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

ایک سال بعد وہ حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ مولانا شاہ منور علی کے قائم کردہ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ بھیجے گئے جہاں مولوی مرتضیٰ احسین دیوبندی سے درس لیا۔ دربھنگہ میں طلبہ کی ایک انجمن میں تعلیم نسواں کے موضوع پر ایک مضمون پڑھا جو بعد میں الپنچ (پٹنہ) میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ گویا تحریر اور تصنیف کے جوہرِ قابل کا پہلا اثر تھا اور اس زمانے میں ان کے گاؤں میں ایک انجمن ”الاصلاح“ قائم تھی اس کے ایک جلسے میں انھوں نے ایک نظم پڑھ کر اپنے ذوقِ شعری کا اوّلین مظاہرہ کیا۔

ندوۃ العلما میں داخلہ:

فروری ۱۹۰۱ء میں انھوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں درجۂ ابتدائی سال دوم میں داخلہ لیا۔ اُن دنوں مولوی فاروق چریا کوٹی صدر مدرس تھے جو معقولات اور ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے مفتی عبداللطیف اور مولانا حفیظ اللہ جیسے اساتذہ بھی اس درس گاہ میں موجود تھے۔ اسی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے تمام تر جگر داری اور دماغ سوزی کے ساتھ شاہ عبدالعزیز دہلوی کا رسالہ عجالۂ نافعہ، حافظ ذہبی کا تذکرۃ الحفاظ، حافظ ابن حجر کی فتح الباری، امام مالک کا موطا، ابن قدیم کی الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون، ابن خلکان کی وفیات، شہرستانی کی الملل والنحل، ابن حزم کی فصل الملل والنحل، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ کا مطالعہ کر کے کم عمری اور طالب علمی میں اپنے آپ کو علماء کی صف میں شامل کر لیا۔ بالآخر ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصانیف نے وہ نقش جمایا کہ اس کے سامنے پچھلے تمام نقوش ماند پڑ گئے۔ بالآخر ۱۹۰۶ء میں تکمیل درسیات کے بعد ان کی دستار بندی ہوئی۔

ندوۃ العلما کا فیضان:

سید صاحب کو ندوہ کی فضا خاص طور پر راس آئی۔ وہاں کے ماحول میں تعلیم کا تقدس پایا جاتا تھا اور طالب علم کے ذوق کو ابھارتے اور اس کی تکمیل کے سر و سامان بھی موجود تھے۔ استاد نصاب تک محدود نہ رہتے بلکہ شخصیت اور کردار کی صورت گری کی ذمہ داری بھی

پوری کرتے تھے۔ تشنگانِ علم کے لیے وہاں ہزار سامانِ آسودگی موجود تھے۔ صاحبانِ علم کی صحبت اور ایک عمدہ کتب خانہ جہاں ملک و بیرونِ ملک کے خصوصاً اسلامی دنیا کے بلند پایہ عربی رسائل کی صورت میں نعائم غیر مترقبہ میسر تھے۔ صاحبانِ علم میں علاوہ دیگر گرامی شخصیات کے علامہ شبلی بھی تھے جن سے سید صاحب کو نیاز تو ۱۹۰۲ء سے حاصل تھا لیکن حیدرآباد دکن کی ملازمت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد جب وہ ۱۹۰۵ء میں ندوہ تشریف لائے تو شاگردی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ علامہ سے سید صاحب نے دلائل الاعجاز اور ”نقد الشعر“ جیسی کتابیں پڑھیں۔ اس سے ان کا ادبی مذاق نکھرتا گیا اور عربی زبان و ادب پر بھی قدرت حاصل ہوتی گئی۔ ان کا محبوب مشغلہ کتب بینی تھا وہ بغیر کسی استثنا کے ہر قسم کی کتابیں پڑھتے۔

ایک بڑا امتحان:

علامہ شبلی کی شاگردی اور عربی ادب کے مطالعہ کی وجہ سے وہ عربی زبان میں بے تکلف گفتگو کے قابل ہو گئے تھے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ

> ”خاکسار کو چونکہ بچپن سے ادب کا شوق تھا اس لیے دارالعلوم میں اس زمانے کے جو عربی اخبارات ”الموید“، ”اللواء“ وغیرہ آتے تھے ان کو پڑھا اور ان کے معنی حل کیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے میں نے طالب علمی میں ایک بڑے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ جس کا واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء میں جب مولانا شاہ سلیمان صاحب دارالعلوم میں مقیم تھے، نواب محسن الملک مرحوم دارالعلوم دیکھنے کو آئے۔ میں نے ان کی شان میں ایک عربی قصیدہ پڑھا۔ جس کو سن کر انھوں نے فرمایا: ”میں دارالعلوم کی عربی دانی کا قائل اس وقت تک نہیں ہوں گا جب تک یہ نہ جان لوں کہ یہاں کے طالب علم عربی اخبار سمجھ سکتے ہیں“؛ چنانچہ الموید یا اللواء کا ایک پرچہ منگوایا گیا اور مجھ سے ایک مضمون کی طرف اشارہ کر کے پڑھنے کو کہا گیا۔ میں نے جب اس کو صحیح پڑھ کر اس کا مطلب بتا دیا تو نواب صاحب بے انتہا خوش ہوئے اور اس کو دارالعلوم کا خاص امتیاز سمجھا۔ اس کامیابی نے مجھے جدید عربی کے سیکھنے اور اس کے مشکلات کے حل کرنے کی طرف پہلے سے

زیادہ متوجہ کردیا" (حیاتِ شبلی، صفحہ ۴۲۲)

جلسہ دستار بندی اور فی البدیہہ تقریر:

اسی ذوق و شوق اور انہماک کا نتیجہ تھا کہ جلسہ دستار بندی میں علوم قدیمہ و جدیدہ کے موازنے پر ایک بسیط مضمون لکھ کر پیش کیا۔ اسی جلسے کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلسے کو تماشا گاہ اور شائقین کو آئینۂ حیرت بنا دیا۔ تقریر کے دوران میں کسی نے کہا کہ اگر یہی خیالات عربی میں پیش کیے جائیں تو دارالعلوم کی تعلیمی کرامت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ مولوی سید عبدالحئی نے سید صاحب سے پوچھا! کیا وہ عربی میں اپنے خیالات پیش کر سکتے ہیں؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اور عربی میں تقریر شروع کر دی۔ جلسے میں ایک سماں بندھ گیا علامہ شبلی کو جو جلسہ گاہ کے باہر تھے جب خبر ملی تو فوراً اندر آئے اور سید صاحب سے دریافت کیا کہ کیا انھیں اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو وہ تقریر کر سکیں گے۔ سید صاحب نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ علامہ نے مجمع سے موضوع پیش کرنے کی تجویز کی۔ خواجہ غلام الثقلین نے موضوع دیا "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی" سید صاحب نے اسی پر اپنے خیالات کا اظہار عربی میں کیا۔ دورانِ تقریر میں ہر طرف سے داد و تحسین کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ علامہ شبلی نے جوشِ مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر سید صاحب کے سر پر باندھ دیا۔ یہ ایسا افتخار تھا کہ اس سے بڑھ کر کسی بات کی طالب علم استاد سے توقع بھی نہیں کر سکتا!

مولانا سید سلیمان اور علامہ شبلی:

جب تک مشرقی علوم و ادب کی دنیا قائم ہے علامہ شبلی نعمانی کے ساتھ سید سلیمان ندوی کا نام ضرور لیا جائے گا بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن "جس طرح علامہ ابن تیمیہ کو حافظ ابن قیم مل گئے تھے اسی طرح مولانا شبلی نعمانی کو ایک جانثار شاگرد مل گیا" (مطالعہ سلیمان: صفحہ ۲۸۰۔

دارالعلوم ندوہ پہنچنے کے بعد علامہ کے نام سے ان کے کان آشنا ہو چکے تھے لیکن زیارت کا موقع ستمبر ۱۹۰۴ء میں ملا جبکہ وہ حیدرآباد دکن سے آکر دارالعلوم کی پرانی عمارت میں مقیم ہوئے تھے۔

"یہ پہلا موقع تھا کہ خاکسار اور مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی جو دار العلوم میں زیرِ تعلیم تھے مولانا کے حلقے میں بیٹھے اور مولانا نے اپنی بزرگانہ شفقت سے نوازا، مولوی محمد امین صاحب خلف مولانا محمد فاروق صاحب چڑیاکوٹی بھی اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ان دنوں ندوہ میں ٹھہرے تھے، وہ بھی حاضر تھے اور ان ہی نے سب سے پہلے مولانا سے مجھے روشناس کرایا" (حیاتِ شبلی، صفحہ ۴۰۰)

اگرچہ استاد اور شاگرد کا تعلق اس بار ڈیڑھ دو ماہ رہا کیونکہ علامہ شبلی جلد حیدر آباد لوٹ گئے۔ لیکن اس مختصر مدت میں استاد کی رمز شناس نظروں نے شاگرد کے چھپے ہوئے جوہر دیکھ لیے تھے چناں چہ انھوں نے اپنے ایک عزیز کو خط میں لکھا تھا کہ

"ملازمت نے مجھ کو حیدر آباد آنے پر مجبور کیا۔ مولوی سید سلیمان چند روز تک میرے ساتھ رہتے تو اچھا ہوتا وہ جوہر قابل ہیں" (حیاتِ شبلی، صفحہ ۴۰)

النّدوہ کی ادارت:

فروری ۱۹۰۵ء میں علامہ حیدر آباد کی ملازمت ترک کر کے لکھنؤ آگئے تو سید صاحب کو حضرت علامہ کی مستقل صحبت میسر آئی اور استفادے کے مواقع حاصل ہوئے ان چند سال کے عرصے میں انھوں نے جو اثرات استاد کے قبول کیے وہ زندگی بھر قائم رہے اور جس راہ پر استاد نے انھیں ڈالا تھا وہ اس پر پورے خلوص اور تندہی کے ساتھ گامزن رہے۔ علامہ کو ان کی صلاحیتوں پر اتنا اعتماد تھا کہ دورانِ تعلیم ہی میں وہ الندوہ کے ایڈیٹر بنا دیے گئے تھے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

"۱۹۰۶ء میں میری تعلیم کا آخری سال ہے۔ مولانا ابو الکلام کے امرتسر چلے جانے کے بعد مولانا (شبلی) نے الندوہ کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر رکھ دیا جس کو ہم نے مارچ ۱۹۰۸ء تک انجام دیا۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۰۸ء سے یہ پھر (عبد اللہ عمادی صاحب کے سپرد ہوا اور جون اور جولائی ۱۹۰۸ء کے دو نمبر ان کی ادارت میں نکلے تھے کہ وہ پھر میرے حوالے کر دیا گیا۔ اگست ۱۹۰۸ء سے فروری ۱۹۱۰ء تک میں نے دوبارہ اس کی ادارت کا فرض انجام دیا۔"
(حیاتِ شبلی، ص ۴۴۵)

سید صاحب کا مقصدِ زندگی علمی و ادبی خدمات انجام دینا تھا انھوں نے اپنے مضامین، تصانیف و تالیفات کے ذریعے جہاں اس مقصد کے حصول کی کوشش کی وہیں صحافت کو بھی ذریعہ بنایا۔ برصغیر کے تمام وقیع رسائل و جرائد میں ان کی نگارشات شائع ہوتی تھیں۔ ایک اعلیٰ پایے کے مقالہ نگار کی حیثیت سے ان کا رابطہ صحافت سے قائم رہا ساتھ ہی انھوں نے اس دور کے ایسے جرائد کی ادارت کی جس کے مقام بلند اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ ۱۹۰۵ء میں "الندوہ" کا اجرا ہوا تھا جس کی ادارت کے فرائض علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی انجام دیتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں جبکہ سید صاحب ابھی طالب علم تھے کہ انھیں اس کا سب ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ رفتہ رفتہ جریدہ کی تمام تر ذمہ داری ان کی طرف منتقل ہو گئی اگست ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک انھوں نے بغیر علامہ کی رہنمائی کے اس کی ادارت کا فرض ادا کیا۔ اواخر ۱۹۱۲ء میں جب ندوہ میں "مخالف شبلی" قوتوں نے زور پکڑا وہ علامہ اور سید صاحب نہ صرف ندوۃ العلماء سے بے تعلق ہو گئے بلکہ "الندوہ" سے بھی۔

اسی دوران ۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کو علامہ شبلی کے پاؤں کا حادثہ ہوا جس کی اطلاع سید صاحب کو تار کے ذریعے ملی۔ انھوں نے چند روز تفصیل کا انتظار کیا جب کوئی خبر نہ ملی تو حالتِ اضطراب میں اعظم گڑھ پہنچے جہاں علامہ مقیم تھے۔ انھیں دنوں "موازنہ انیس و دبیر" شائع ہوتی تھی اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سید صاحب نے اس حادثہ کے بارے میں کہا ہے

تنقید مراثی کے صلے میں استاد
دربار حسینی نے سعادت بخشی
پر سر سے ابھی کام تھا لینا باقی
اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی

مکاتیب شبلی کی تحریکِ فراہمی:

استاد سے عقیدت و محبت کا جذبہ تھا کہ انھوں نے ۱۹۰۸ء سے ہی ان کے خطوط جمع کرنے شروع کر دیے تھے چنانچہ اخبار وکیل امرتسر میں اس بارے میں اپیل میں انھوں نے کہا تھا:

> "حضرت الاستاد علامہ شبلی کے جو احسانات ہماری زبان پر ہیں، ہم ان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کے مقابلہ میں یہ سخت کفرانِ نعمت ہوگا

اگر ان کے خطوط اور مکاتیب کا مجموعہ نہ شائع کیا گیا اس سے ایک طرف تو اردو علم وادب کے ایک بیش بہا ذخیرے کے برباد ہو جانے کا خوف ہے اور دوسری جانب آیندہ نسلوں کو ہماری بد مذاقی اور علمی ناقدردانی پر افسوس ہوگا اس بنا پر ہمارا ارادہ ہے کہ حضرت استاد کے تمام متفرق خطوط اور مکاتیب کو جمع کر کے شائع کر دیں" (اخبار وکیل، امرتسر۔ ۴ر دسمبر ۱۹۰۹)

ان کی عقیدت و ارادت کا یہ عالم تھا کہ "۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک ان کا لکھا ہوا ایک ایک پرزہ اپنے نام کا میں نے ایک گراں بہا خزانے کی طرح محفوظ رکھا جس میں لفافے، کارڈ، عام رقعے، ہر قسم کے مکتوبات کی تعداد ۲۵۰ تھی"

(دیباچہ مکاتیب شبلی، اوّل، صفحہ ۲)

استاد کو بھی شاگرد سے اتنی محبت تھی کہ جب ۱۹۰۸ء میں وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ملازمت کے خواہش مند ہوئے تو علامہ نے سفارشی خط لکھا بھی تو ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کیونکہ وہ کسی حال شاگرد کو جدا کرنے پر تیار نہ تھے۔

سررشتۂ سیرت سے وابستگی:

مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کا جلسہ دہلی میں ہوا جہاں علامہ شبلی نے "صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی" کی بنیاد ڈالی اور سید صاحب کو اس کا سکریٹری مقرر کیا۔ اس بات میں بھی انھوں نے بے حد کدوکاوش کی۔ اور علمی و ادبی کاموں سے قطع نظر علامہ شبلی کی زندگی کا اصل محاصل سیرت نبویؐ کے لیے ضروری مواد جمع کرنا تھا۔ اس کام کے لیے انھوں نے شب و روز وقف کر دیے تھے سید صاحب اس کارنامے میں بھی ان کے ممد و معاون رہے۔ مئی ۱۹۱۲ء میں علامہ نے بمبئی میں مستقلاً رہنے اور سیرت کی تکمیل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا چنانچہ وہ کچھ دنوں ندوہ میں معلمی کرنے کے بعد سیرت کے اسٹاف میں شامل کر لیے گئے تھے وہ ستمبر ۱۹۱۲ء تک بمبئی میں رہے اور علامہ کے ساتھ لکھنؤ واپس آ گئے۔ حالات ایسے تھے کہ علامہ نے ندوہ سے قطع تعلق کر لیا اور سید صاحب بھی اس سے بد دل ہو کر الگ ہو گئے۔

الہلال سے تعلق:

موجودہ صدی کی دوسری دہائی کے ابتدائی سالوں میں کلکتہ کے ہفت روزہ الہلال نے افقِ صحافت پر نمودار ہو کر خیالات و افکار اور طرزِ بیان کا وہ نور پھیلایا کہ ہر ایک کی نظریں خیرہ ہونے لگی۔ مولانا آزاد کی سحر بیانی اور جوشِ اظہار نے قرآن شناسوں کے دلوں کو گرمایا۔ انھیں جب رفقائے کار کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے سید صاحب کو مدعو کیا۔ سید صاحب گو الہلال سے چند ماہ سے زیادہ عرصہ وابستہ نہیں رہے۔ لیکن مولانا آزاد کو ان پر بڑا اعتماد تھا۔ چناں چہ جب وہ اواخر ۱۹۱۲ء میں الہلال سے بے تعلق ہوتے تو مولانا آزاد نے اصرار کیا کہ وہ واپس آ کر الہلال کی تمام تر ذمہ داری قبول کر لیں۔ لیکن سید صاحب نے الہلال کے ذریعے قوم کی خدمت پر پونا کالج کی ملازمت کو ترجیح دی۔ الہلال سے سید صاحب کا تعلق تین چار ماہ سے زیادہ نہ رہا تھا۔

پونا کالج کی ملازمت:

پونا کے دکن کالج میں فارسی کے لکچرار کا عہدہ خالی ہوا علامہ شبلی نے شیخ عبدالقادر کی مدد سے اس پر سید صاحب کا تقرر کروا دیا تھا۔ اگرچہ تنخواہ صرف ایک سو روپیہ ماہوار تھی لیکن انھیں علمی کام کرنے کا بہت وقت مل جاتا تھا۔ پونا کے دوران قیام میں انھوں نے انگریزی پر خاص توجہ دی اور ایک یہودی سے عبرانی بھی سیکھ لی۔

علامہ کا انتقال اور دار المصنفین کا قیام:

جب علامہ شبلی کو یقین ہو گیا کہ اب ان کا وقت آخر آ پہنچا ہے تو انھوں نے سیرت کا مسودہ کپڑے میں بندھوا کر الماری میں مقفل کروا دیا اور وصیت فرما دی کہ اسے سوائے مولوی حمید الدین اور سید سلیمان کے اور کسی کے حوالے نہ کیا جائے۔ سید صاحب پونا میں تھے کہ استاد کو دیکھنے کی ان کے دل میں ایک شدید تڑپ پیدا ہوئی۔ وہ کسی کو اطلاع دیے بغیر اعظم گڑھ کے لیے روانہ ہو گئے ۱۵؍ نومبر ۱۹۱۴ء کی شام کو پہنچے تو دیکھا کہ آفتابِ علم و ادب غروب ہونے والا ہے۔ طاقت جسمانی جواب دے چکی تھی۔ وہ اس طور سرہانے کھڑے ہو گئے کہ ان کی آنکھوں سے سیلابِ اشک رواں تھا۔ حضرت علامہ نے نحیف آواز میں فرمایا:

"سیرت میری عمر بھر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کر اسے مکمل کرو" سید صاحب نے اس حکم کی تعمیل کا وعدہ کیا۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ سید صاحب نے "نوحۂ استاد" لکھ کر اپنے جذبات دل کی ترجمانی کی۔

علامہ کے انتقال کے بعد سید صاحب کا دل پونا کی ملازمت سے اچاٹ ہو گیا انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اعظم گڑھ میں رہ کر اس مشن کو آگے بڑھائیں گے جس کی ابتداء علامہ نے کی تھی۔ انتقال سے چند ماہ قبل علامہ نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ان کے شاگردوں نے اس کی کار اجرائی کے لیے ایک کمیٹی قائم کی مولانا حمید الدین اس کے صدر، سید صاحب ناظم اور مولانا مسعود علی ندوی منیجر منتخب ہوئے۔ قواعد و ضوابط مرتب کیے گئے۔ ایک لائبریری قائم ہوئی۔ دارالمصنفین کی مستقل آمدنی ساڑھے پانچ سو روپیہ تھی۔ اسٹاف کے ۵ اراکین کے لیے اسی کو کافی سمجھا گیا۔ اور سید صاحب تصنیف و تالیف میں منہمک ہو گئے انھوں نے جہاں تک ممکن ہوا اپنے آپ کو دارالمصنفین کے لیے وقف رکھا۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں علامہ اقبال نے اورینٹل کالج لاہور میں ہیڈ پرشین ٹیچر کے عہدہ کی پیشکش بھی کی لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا۔

معارف کا اجراء:

علامہ شبلی نے دارالمصنفین کی شایانِ شان ایک علمی رسالہ کے اجراء کا منصوبہ بنایا تھا جسے وہ اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے لیکن ان کی وفات کے بعد سید صاحب نے دارالمصنفین کا چارج سنبھالا اور تصنیف و تالیف و اشاعت کا کام شروع کیا تو ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جون ۱۹۱۶ء میں پریس بھی قائم کیا۔ اس کے قیام کے بعد رسالہ شائع کرنے کے لیے حالات مزید سازگار ہو گئے اس لیے جولائی ۱۹۱۶ء سے "معارف" جاری کیا جس نے چند شماروں کے بعد ہی اپنا وہ مقام حاصل کر لیا کہ بڑے سے بڑا ادیب و شاعر اس میں جگہ پانے کا متمنی ہو گیا۔ معارف نے جو خدمت انجام دی اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس رسالے کے مخاطب نئے اور پرانے دونوں طبقے تھے۔ پرانے طبقے کو اس نے مذہب اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت کے نئے وسائل اور علمی مسائل کی تحقیق و تنقید اور انشا و تحریر کے نئے طریقوں سے آشنا کیا۔ جدید طبقے کو جن کی دنیا محض جدید تعلیم تک محدود تھی اپنی تاریخ اور اپنے علوم کی

طرف متوجہ کیا اور دونوں طبقوں میں سنجیدہ اہل قلم کی ایک جماعت پیدا کردی۔ معارف نے سیکڑوں علمی موضوعات اور مسائل پر اور اسلامیات کی مختلف شاخوں پر مضامین کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کردیا ہے جس سے اسلامی انسائیکلو پیڈیا مرتب کی جاسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب نے اپنی تصانیف و تالیفات کا جو ورثہ چھوڑا ہے اس میں معارف کو شامل کرنا ضروری ہے۔

مقامِ سلیمانی کا اعتراف عام:

وقت کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و منزلت، عزت و شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ملک میں ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی ان کی قدردانی ہوتی رہی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے فروری ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے کر ان کی خدمات بھی حاصل کرنی چاہیں جامعہ عثمانیہ بھی ان کے فیوض علمی سے استفادے کی خواہش مند رہی۔ استنبول یونیورسٹی نے بھی بلایا۔ لیکن دارالمصنفین کے گوشہ میں ان کے لیے جو سامان انبساط و آسودگی تھا اسے چھوڑ کر کہیں جانے پر ان کی طبیعت مائل نہ ہوئی۔ یہ ادارہ ان کی ذات سے اور ان کی ذات ادارہ سے منسوب ہو کر رہ گئی۔

سیاست:

اگرچہ سیاست سید صاحب کا میدان عمل نہ تھا لیکن حالات کے تقاضوں اور مسلمانوں کے مفاد میں انھوں نے اس سے بے تعلقی کو بھی روا نہیں رکھا وہ ابتدا ہی سے مسلم لیگ کے وابستہ رہے اگرچہ مسلم لیگ کے ریکارڈ سے یہ بات واضح ہے کہ ۱۹۱۶ء تک وہ لیگ کے رکن نہیں بنے تھے لیکن ان کا بیان ہے کہ انھوں نے آگرہ اجلاس (منعقدہ ۱۹۱۳ء) میں شرکت کی تھی۔ اگرچہ مسجد کانپور کی شہادت کا واقعہ (اگست ۱۹۱۳ء) مذہبی نوعیت کا تھا اس سے مسلمانوں کی سیاست بھی وابستہ رہی۔ وہ نفرت جو برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف سلگ رہی تھی۔ دول یورپ کی ترکی اور طرابلس کے خلاف معرکہ آرائیوں نے اسے بھڑکا دیا تھا۔ مسجد کے واقعے نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا اس موقع پر سید صاحب خاموش نہ رہ سکے وہ ادارہ الہلال سے وابستہ تھے ان کا احتجاج قلمی نوعیت کا رہا اور انھوں نے "شہید اکبر" جیسا معرکہ آرا مضمون لکھ کر انگریز حکومت کی بنیادوں کو ہلا دیا۔ ان کا یہ لکھنا بیجا نہ تھا:

"۳؍اگست کی صبح انقلاب حکومتِ برطانیہ کی تاریخ ہے۔ بہادر سپاہی جس وقت غریب و ناتواں و غیر مسلح مجمع پر گولی برسا رہے تھے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانوی عدل و انصاف کو زخمی کر رہی ہیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اس گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا ہے جس پر حکومت برطانیہ کی عمارت قائم ہے؟"-----

"مجروحین کانپور! تم نے گولیاں کھائیں، نیزوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے؛ تمہاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں، تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا؛ تمہیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹ تھا جس کے بعد بنو امیہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا۔"

(الہلال، کلکتہ: ۱۳؍اگست ۱۹۱۳ء ص ۴، ۵)

اس واقعہ کے بعد ہی مسلم لیگ کی سیاست میں انگریز مخالف رجحان پیدا ہوا اور اس کے اغراض و مقاصد میں "حکومتِ برطانیہ سے وفاداری" کی شق کو نکال کر "حصول سیلف گورنمنٹ" کو شامل کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں مسلم لیگ کا جو سالانہ اجلاس بیرسٹر مظہر الحق کی صدارت میں ہوا اس میں بھی انھوں نے شرکت کی اور مسلمانوں میں پیدا ہونے والی بیداری کے حوالے سے مظہر الحق کی توصیف میں وہ نظم کہی جس کا آخری شعر ہے ؎

آیت قرآں کہ جاء الحق مصدق ہو گئی
مجلس آئیں، ہماری "مظہر حق" ہو گئی

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے اس وقت میں مسٹر محمد علی جناح کی شمولیت اور ان کے لائحہ عمل سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہم یگانگت اور اعتماد کی خوشگوار فضا تیار ہو رہی تھی۔ اس موقع پر جناح صاحب کے وجود کو مسلمان قوم کی حیات نو کا ضامن قرار دیتے ہوئے انھوں نے ایک نظم لکھی جس کا آخری شعر ہے ؎

پر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید   ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کی بنیاد پڑی۔ اس کے بانیوں میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عبد الماجد بدایونی، مولانا آزاد سبحانی مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا حسرت موہانی کے ساتھ سید صاحب بھی شامل تھے اسی زمانے میں خلافت تحریک کا آغاز ہوا دسمبر ۱۹۱۹ء میں اس سلسلہ میں کانگریس اور مجلس خلافت کا اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا۔ اس میں طے کیا گیا کہ چند اشخاص پر مشتمل ایک وفد برطانیہ روانہ کیا جائے جو حکومت برطانیہ اور دیگر دول یورپ کو مسلمانوں کے موقف سے آگاہ کرے۔ اس وفد کے اراکین مولانا محمد علی، مسٹر سید حسین اور مولانا سید سلیمان ندوی منتخب ہوئے حسن محمد حیات اس کے سکریٹری بنائے گئے۔

وفد خلافت انگلستان میں شرکت:

۱۹۲۰ء میں یہ وفد انگلستان اور یورپ کے بعض ممالک کے دورے پر گیا۔ اس وفد میں سید صاحب شامل تھے۔ انھیں جو کام تفویض کیا گیا اس کی صراحت انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے:

> میرے ذمے یہ کام تھا کہ مذہبی اور تاریخی حیثیت سے انگریزی اخباروں میں ہمارے خلاف جو مضامین نکلیں ان کا جواب لکھنا اور اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے مل کر ان کو اس تحریک سے آگاہ کرنا اور ان کی ہمدردی حاصل کرنا۔ ان کے علاوہ دو اور کام میں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے ایک یہ کہ روزانہ انگریزی اخباروں کو پڑھ کر قابل لحاظ مضامین اور خبروں پر سرخ روشنائی لگا دینا تاکہ وفد کے دیگر ارکان بھی ان کو پڑھ لیں دوسرا یہ کہ ہر ہفتہ، ہفتہ بھر کی رفتار کار اور کاموں کی روداد لکھ کر ہندوستان بھیجنا خصوصیت کے ساتھ

---

[1] سید صاحب مرحوم کا یہ وقتی تاثر تھا اور یہ نظم اسی شاعرانہ تاثر کی یادگار ہے۔ جیسا کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں علمائے دیوبند نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا لیکن بعد میں ان کی رائے مسلم لیگ کی سیاست اور اس کے رہنماؤں کے بارے میں بالکل بدل گئی تھی (ا۔ س۔ ق)

شوکت علی صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب کو وفد کے کاموں سے باخبر رکھتا" (برید فرنگ، ص ۱۲)

یہ وفد ۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچا جہاں ان کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ ۳۰ جنوری کو بال گنگادھر تلک کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں سید صاحب نے نہایت پُر اثر تقریر کی۔ وفد ۲۶ فروری کو لندن پہنچا تھا جہاں اس نے وزیر ہند، وزیر اعظم، لیبر پارٹی کے رہنماؤں اور اس کی ایڈوائزری کمیٹی کے اراکین، مانٹیگو وغیرہ سے ملاقاتیں کیں جن میں خلافت کی مذہبی اہمیت کو اجاگر کیا۔ تقریباً سات ماہ اسی تگ و دو میں گزرے۔ بالآخر وفد کسی اہم کامیابی کے بغیر ستمبر میں واپس آیا۔ سید صاحب کی مساعی پر علامہ اقبال نے انھیں مبارکباد دیتے ہوئے خط میں لکھا تھا:

> "مراجعت مع الخیر مبارک۔ آپ نے بڑا کام کیا ہے جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربار نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا۔ وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا ہے۔
>
> انؤمن لبشرین مثلنا وقومھما لنا عابدون
>
> تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا
>
> (اقبال نامہ؛ جلد اول: ص ۱۱۲)

اس مسئلہ کے بارے میں سید صاحب کا مضمون "خلافت اور ہندوستان" مشمولہ معارف دسمبر ۱۹۲۰ء تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

ناگپور کی مجالس میں شرکت:

انھوں نے ۱۹۲۰ء میں ناگپور کے سیاسی اجتماعات میں بھی شرکت کی جہاں کانگریس، لیگ اور خلافت نے "سوراج" کے حصول کو اپنے بنیادی مقاصد میں شامل کیا اور ۱۹۲۱ء کے احمد آباد کے اجتماعات کانگریس، لیگ وغیرہ میں بھی موجود تھے جہاں مولانا حسرت موہانی نے "سوراج کا مطلب آزادی کامل" کی قرارداد پیش کی جو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے

اجلاسوں میں پاس نہیں ہو سکی تھی اس دوران وہ جمعیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی رہے اس کے اجلاسوں میں بالالتزام شرکت کی اور ۱۹۲۶ء میں خلافت کمیٹی جمعیت کے اجلاسوں کی صدارت فرمائی۔

وفد خلافت حجاز:

۱۹۲۶ء میں سید صاحب نے اس وفد کی قیادت کی جو حجاز کے نئے حکمران سلطان عبدالعزیز کی طرف سے مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں مقابر و آثار کے بارے میں ہونے والے مباحث میں حصہ لیا ان کا رویہ اہتمام و تفہیم کے ذریعے مسائل کو حل کرنے کی حمایت میں تھا اور انھوں نے جذباتیت سے گریز کیا تھا۔ اسی دوران مؤتمر کا قیام عمل میں آیا جس کی صدارت کے لیے حجاز کے شریف عدنان اور نائب صدور کے لیے سید صاحب کے علاوہ رضا الدین (روسی وفد کے صدر) کا انتخاب ہوا۔ ۷ ۲ر جون ۱۹۲۶ء کو اس کا پہلا اجلاس ہوا۔ مقابر و آثار کے بارے میں تنازع کا کوئی حل برآمد نہ ہو سکا اور وفد جولائی میں واپس آ گیا۔

شاردا بل کے خلاف مسلمانوں کا احتجاج:

۱۹۲۸ء میں سیاست کا اہم موضوع شاردا بل تھا سید صاحب نے اس کی مخالفت اس بنا پر کی کہ اگرچہ نابالغی کی شادی اسلام میں پسندیدہ نہیں لیکن اس سے انکار بھی نہیں کیا ہے۔ قانون کے نفاذ سے جس بات کی شریعت اجازت دیتی ہے وہ جرم قرار پاتا ہے۔[1]

---

[1] ۱۹۲۹ء میں ہربلاس شاردا نے ہندوؤں میں کم سنی کی شادی کی رسم کے خلاف قانون بنانے کے لیے اسمبلی میں ایک بل پیش کیا تھا۔ بدقسمتی سے محمد علی جناح نے نہ صرف اس کی حمایت کی بلکہ اس کے دائرہ اطلاق کو بہ شمول مسلمانان ہندوستان کی تمام اقوام تک وسیع کر دینے کی ترمیم پیش کر دی۔ مسلمانوں کو اس صورت حال کا علم ہوا تو ان میں شدید بے چینی پیدا ہو گئی۔ تمام مکاتب فکر کے علما نے اسے مذہب میں مداخلت قرار دیتے ہوئے اس پر سخت احتجاج کیا۔ لیکن ستمبر ۱۹۲۹ء میں اس بل کو پاس کر دیا اور یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے تمام برطانوی ہند میں بہ شمول بلوچستان اس کو نافذ کر دیا گیا۔ سید صاحب بھی باوجود اپنی خلوت گزینی اور سیاست سے اپنی دامن کشائی کے تڑپ اٹھے اور مسلمانوں کے احتجاج میں شامل ہو گئے تھے (ا۔ س۔ ش)۔

شاعری:

سید صاحب کو شاعری سے بھی شغف رہا۔ اس جانب وہ طالب علمی کے ابتدائی دور سے متوجہ رہے لیکن اسے نہ تو اپنا مستقل شغل بنایا اور نہ کبھی شاعر ہونے کا دعوےٰ کیا۔ ان کے لیے شاعری جذبات کی شدت کا وقتی وسیلۂ اظہار تھا۔ اس میں بھی انھوں نے غزل کی مخصوص روایت کا اپنے آپ کو پابند نہیں رکھا۔ دل کی شگفتگی کے اظہار کے لیے تغزل سے معمور اشعار ملتے ضروری ہیں لیکن ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتے۔ ان کی شاعری کے اصل جوہر مقصدی اور اصلاحی اشعار میں چمکتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان میں متفکرانہ ضبط اور خیالات میں رفعت پیدا ہوتی گئی۔ ان کی سخن سنجی اور سخن فہمی کے علامہ اقبال بھی قائل تھے، چنانچہ اپنے خط مرقومہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۶ء میں لکھتے ہیں:

"آپ کی غزل لاجواب ہے بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا ہے

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور جو چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں وہ نہایت مقبول ہوئیں۔ غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھیے"

(اقبال نامہ حصّہ اول: ص ۷۶)

اکبر الہ آبادی نے اپنے خط مرقومہ ۱۶ر اپریل ۱۹۱۷ء میں لکھا تھا:

"کبھی کبھی دو چار شعر کہہ لیا کیجیے۔ آپ کو نظم سخن میں سلیقہ حاصل ہے"

"ارمغان سلیمان" (۱۹۶۶ء) کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔

علمی و ادبی خدمات:

سید صاحب نے ایک بھرپور علمی زندگی گزاری۔ ان کے شب و روز مطالعہ و تحریر کے لیے وقف رہے۔ اس زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر انھوں نے غور و فکر نہ کیا ہو اور اپنے حاصل کردہ نتائج سے واقف نہ کرایا ہو۔ ممکن ہے کہ ان کے بعض آرا سے ہم متفق نہ ہوں لیکن ان کے تبحر علمی اور تصنیف و تالیف اور تحقیق کی توجہ انہماک اور خلوص کا سے

انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مذہب، تاریخ، تحقیق، قدیم اور جدید علوم، فلسفہ، ادب غرض کہ ہر شعبۂ علم پر انھیں دسترس حاصل تھی۔ اس کے لیے مسلسل مطالعہ، مستقل غور و فکر، حد درجہ جگر کاوی اور شب و روز دماغ سوزی لازم ہوتی ہے یہ صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان کے جذب و قبول کا یہ عالم تھا کہ ایک بار عبارت نظر سے گزر جاتی تو وہ اس کی معنوی تہہ تک پہنچ جاتے اور وہ ان کے لوحِ دل و ذہن پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتی۔ جب آمادۂ تحریر ہوتے تو افہام و تفہیم کا انداز اختیار کرتے اور ابلاغ کا حق ادا کر دیتے۔ کثرتِ مطالعہ اور کثرتِ نگارشات کے معاملے میں دنیائے اردو میں دو ایک ہستیاں ہی ان کے مدِ مقابل قرار دی جا سکتی ہیں ان کا ذوق پڑھنے اور لکھنے کی جانب کس قدر مائل تھا اس کا اندازہ ان کے یادگار مضامین، مقالات تصانیف، تالیفات، خطبات اور تقاریر کے علاوہ خطوط سے کیا جا سکتا ہے ان کے چھے سو سے زائد مضامین و مقالات ملک کے وقیع اور اہم جرائد میں شائع ہوئے تیس سے زائد تصانیف و تالیفات ہیں جن میں سے بیشتر ایک سے زائد جلدوں پر مشتمل ہیں اور جن کا تعلق مختلف النوع موضوعات سے ہے ان میں اسلام، قرآن، سیرت، فقہ، تاریخ اسلام کے گم شدہ گوشے، لسانیات اور ادبیات سبھی شامل ہیں۔ ان میں خصوصیت سے "سیرت النبیؐ" کی تکمیل ان کا اہم ترین کارنامہ ہے جس کا خاکہ اور جس کے بارے میں ضروری معلومات کا گراں قدر ذخیرہ علامہ شبلی نے فراہم کر لیا تھا۔ اُستاد کے مشن کو پورا کر کے انھوں نے سعادت مندی کا ثبوت دیا اور شاگردی کا حق بھی ادا کیا۔ سیرت النبیؐ کی دوسری جلد جو سید صاحب نے مرتب کی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تھی اور بعد کی چار جلدیں بالترتیب ۱۹۲۴ء، ۱۹۳۲ء (جلد ۴، ۵) اور ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھیں۔ سیرت کی ساتویں جلد سید صاحب مرتب نہیں کر سکے تھے، کچھ نوٹس تھے جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تعارف کے ساتھ ۱۹۹۲ء میں پاکستان (کراچی) سے بہ طور ساتویں جلد کے شائع کر دیے گئے ہیں۔

سیرت النبیؐ کے علاوہ ان کی بلند پایہ اور محققانہ تصنیفات میں ارض القرآن۔ دو جلدیں (۱۹۱۶ء و ۱۹۱۸ء)، سیرت عائشہ (۱۹۲۰ء)، دنیائے اسلام اور مسئلہ خلافت (۱۹۲۱ء) خلافت اور ہندوستان (۱۹۲۱ء) خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام (۱۹۲۲ء)، خواتینِ اسلام کی بہادری (۱۹۲۲ء)، خطباتِ مدراس (۱۹۲۶ء)، عرب و ہند کے تعلقات (۱۹۲۹ء)، عربوں کی جہاز رانی

(۱۹۲۱ء)، خیام (۱۹۳۳ء)، ہماری زبان کے نام (۱۹۳۷ء)، رحمت عالم (۱۹۳۹ء)، نقوش سلیمانی (۱۹۳۹ء) حیاتِ شبلی (۱۹۴۳ء)، سیر افغانستان (۱۹۴۵ء)، برید فرنگ (۱۹۵۲ء) شامل ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض ان کے مضمون و تقریر اور مضامین اور خطبات کے مجموعے ہیں جنھیں کتاب بنا دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی مرحوم کے خطوط اور خطبات و مقالات کے مجموعوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو حضرت سید صاحب کی حسن تالیف و تدوین کے نمونے ہیں۔

سید صاحب اردو زبان کے بلند پایہ انشا پرداز تھے۔ ان کی انشا پردازی کے شاہکار ان کے وہ مضامین ہیں جو انھوں نے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۸ء تک مختلف اکابر و مشاہیر کی وفات پر لکھے تھے اور چند ایک کے سوا معارف میں شائع ہوئے تھے۔ یہ تمام مضامین "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے سید صاحب کے انتقال کے بعد (۱۹۵۵ء میں) کراچی سے شائع ہوئے ہیں انشا پردازی کے بہترین نمونوں کے لیے ان کے خطوط کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔ سید صاحب نے اپنی زندگی میں ہزاروں خطوط، اپنے عزیزوں، دوستوں اور وقت کے اکابر و مشاہیر کو لکھے تھے۔ ان میں "مکاتیب سید سلیمان ندوی" بنام مولانا مسعود عالم ندوی (۱۹۵۴ء میں) اور "مکتوبات سلیمانی" بنام مولانا عبدالماجد دریابادی دو جلدوں میں ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۷ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

سید صاحب مرحوم کے خطوط کے دو مجموعے اور مرتب ہوئے ہیں، ان میں سے ایک مجموعہ "خطوطِ سلیمانی" اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ خطوط علم ادب، تاریخ و سیاست مذہب و تصوف تعلیم و اخلاق اور ارشاد و اصلاح کے سیکڑوں مسائل کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ان میں سید صاحب علیہ الرحمہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کے مذہبی و سیاسی اور متصوفانہ افکار پر روشنی پڑتی ہے۔

اسلوبِ سلیمانی:

سید صاحب کی تحریروں میں کئی اسلوب ملتے ہیں۔ اولاً وہ علامہ شبلی مرحوم کے اسلوب سے متاثر ہوئے اور کچھ عرصہ ان کے اسلوب کی پیروی کی، الہلال میں گئے تو چند مضامین اس کے مخصوص اسلوب میں لکھے لیکن الہلال کے خطیبانہ و داعیانہ اسلوب کو علمی و تحقیقی مضامین میں اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا اور سید صاحب کا آیندہ میدان علم و تحقیق بنا اس لیے الہلال کے اسلوب

خاص کی مثالیں ان کی بعد کی تحریروں میں نہیں ملتیں۔ دارالمصنفین کے قیام تک ان کے اسلوب تحریر وطرز نگارش میں ٹھہراؤ پیدا ہوگیا تھا۔ گویا انھوں نے ایک نیا طرز سخن ایجاد کرلیا تھا۔ ان کے اسلوب خاص کا اندازہ ان کی بعد کی تحریروں وتصنیفوں سے کیا جاسکتا ہے۔ ان کے اسلوب کے شاہکار نمونے ان کے خطوط اور یادرفتگان کے سلسلے کے مضامین میں ملتے ہیں۔ اور اسی سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے اس اسلوب کے خاص اجزائے ترکیبی استدلال، تفہیم، سنجیدگی اور وقار ہیں۔ وہ کوئی بات غیر منطقی انداز میں اور استدلال کے بغیر نہیں کہتے۔ وہ شوق عبارت آرائی میں لفظی مینا کاری سے گریز کرتے ہوئے آسان جملوں میں بات کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اردو زبان کے انشاپردازوں کی کوئی مختصر فہرست بھی تیار کی جائے گی تو سید سلیمان ندوی اپنے اسلوب کی بنا پر اس کے چند اولین انشاپردازوں میں شمار کیے جائیں گے۔

قومی وملی انجمنوں سے تعلق:

علمی زندگی میں ان کا تعلق سیاسی، قومی، تعلیمی، ثقافتی انجمنوں سے رہا۔ جن میں مسلم لیگ کانگریس، خلافت کمیٹی جمعیۃ العلماء ہند، موتمر قومی، درس گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انجمن حمایت اسلام، ہندستانی اکیڈمی الہ آباد، آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، ہسٹاریکل ریکارڈ سوسائٹی وغیرہ شامل ہیں۔ جن کے پلیٹ فارموں سے انھوں نے اپنے خیالات وافکار کا اظہار کیا۔ ان میں سب سے اہم وہ آٹھ خطبات ہیں جو انھوں نے سیرت کے موضوع پر جنوبی ہند کی اسلامی تعلیمی انجمن کی فرمائش پر اکتوبر نومبر ۱۹۲۵ء میں دیے تھے اور بے حد پسند کیے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں انجمن حمایت اسلام کے ۴۲ ویں اجلاس میں شرکت کی تھی اور اس موقع پر علامہ اقبال سے بالمشافہ ملاقات ہوئی یہاں انھوں نے "عہد اسلام اور اشاعت اسلام" کے موضوع پر ۱۵ اپریل کو اور اسلامی ثقافت کے موضوع پر ۱۶ اپریل کو تقریر کی۔

افغانستان کا سفر:

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں حکومت افغانستان کی دعوت اور علامہ اقبال کے اصرار پر وہ اس وفد میں شامل ہوکر افغانستان گئے جس کے صدر علامہ اقبال اور ایک رکن سر راس مسعود تھے۔ یہ وفد اس لیے طلب کیا گیا تھا کہ افغانستان میں اسلامی تعلیم کے نصاب اور طریق کار کے بارے میں

رہنمائی فراہم کی جا سکے۔ اگرچہ وفد نے سنجیدگی سے ضروری اور اہم تجاویز پیش کیں لیکن ان پر عمل درآمد کے لیے کسی قسم کا سنجیدہ اقدام نہیں کیا گیا[1]

۱۹۳۵ء میں انھوں نے ریاست حیدرآباد دکن کی دعوت پر اسلامی فقہ کی روشنی میں قانون قصاص و دیت کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں وہاں گئے۔

اگست ۱۹۳۸ء میں سید صاحب نے راہِ سلوک اختیار کی اور مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت کی ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو پیر و مرشد نے انھیں خلافت باطنی رحمت فرمائی اور مسندِ ارشاد پر متمکن کیا۔ عرصے سے والی بھوپال کی خواہش تھی کہ سید صاحب ریاست کے امورِ اسلامی شرع کے مطابق چلانے میں مدد دیں چناں چہ انھیں قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ علوم مشرقی کے عہدوں کی پیشکش کی گئی جسے انھوں نے قبول کر لیا اور ۱۶ر جولائی ۱۹۴۶ء کو ان کا چارج سنبھال لیا۔ اس دوران میں انھوں نے جن مقدمات کا فیصلہ کیا وہ نظائر میں شمار ہوتے ہیں۔

۱۹۴۹ء میں وہ حج بیت اللہ کا فرض ادا کرنے گئے۔ تو ان کا قیام رباط بھوپال میں تھا لیکن شاہ عبدالعزیز نے انھیں اپنا مہمان خاص بنایا۔ دسمبر میں وہ حجاز سے واپس ہوئے تو بمبئی پہنچ کر طبیعت خراب ہو گئی اس لیے بمبئی میں ایک ماہ قیام کے بعد بھوپال پہنچے۔ یکم جون ۱۹۵۰ء کو بھوپال کے مناصب سے سبکدوش ہو گئے اور ۱۱ر جون کو عازم پاکستان ہوئے جہاں ان کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ پاکستان کا اسلامی دستور مدون کرنے کے لیے ۳۱ علما کی ایک

---

[1] در حقیقت وفد کا وہ مقصد تھا ہی نہیں جو سمجھا جاتا ہے۔ امیر امان اللہ خان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد نادر شاہ کی حکومت کے حق میں ہندوستان کے مسلمانوں کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے یہ طے کیا گیا تھا۔ یونیورسٹی کے قیام کے منصوبے اور اس کے لیے نصاب تعلیم کی تیاری اور مشورت کا ڈھنڈورا سب دکھاوے کی باتیں تھیں۔ وفد کے صدر علامہ اقبال اسلامی ہند کی بہت بڑی غیر متنازع فیہ اور انگریزوں کے لیے گوارا شخصیت تھے۔ سر راس مسعود جدید تعلیم یافتہ جماعت خصوصاً علی گڑھ مکتبہ فکر کے نمائندہ تھے اور سید سلیمان ندوی قدیم تعلیم یافتہ گروہ خصوصاً علمائے دیوبند، فرنگی محل اور اہل حدیث مکاتب فکر کے نمائندہ تھے۔ بپیش نظر مقصد سے وفد کے ارکان کا یہ بہترین انتخاب تھا جو ہندوستان کی برٹش حکومت کے مشورہ وایما سے کیا گیا تھا۔ علامہ اقبال کی بعض نظموں اور سید سلیمان ندوی کی سیر افغانستان نے یہ مقصد بہ وجوہ احسن پورا کیا (ا۔س۔ش)

مجلس مقرر کی گئی تھی سید صاحب اس کی صدارت کے عہدہ پر فائز ہوئے "قرارداد مقاصد" کی تکمیل میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا بعد میں دستور کی رہنمائی کے لیے جو بورڈ بنایا گیا اس کی رکنیت کے لیے ان سے درخواست کی گئی لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا۔

وطن مالوف کا سفر اور انتقال:

مارچ ۱۹۵۳ء میں وہ ایک بار پھر ندوہ گئے اور پرانی یادوں کو تازہ کیا۔ ایک ماہ بعد جب وہ کراچی آئے تو انھیں تنفّس کی شکایت ہو گئی۔ بیماری نے زور پکڑا۔ ان کا قلب بڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے کسی شریان میں ایسی گرہ پڑی کہ سانس لینا مشکل ہو گیا اسی مرض میں ۲۳ر نومبر ۱۹۵۳ء کو یہ آفتابِ علم و ادب غروب ہو گیا۔ کراچی میں اسلامیہ کالج کے ایک گوشے میں آپ کی پختہ قبر ہے۔

شفقت رضوی

۵ر اکتوبر ۱۹۹۰ء

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی

(۱)

اعظم گڑھ۔ شبلی منزل

مکرمی!

آپ کا حبیب صمیم (مولانا شبلی) اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں ہے۔ پیچش سے آنتوں میں زخم ہے۔ دس روز سے مطلق غذا نہیں۔ حالت مایوس کن ہے۔ وہ وقت نہ آئے کہ میں اپنی یتیمی کا پیغام آپ کو سناؤں۔ والسّلام

سید سلیمان۔ ۱۶؍ نومبر ۱۹۱۴ء[1]

(۲)

دار المصنّفین، اعظم گڑھ

مخدوم محترم! دام مجدہٗ۔ السّلام علیکم

والا نامہ جنت شمامہ باعث سرفرازی ہوا۔ اس خواب کو خواب کہوں یا یہ مصداقِ حدیث مبشرات رویا المسلم یری لہ او تری لہ مبشرات میں سمجھوں۔ میں تو بالالتزام ہر صبح کو استاد مرحوم کے لیے دعا کرتا ہوں۔ میں نے بھی اسی رمضان میں اُن کو خواب میں دیکھا، مگر مضمون یاد نہیں رہا۔ فتنۂ تکفیر کے عین موسم میں یہ بشارت، اشارتِ غیب ہے وللہ الحمد۔

فتنۂ تکفیر کا ہنگامہ ابھی سرد ہوا تھا کہ حافظ اسلم صاحب جیراجپوری (منکر حدیث) کی امداد سے ایک رسالہ "سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اور مفت تقسیم ہو رہا ہے۔ اس پر علمائے تھانہ بھون و دیوبند کی تقریظیں لکھوا کر شامل کی گئی ہیں۔ اور یہ سب اس لیے کہ میں نے اہل قرآن کے مقابلے میں قرآن پاک

---

[1] علامہ شبلی مرحوم نے ۱۸؍ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی تھی۔ یہ مکتوب وفات سے صرف دو روز قبل کا ہے اور جس انتشار ذہنی کے عالم میں لکھا گیا ہے، مضمون کی بے ربطی سے ظاہر ہے سید صاحب نے "وہ وقت نہ آئے" میں آخری لفظ کا املا "نآئے" لکھا ہے اور خبر کی جگہ "پیغام" کا لفظ

سے عذاب و ثواب برزخ کا ثبوت پیش کیا تھا۔ جس کا رد وہ اپنی قیاسی تفسیر و ادیل سے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ایک سنی کا روپ بھر کر مفسرین کے اقوال سے مجھے ملزم کرنا چاہا ہے۔ اور اس کے لیے معتقدانہ تقریظیں علمائے مذکورین سے لکھوائی ہیں۔ لیکن بحمداللہ ان میں سے اکثر کی تصحیح دوسرے ایڈیشن میں کر دی گئی تھی، باقی چھاپے کی غلطیاں ہیں۔ دو تین معترض کی قلتِ تدبر کا نتیجہ ہیں۔

مجھے افسوس اس کا ہے کہ میں نے علمائے دیوبند سے ملنے کی بہت کوشش کی اور ان کا ہر موقع پر ساتھ دیا، مگر وہ اپنی عصبیت سے مغائر ہی سمجھتے رہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

بیچارے نواب علی حسن خاں بھی چل بسے۔ ایک پرانے خاندان کی پرانی یادگار تھے۔ والسلام

سید سلیمان۔ ۲۱ رمضان ۱۳۵۵ھ[2]

[پس تحریر]

والا نامہ ابھی ملا۔ میں نے جواب کا ارادہ تو ترک کر دیا۔ مگر معارف میں نوٹ چھپ چکا۔ اب اس کے بعد کچھ نہ لکھا جائے گا۔ اگر دو روز پہلے بھی یہ ہدایت نامہ موصول ہوتا تو میرے لیے فیصلے میں بڑی آسانی ہوتی۔ میں نے ایک مہینے کے قریب اس پر غور کیا اور حیص بیص میں رہا۔

②

دار المصنفین۔ اعظم گڑھ

نمبر ۳-۷-۶۰

مخدوم محترم! دامت معالیکم، السلام علیکم

میں ۲۰ رشعبان المعظم کو مدراس اور حیدر آباد کے سفر سے واپس آیا۔ مدراس میں جامعہ دار السلام عمر آباد شمالی ارکاٹ میں دستار بندی کا جلسہ تھا۔ اور اہل مدرسہ نے فال دیکھا کہ یہ کام میرے ہاتھوں انجام پائے تو مبارک ہوگا۔ یہ مدرسہ چند روشن دماغ تاجروں نے جو روشن کمپنی کے مالک ہیں، بارہ سال سے قائم کیا ہے۔ ندوۃ کے انداز پر یہ

---

[1] یہ مولانا امداد صابری مرحوم کی تالیف ہے۔ اس کی اشاعت پر سید صاحب مرحوم نے مؤلف کے خلاف مقدمہ بھی کر دیا تھا لیکن بعض حضرات نے بیچ میں پڑ کر ختم کرا دیا۔

[2] ۲۱ رمضان ۱۳۵۵ھ مطابق ۵ ردسمبر ۱۹۳۶ء بہ روز ہفتہ

جنوبی ہند میں اپنا کام کرنا چاہتا ہے۔ معقولات کا حصہ اس میں سے حذف ہے اور انگریزی کی تعلیم لازمی ہے۔ نتائج خوش آیند ہیں۔

مدراس سے واپسی میں حیدرآباد چند روز کے لیے ٹھہر گیا۔ چار روز بھی پورے نہیں رہا، مگر نتائج کے لحاظ سے نہایت شاندار رہا۔ اعلیٰ حضرت نے اخباروں میں میرے آنے کی اطلاع پاکر ازخود ۲۵ر شعبان کو خاصہ سے نوازا اور ۲۷ شعبان کو حاضری کا حکم دیا۔ میں وقت مقررہ پر گیا تو سوا گھنٹہ تک مذہبی تعلیم کے مسائل پر گفتگو جاری رہی۔ اٹھتے وقت فرمایا، ہم نہایت محظوظ ہوئے۔ میں سمجھا بات یہیں تک ختم ہوئی۔ یکایک پرسوں ایک زرد لفافہ رجسٹری پہنچی۔ کھولی تو دیکھا کر خود اعلیٰ حضرت کے دستِ خاص سے لکھی ہوئی تحریر ہے۔ جس میں میرے سابقہ آذوقہ ”تین سو ماہوار میں سو روپے ماہوار کے اضافے کی اطلاع تھی۔ اور آیندہ تکمیلِ سیرت پر ایک خاص صلے کی بشارت تھی۔ عبارت بعینہٖ نقل کرتا ہوں۔

> مولوی سید سلیمان ندوی
>
> جس مہتم بالشان کام کی تکمیل کی جا رہی ہے ”سیرۃ نبوی ؐ“ کی۔ اور جس انہماک سے مولوی صاحب یہ کام انجام دے رہے ہیں، اُس کے مدنظر موجودہ آذوقہ سماہ۳ میں سردست یک صد ماہانہ کا اضافہ یکم آذر سنہ جاریہ سے کرنے کے لیے میں نے حکم دیا ہے۔ رہا بعد تکمیل کام اُس وقت کے حالات کے مدنظر غور ہوگا کہ اس کا کیا صلہ دیا جائے۔ زیادہ والسلام
>
> آصف سابع

لفافے کا پتا بھی خود اعلیٰ حضرت کے قلم کا ہے۔ میں اس نوازشِ بے طلب کے لیے خداوند تعالیٰ کا شکر گزار ہوں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت یہ سمجھے ہیں کہ سابقہ تین سو میرا ذاتی وظیفہ ہے۔ یہ غلط فہمی دور ہونی چاہیے۔

رمضان گزر رہے ہیں، تراویحیں ہو رہی ہیں۔ مولوی ابوظفر صاحب آپ کی خدمت میں پہنچ چکے ہیں۔ تاریخِ ہند کے لیے دارالترجمہ عثمانیہ سے درخواست کی گئی ہے۔ امید

قوی ہے کہ مولوی برنی صاحب[1] گراں قدر مدد اس شعبے سے دلائیں گے۔ والسلام

سید سلیمان۔ ۵ ررمضان المبارک ۱۳۵۶ھ[2]

(۴)

مخدوم محترم! دام مجدکم۔ السلام علیکم

گرامی نامے شرف صدور لائے۔ میں نے ابنائے شرف الدین کو طبقات المفسرین حافظ سیوطی کے لیے خط تو بھیج دیا، مگر ابھی بیکلمہ جواب نہیں آیا۔ یورپ میں تو یہ کتاب چھپی تھی، مگر مصر میں اس کا چھپنا مجھے معلوم نہیں۔ جس وقت اطلاع آئے گی، عرض کروں گا۔

آج کل ایران سے بعض اچھی اچھی کتابیں نکل رہی ہیں چناں چہ کتاب التفہیم فی صناعۃ التنجیم بیرونی بہت اہتمام سے چھپی ہے۔ ۲۰ عہ قیمت ہے۔

آپ نے رباعیات سحابی کی نسبت دریافت فرمایا تھا۔ وہ نسخہ ندوہ میں ہے۔ اس نسخے میں صرف رباعیات ہیں۔ رباعیات کا انتخاب آپ کے [3] جج نے شائع کیا ہے۔ آپ کے پاس بھی بھیجا ہوگا۔

شبلی کالج کی عمارت ختم ہوگئی۔ ہمارے ہاں دفتر کتابوں کے گودام سے بھر گیا ہے۔ اس لیے دفتر کے لیے ایک چھوٹی سی عمارت دو چار روز سے بننی شروع ہوئی۔ غالباً دو ڈھائی ہزار لاگت آئے۔

حیات شبلی کی ترتیب میں بے حد مصروف تھا۔ بحمداللہ کہ حصہ اول ختم کے قریب پہنچ گیا۔ اختلاف ندوہ کے باب کو بہت بچا کر لکھا ہے، تاہم میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ کی نظر سے گزر جائے۔

ندوہ کے حالات شاید آپ کو معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ ندوہ کی تعمیر کا کام (تعمیر ظاہری و معنوی) ارکان سے مانگ کر تین برس کے لیے لیا ہے۔ اس سلسلے میں اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ندوہ کا بڑا ہال پوری طرح مکمل ہو کر کام میں آگیا ہے۔ اس میں کتبخانے

---

[1] ''قادیانی مذہب'' کے مشہور مؤلف پروفیسر محمد الیاس برنی (ف ۲۶ رجنوری ۱۹۵۹ء) کی طرف اشارہ ہے۔

[2] مطابق ۹ رنومبر ۱۹۳۷ء

[3] خط میں جج کے نام کی جگہ خالی ہے

کو منتقل کر دیا گیا ہے اور ایسی ترتیب سے الماریاں لگائی گئی ہیں کہ ہال کارآمد ہو کر نہایت خوبصورت ہوگیا، اور پھر ہال کا میدان جلسوں کے لیے اسی طرح کھلا ہے۔ کمروں میں کواڑ لگ رہے ہیں۔ دارالعلوم کی مغربی جانب میں پلاسٹر نہ تھا۔ منڈیر گر پڑی تھی اور اینٹیں کھسک رہی تھیں۔ پانچ سو لگا کر آج کل اس کا پلاسٹر ہو رہا ہے۔ ان تمام مصارف میں ندوہ کے خزانے کا ایک حبہ شامل نہیں، صرف فضل خدا ہے۔

چھوٹے بچے دارالعلوم ہی کے کمروں میں رہتے ہیں۔ اس سے ایک تو عمارت خراب ہوتی ہے، دوسرے درس گاہوں کی کمی ہے۔ اس کی یہ تدبیر کی ہے کہ نواب مہدی یار جنگ بہادر نے مجھ سے اپنے اسکولوں کے لیے سیرت پر ایک مختصر سی کتاب لکھوائی تھی جس کے اخراجات طبع وہ دیں گے یا پھر سو نسخے وہ خریدیں گے۔ جس سے بہر حال اخراجات نکل آئیں گے۔ میں نے اس کتاب کے پانچ ہزار نسخے چھپوائے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ ایک سال کے اندر اندر فروخت ہو جائیں گے اور دو چار ہزار کے قریب مل جائیں گے۔ اس رقم سے چھوٹے بچوں کا دارالاقامہ بنوانا چاہتا ہوں۔ بالفعل تیس لڑکوں کے لیے۔ اسی مناسبت سے اس دارالاقامہ کا "محمدیہ"[1] رکھنا چاہتا ہوں۔ بہ تعلق رقم سیرت!

کتب خانہ کمروں سے نکل کر ہال میں جو آگیا تو اس سے دو فائدے ہوئے۔ کتب خانہ روشن ہوگیا اور کتابوں کے دیکھنے کا آرام ہوا۔ دوسرے یہ کہ خالی شدہ کمرے درس گاہ کے کام میں آئے۔ اس سے ایک بڑی تکلیف دور ہوئی۔

ابھی ندوہ میں عربی مدارس کے طلبہ کا عربی تقریر میں مقابلہ تھا۔ بحمد اللہ کہ آپ ہی کا طالب علم سب سے اول آیا۔ اہل شہر کا کافی مجمع تھا، سب نے ندوہ کی اولیت کو محسوس کیا۔

شہر اور بیرونِ شہر میں معین الندوہ قائم کیا ہے۔ اس وقت اس کے ذریعے سے شہر سے صہ روپے ماہانہ کی آمدنی ہے۔ وللہ الحمد ۱۵ ستمبر کو ڈاکٹر امیر حسن[2] کی دعوت

---

[1] نواب صاحب مرحوم کے قلم نے "محمدیہ" کے بالمقابل مکتوب پر حاشیے میں "مدنیہ" لکھا ہوا ہے۔ یعنی نواب صاحب کے خیال میں دارالاقامہ کا نام "مدنیہ" ہونا چاہیے

[2] ڈاکٹر امیر حسن صدیقی (ف ۱۷ دسمبر ۱۹۶۱ء) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ اسلام کے استاد

پر علی گڑھ کا قصد ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

والسلام

سید سلیمان۔ ۶؍ستمبر ۱۹۴۰ء

⑤

مخدوم گرامی! دام مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ۔

الحمد للہ کہ ماہ صیام نے مع اپنی برکتوں کے نصف راہ کی منزل طے کر لی۔ کل شب پانزدہم رمضان کو دار المصنفین کی مسجد میں تراویح ختم ہوئی اور اس تقریب میں دعوتِ شبینہ انجام پائی۔

اس مبارک موقع پر میں ایک "قیمتی" "تحفۂ رمضان" خدمتِ والا میں بھیج رہا ہوں۔ یعنی "رحمتِ عالم" صلعم کے چار نسخے، یعنی وہ کتاب جو دار العلوم ندوہ میں چھوٹے بچوں کے دار الاقامہ کی تعمیر کے لیے چھاپی گئی ہے۔ ان چار نسخوں کی قیمت ۲؍ روپے رمضان ہی میں پانے کا متوقع ہوں۔ یہ چار نسخے، اس طرح تقسیم پا سکتے ہیں:

۱۔ جناب والا ۲۔ جناب بیگم صاحبہ ۳۔ مولوی عبید الرحمن خان صاحب[1]

۴۔ پیارے میاں[2] اور ملا صاحب[3] کو صرف سلام مسنون۔ والسلام

سید سلیمان

۱۵؍رمضان المبارک ۱۳۵۹ھ۔ ۱۸؍اکتوبر ۱۹۴۰ء

⑥

دفتر دار المصنفین۔ اعظم گڑھ

نمبر ۷-۶۶

مخدوم مکرم! دام مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ رمضان میں "حیاتِ شبلیؒ" کا نصف اول ارسال خدمت ہوا تھا۔ ارشاد تھا کہ رمضان میں اس کا مطالعہ بارِ خاطر ہے۔ رمضان کے بعد وہ مطالعے میں اگر واپس ہوگا۔ اب شوال بھی آخر ہے۔ شاید کہ فرصت نہ ملی ہو یا بات یاد نہ رہی

---

[1] حضرت مکتوب الیہ کے نامور صاحب زادے مدظلہ [2] مولوی مسعود الرحمن خاں شروانی عرف پیارے میاں حضرت مکتوب الیہ کے صاحبزادے، جنوری ۱۹۶۵ء میں وفات پائی۔ [3] مکتوب الیہ کے مصاحبِ خاص حاجی ملا احمد صاحب ۱۹۵۵ء میں فوت ہوئے

ہو۔ اِس لیے گزارش ہے کہ اگر وہ مطالعے میں آچکا ہے تو واپس کیا جائے۔ کاتب کو انتظار ہے۔

بحمد اللہ کہ ۱۵ر شوال کو میں نے اپنی ایک لڑکی کے نکاح سے فراغت پائی اور تقریب بخیر و خوبی سادگی سے انجام کو پہنچی ۴ے

شعبۂ دینیات کو نظامیہ میں ملانے کی تجویز اڑ گئی ۵ے نواب مہدی یار جنگ نے تصریح کے ساتھ لکھا کہ یہ حیدری کی تحریک تھی۔

والسلام

سید سلیمان، ۲۰ر نومبر ۱۹۴۱ء

⑦

بھوپال

مخدومی! دام مجدکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

وہ صاحب جو میرا نیاز نامہ اور ابراہیم محمدی صاحب کی مرسلہ کتاب لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، واپس آئے۔ اُن کی زبانی آپ کی خیریت اور میرے نیاز نامہ پر آپ کی مسرت کا حال بیان کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ نے جو گرامی نامہ لکھ کر عنایت فرمایا تھا، وہ راستے میں کھو گیا یعنی راہ میں ان کا بکس ریل میں چوری ہو گیا۔ اسی بکس میں وہ گنج شائیگاں یعنی آپ کا والا نامہ تھا، وہ بھی ضائع ہو گیا۔ جس کا بڑا افسوس ہوا۔ کیوں کہ میں اس کے لیے چشم براہ تھا۔

مگر خدا کا شکر ہے کہ اس وقت ایک موقع علی گڑھ کی حاضری کا مل گیا۔ کورٹ کے جلسے میں جو ۱۷ر کو ہو رہا ہے، حاضر ہو رہا ہوں۔ امید ہے کہ شرفِ نیاز حاصل ہو۔

والسلام

سید سلیمان۔ ۱۴ر اپریل ۱۹۴۹ء

بہ خدمت نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان شروانی
حبیب منزل۔ علی گڑھ۔

۴ے ۱۵ر شوال ۱۳۶۰ھ مطابق ۵ر نومبر ۱۹۴۱ء کو سید صاحب کی دوسری بیوی سے بیٹی شکیلہ کا عقد سید حسین (ایڈیشنل کمشنر بریلی ڈویژن) کے ساتھ ہوا تھا

۵ے تجویز یہ تھی کہ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کو اس سے الگ کر کے مدرسۂ نظامیہ کے ساتھ ملحق کر دیا جائے۔ تجویز کے اصل محرک سر اکبر حیدری تھے

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

مکتوب الیہ: مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی برصغیر کے مشہور مورخ و مصنف و صحافی تھے۔ انھوں نے تاریخ کے موضوع پر محققانہ کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ اقبال ان کی تحریر و تحقیق پر اعتماد کرتے تھے۔ خاص تاریخ کے موضوع پر انھوں نے نجیب آباد سے ۱۹۱۶ء میں ایک تحقیقی رسالہ "عبرت" نکالا۔ انھوں نے برصغیر میں مسلمانوں کے احیا کے لیے بڑا علمی کام کیا ہے۔ ان کے نام علامہ ندوی کے دو خط ہیں جو یہاں پیش کیے جا رہے ہیں۔ مولانا اکبر شاہ خاں کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا۔

(ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم)

(۸)

دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ

مکرمی زاد لطفہٗ

السلام علیکم۔ آپ جس قسم کا مشورہ چاہیں، میں حاضر ہوں۔ مجھے اس امر میں کیا دریغ ہو سکتا ہے۔ ہاں روہیل کھنڈ سے کوئی رسالہ تو نہیں نکلتا اگر آپ یہ خدمت انجام دیں تو اس سے کیا اچھا ہو سکتا ہے لیکن اب لفاظی کی بجائے عمل کی ضرورت ہے۔ روہیل کھنڈ میں کوئی پرزور اخبار ہی نہیں ہے۔ یہ بھی کرنے کی چیز تھی۔ تصنیف کے متعلق آپ کو کس قسم کے موضوع سے ذوق ہے۔ کیا آپ انگریزی اور عربی دونوں جانتے ہیں۔

والسلام

سید سلیمان۔ ۶؍ محرم ۳۴ھ [۲]

(۹) 1

محترم السلام علیکم

آپ کی یاد آوری اور تنبیہہ کا ممنون ہوں۔ میں موجود نہ تھا میری غیر حاضری میں یہ رسالہ طبع ہوا۔ ورنہ میں ضرور چند سطریں لکھ دیتا، مضمون کے آیندہ نمبر میں کچھ لکھوں گا۔

کیا آپ نے "عبرت" بند کر دیا ہے یا اب تک شائع ہو رہا ہے اگر خواجہ کمال الدین صاحب[۳] تشریف فرما ہوں تو سلام فرما دیجیے۔

والسلام

سید سلیمان۔ ۲۹؍ دسمبر ۱۹۱۵ء

---

[۱] مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے نجیب آباد سے ایک رسالہ "عبرت" جاری کیا تھا اس سلسلے میں یہ خط لکھا گیا (محمد ایوب قادری)

[۲] مطابق ۱۴؍ نومبر ۱۹۱۵ء

[۳] لاہوری پارٹی کے سرگرم رہنما (محمد ایوب قادری)

نواب سید علی حسن خاں مرحوم

۱۰

مخدوم مکرم! السلام علیکم

نظم مبارک (دو غزلیں) پہنچی، پہلی غزل چہ شناسی، حقیقت میں لاجواب ہے، خیالات بندش، لطفِ زبان، کس کس چیز کی داد دی جائے۔ بارک اللہ فی علمکَ و فضلک وعصمک من طوارح الحدثان،

والسلام

سید سلیمان - ۱۶/ اکتوبر ۱۹۱۸ء

۱۱

مخدوم محترم دام مجدہٗ السامی! السلام علیکم

آپ سے رخصت ہو کر اعظم گڑھ پہنچا۔ یہاں بھی چند روز حرارت اور پھوڑے کی تکلیف رہی۔ مگر آج اچھا ہوں۔ پھوڑے سے بھی ریم نکل گئی۔ اور اب صاف ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب بھی اُسی دن صبح کو الٰہ آباد آئے۔ وہ سخت علیل ہو گئے تھے۔ نمونیہ کا خطرہ تھا۔ الٰہ آباد میں بروقت علاج ہوا اور اب اچھے ہیں۔

جب سے آیا ہوں ندوہ کا تخیل قائم ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ ندوہ میں کوئی ذمہ دارانہ عہدہ لینے پر کسی طرح راضی نہیں اور نہ مستقل قیام لکھنؤ میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے لیے بالکل آمادہ ہیں کہ سال میں چند مہینے وہ وہاں اقامت کریں اور تنظیم و تعمیر میں اور فراہمی چندہ میں مدد دیں اور اس کے لیے وہ بہت جلد کاروائی شروع کریں گے۔ مولوی عبدالسلام صاحب عنقریب جائیں گے کہ ایک دو مہینہ رہ کر آخری سال کے طلبہ کو ادبی علوم میں مدد دیں۔ اور بچوں کی تعلیمی نگرانی کریں۔ مولوی مسعود صاحب نے طلباے قدیم کو خطوط لکھے ہیں اور اُن کا جلسہ بلانے والے ہیں۔ میری حالت یہ ہے کہ میں تعلیمی نگرانی کے لیے تیار ہوں۔ معتمد دارالعلوم بنا دیجیے سال میں متعدد پھیرے کروں گا، ندوہ کی نظامت کا بار اگر ڈالیں گے تو قہراً جبراً برداشت کروں گا۔ مولوی حبیب الرحمٰن خان شروانی کا خط آیا ہے۔ مشورہ پوچھا ہے۔

مولوی شملوی صاحب کا خط آیا ہے کہ بھوپال میں جس حد تک کوشش کرنی تھی ہو چکی

اور اب آپ کے ایماء سے حیدر آباد جاتے ہیں۔ عبد العلی صاحب کے لیے یہ کوشش کی اور مجھے لکھا بلکہ تم جنرل صاحب کو لکھو کہ اس کا وظیفہ ہو جائے۔ چناں چہ میں لکھوں گا اور امید ہے جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کو مل جائے گا۔ اس طرح ان کی تعلیم کا بندوبست ہو جائے گا۔

مولوی مرتضٰے صاحب جو پہلے کتب خانہ میں تھے میرے پاس آئے تھے کہ ان کو کتب خانہ میں کر دیا جائے میں نے کہا کہ اگر کتب خانہ میں آپ کے کام کا ریکارڈ اچھا ہے تو مجھے اختلاف نہیں۔ انھوں نے کہا کہ نواب صاحب خود مداح تھے، اگر آپ نے اُن کے کام کو پسند کیا ہے تو ضرور اُن کو کتب خانہ میں جگہ دے دیجیے۔ کتب خانہ کی حفاظت ضروری اور لازمی ہے۔ اس کا بند رکھنا کتابوں کو نقصان پہنچانا ہے۔

آپ ایجنڈا تو جاری فرما دیجیے۔ اور نظامت کی تجویز بھی درج کر دیجیے۔ اگر عارضاً میرا نام بھی لکھ دیجیے تو ہرج نہیں۔ مستقل انتظام میری نظر میں ہے۔ انشاءاللہ۔

مولوی عبد الرزاق اور مولوی عبد الرحمٰن صاحب نگرامی کو خط لکھے گئے ہیں۔ والسلام

سید سلیمان۔ اعظم گڑھ ۱۷ فروری ۲۳ء

۱۲

مخدومی المطاع ادام اللہ مجدہٗ!

والا نامہ صادر ہوا، آپ کا عتاب بجا ہے، مگر آپ نے میرے گرد و پیش کے حالات پر نظر نہ فرمائی، بہرحال اب میں ذاتی مجبوریوں اور معذوریوں کی داستان لپیٹ دیتا ہوں اور یہ مصرع پڑھ کر

ہرچہ بادا باد ماکشتی در آب انداختیم

اس بار عظیم کو اُٹھا لیتا ہوں اب جس طرح آپ مناسب سمجھیں نظامت کی تجویز پیش کیجیے۔ مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب کا بھی اشارہ میری ہی طرف ہے۔ خدا مجھ سے جس طرح کا کام لینا چاہے گا اس کی توفیق اور ہمت بخشے گا۔

سب سے پہلا کام عمارت کا مسئلہ طے کرنا ہے۔ ہم سب لوگوں نے تو مولوی ظہور احمد اور مولوی نسیم صاحب کے ہاں بالتفصیل عرض کر دیا تھا کہ زمین کا معاوضہ نقد چاہتے ہیں زمین نہیں چاہتے۔ گورنمنٹ کے تعلقات کا یہ تسمہ بھی کیوں لگا رہے؟

اواخر مارچ جلسہ کی تاریخ رکھیے، مولوی مسعود علی صاحب جلسے سے ایک ہفتہ پہلے آپ کے پاس آجائیں گے، ضروری کارروائیاں شروع کر دیجیے۔ میں ۲۵ر کو وطن جانے کا ارادہ رکھتا ہوں، ڈیڑھ برس ہو گئے، جلسے سے پہلے آجاؤں گا۔"

والسلام

سید سلیمان۔ ۲۱ر فروری ۱۹۲۳ء

۱۴

مخدوم محترم السلام علیکم!

گرامی نامہ موصول ہوا۔ اصولی حیثیت سے مجھے اس نظامت کے الاؤنس سے اختلاف نہیں، لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ میں اس صورت کو پسند نہیں کر سکتا اور نہ میں اپنے کو دو سو ماہوار میں ارکانِ ندوہ کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہوں، میری حیثیت، چند مہینوں کے بعد جب جوشِ موافقت کم اور جوشِ مخالفت زیادہ ہو جائے گا۔ ایک ہیڈ کلرک کی ہو جائے گی۔ طرح طرح کے طعن ہوں گے، نئے نئے دعوے ہوں گے۔ ندوہ کی یہ کس مپرسی اسی وقت تک ہے جب تک وہ سسک رہا ہے۔ جہاں کوششوں میں کامیابی شروع ہوئی اور ترقی کے آثار نظر آئے۔ آپ بھی دیکھیں گے کہ پھر کہاں کہاں سے مدعی اور صاحب طبل و علم پیدا ہوتے ہیں۔

البتہ یہ ہوگا کہ جب میں قیام کروں گا تو جب تک کی مدتِ اقامت ہوگی۔ میں مصارفِ ضروری کا بل ندوہ میں دے دوں گا۔ گویا معمولی کاروباری حساب کا طریق رہے گا۔ اور بس۔

نواب صاحب قبلہ! میں نے دار المصنفین اپنی قوتِ بازو سے اور خدا کے فضل و کرم سے بنایا ہے۔ جہاں میں آزاد اور بے غل و غش زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ندوہ سے زیادہ یہاں سرمایہ ہے۔ ۱۲ بیگھ زمین ملکیت ہے۔ بنگلے ہیں۔ کتب خانہ ہے پریس ہے موافق اور غم گسار احباب و رفقا ہیں۔ ان سب کو چھوڑ کر اور اپنے بنے بنائے کام کو لات مار کر ندوہ کے اکھاڑہ میں پاؤں توڑ کر بیٹھ جاؤں کیا آپ یہ رائے دیں گے؟

دار المصنفین کو اعظم گڑھ سے لکھنؤ منتقل کرنا گویا بنے بنائے گھر کو اجاڑنا ہے۔ اور اپنے کو لکھنؤ کی کشمکشوں میں آپ الجھانا ہے۔ سب سے بڑی چیز یہاں کی خاک میں استاد مرحوم کی لاش سپرد ہے۔ جس کا میں مجاور ہوں۔ اور جس کو تا دمِ حیات چھوڑ نہیں سکتا۔ میرے لیے اعظم گڑھ سے باہر بیسیوں ترغیبات کے موقع پیش آئے۔ مگر خدا نے مجھے مستقیم اور مستقل رکھا و بیدہ الفضل۔ ندوہ کی نظامت میں قبول کرتا ہوں اور اس سے بہتر کر کے دکھا دوں گا۔ انشاء اللہ جو پچھلے

دور میں تھا۔ اگر مخالفتوں اور سازشوں نے مجھے وہاں فرصت دی، پنڈت مالوی بنارس ہندو یونیورسٹی کے ناظم و معتمد سب کچھ ہیں۔ مگر وہ وہیں کے صرف نہیں ہو رہے، سب اطراف پر غور کر لیجیے پھر فیصلہ کیجیے۔ آپ صرف اپنی تجویز میں الاؤنس کا ذکر کر دیجیے۔ قبول کرنا نہ کرنا میرا کام ہے۔

والسلام

سید سلیمان ندوی از دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ - ۲۲ / فروری ۱۹۲۳ء

(۱۲)

مخدوم محترم دام کرمہ! السلام علیکم۔

والا نامہ نے مفتخر کیا۔ میں خود چند روز سے خدمت والا میں بہ ذریعہ تحریر حاضر ہونے والا تھا۔ بارے آپ نے پیش قدمی فرمائی، خالی شدہ جگہوں کے لیے مجھے خود فکر ہے اور میں تلاش میں ہوں، مدرس صرف و نحو کے لیے علمی مشاقی ضروری ہے اس لیے نو آموز آدمی اس جگہ رکھتے ڈرتا ہوں۔ کتب خانہ کے لیے علمی آدمی اور دیانت دار ہونا چاہیے۔ مدرس صرف و نحو کی ضرورت فوری ہوگی۔ کتب خانہ کے لیے چند روز توقف بھی ہو سکتا ہے۔ کتب خانہ کے لیے ایک دو آدمیوں نے جو ندوی بھی ہیں درخواست دی ہے ان سے خط و کتابت کرتا ہوں۔ چند روز ہوئے نواب عماد الملک کا خط میرے جواب میں آیا تھا۔ جس میں اپنی تائید کا یقین دلایا تھا۔ پھر مولانا شروانی کا والا نامہ آیا کہ تین سو ماہوار کی سفارش انھوں نے کی ہے اور پیش گاہ عالی میں پیش ہے، نئی درخواست ندوہ کی جانب سے نہ بھیجی جائے کل شروانی صاحب کا والا نامہ آیا کہ تین سو ماہوار رمضان سے حضور نے ندوہ کے لیے منظور فرمائے، آپ کے دورِ نظامت کا یہ دیباچۂ کامیابی ہے۔ مبارک۔

نصاب کے کاغذات مولانا حمید الدین صاحب کو دکھا دیے، رمضان کے بعد ایک دن مولانا حمید الدین صاحب اور مولانا حفیظ اللہ صاحب کو بلا کر مجلسِ نصاب کا جلسہ کر کے طے کر لیں گے۔

فقیہ دوم کے لیے مولوی عبد الحق صاحب ندوی کی درخواست آئی ہے اور چند اساتذہ نے ان کی تعریف کی ہے۔ ان کو مقرر کر دیجیے، مگر تقرر امتحاناً چھ ماہ کے لیے منظور فرمائیے۔ آپ ان کو کچھ نہ لکھیے۔ میں لکھ دیتا ہوں، اگر یہ فقیہ دوم کے قابل ہوئے تو اس جگہ پر ورنہ صرف و نحو کی مدرسی کی جگہ پر مقرر ہو جائیں گے۔ مجھ کو جو خط انھوں نے لکھا ہے۔ اس میں دو میں سے ایک جگہ مانگی ہے۔ والسلام

سید سلیمان - ۲۸ / اپریل ۱۹۲۳ء

⑮

مخدوم محترم السلام علیکم!

والا نامہ پرتو افگن ہوا، آج کی تاریخ تک تو مولوی مسعود علی صاحب واپس نہیں آئے۔ شاید آج شب کو یا کل صبح آئیں۔ نہیں معلوم تعمیرِ گنبد کے متعلق کیا ہوا، یہ بہت ہی ضروری اور اہم ہے۔ حضرت والا! میں تنہا حاضر ہوں گا! کبھی توفیق ملی تو بہ تثنیہ بھی حاضر ہوں گا۔ بہتر ہے اپنی تجویز کے مطابق، مولوی کلیم احمد صاحب کو کتب خانہ میں اور مولوی عبد الحق کو دار العلوم میں کر دیجیے، مولوی کلیم احمد کی اس بالاخوانی سے مجھے تکلیف ہوئی مع ۲۵ سے ان کو ۳۰ ملیں گے کیا یہ ترقی نہیں؟ جو مزید کا مطالبہ ہے دار العلوم میں تو اتنی بھی گنجایش نہیں کہ وہ اس سے زیادہ پا سکیں۔ مولوی عبد الحق کو میں نے کہہ دیا تھا کہ یا کتب خانہ کی جگہ لے گی (۳۰) یا مدرسی صرف و نحو (مع ۲۵) اس لیے اگر آپ اُن سے بلا کر کہیں گے تو وہ نامنظور نہ کریں گے۔

موجودہ انگریزی تعلیم کی نسبت میری رائے بہت بُری ہے، ندوہ کی انگریزی تعلیم سے کوئی فائدہ اب تک ہوا ہے اور نہ آیندہ ہوگا۔ اِس سے ہزار درجہ بہتر یہ ہے کہ تکمیلِ علوم کی طرح تکمیلِ انگریزی کا درجہ بھی کھولا جائے جس میں فارغ التحصیل اور منتہی طلبہ کو چند سال انگریزی پڑھائی جائے، بنابریں جو مستثنیٰ اپنے والدین کے منشا سے ہوتے ہیں ان کو ہونے دیجیے، البتہ حساب سے مستثنیٰ کسی حال میں نہیں کیا جا سکتا۔

ندوہ کی رکنیت مجھے منظور ہے۔ جناب مہتمم صاحب تاریخ خضری کو درس میں اس لیے داخل نہیں کرنا چاہتے کہ وہ شیعی ہے۔ وہ بیچارہ مصر میں زندہ سُنّی موجود ہے۔ میں اُن کو کچھ نہیں لکھ سکتا آپ اُن کو مراسلہ لکھ دیجیے کہ وہ شیعی نہیں سُنّی ہے۔ جامعۂ مصریہ کا استاد تاریخ ہے۔ جس مقام پر شیعیت اگر ہے تو استاد اُس کی تردید کرے گا۔

والسلام

سید سلیمان - ۲۹ر جولائی ۱۹۲۳ء

⑯

مخدوم و مکرم دام مجدکم! تسلیم و تکریم

کارڈ نے ممنون کیا۔ میں نے ۲۹ر کو ایک مفصّل خط لکھا ہے، جس سے بعض غلط فہمیاں دور ہو گئی ہوں گی۔ میں اپنی غلط روی و خطا کاری کا منت کش ہوں کہ اس کی بدولت ایک عمدہ رباعی یا قطعہ عالمِ وجود میں آیا۔ اور اس سے میں سرفراز ہوا۔ مجھ سے اس کا جواب ممکن نہ تھا کہ اوّل نقش

شاعری پھر فارسی میں شاعری میرے لیے قطعاً مشکل ہے۔ مگر میں اس کو بھی آپ ہی کا فیضِ سخن جانتا ہوں کہ کچھ غلط سلط سا میری زبان سے بھی نکل گیا:

لطفِ تو چارہ گرِ دردِ مرا بایستے　　حسنِ ظن با عملم نیز، ترا بایستے
درمیانِ طلبِ حق و عطا فرقے ہست　　آنچہ من طلبم از تو عطا بایستے

آج کل گھر میں بیماریوں کا سلسلہ ہے، سہیل کو کل ایک ہفتہ کے بعد بخار اترا تو آج سے ان کی ماں کو بخار ہے۔ وسط اگست تک شاید آنا ہو۔

والسلام

سید سلیمان ۔ ۲؍اگست ۱۹۳۰ء

⑰

مکرم و محترم دام مجدہ: السلام علیکم و رحمۃ اللہ

والا نامہ مع بجٹ دار المصنّفین موصول ہوا! یاد آوری کا شکریہ! لکھنؤ کی پچھلی آمد کے موقع پر عدم حاضری کی تکلیف دلی مجھے خود ہے! اسی لیے بار بار معذرت بھی پیش کی اور کہلا بھیجا مگر معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک آپ نے میرے اس اضطراری جرم کو معاف نہیں فرمایا! والعذر عند کرام الناس مقبول، کا مصرع کیا میرے ہی حق میں نادرست ٹھیرے گا۔ انشاء اللہ آیندہ حاضری میں آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے گا۔

ہمارے پاس صبحِ گلشن کا ایسا نسخہ ہے۔ جس کے شروع کے چند صفحے نہیں ہیں۔ اس لیے پوچھنے کی ضرورت ہے۔ کہ یہ آپ ہی کی تالیف ہے؟ اگر ہے تو یہ جاننا ہے کہ آپ نے حالات عموماً کن تذکروں سے لیے ہیں۔ چوں کہ ہمارے نسخے میں دیباچہ نہیں اس لیے اگر ماخذ کا ذکر دیباچہ میں ہو بھی تو مجھے معلوم نہیں ہو سکتا۔ شاید آپ اپنے یہاں کے نسخے کے دیباچے کو دیکھ کر معلوم کر سکیں۔

الحمد للہ خیریت ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب مکان گئے تھے۔ کل واپس آگئے ہیں۔ اچھے صاحب مارچ میں آنے والے ہیں، دیکھیے یہ وعدہ بھی ان کا پورا ہو یا نہ ہو۔ برادرم امیر حسن اور شمس الحسن صاحب کو سلام فرما دیجیے۔

والسلام

سید سلیمان ۔ ۲؍مارچ ۱۹۳۳ء

(۱۸)

مخدوم محترم دام کرمہٗ! السلام علیکم

والا نامہ مع جواباتِ مدرسین موصول ہوئے! شکریہ ہاں یہ سچ ہے مولوی عبدالحق ناتجربہ کار اور سادہ ہیں۔ مگر کام ہی سے تجربہ آتا ہے اچھا ہے ابھی یوں ہی رہنے دیجیے میں کس اور آدمی کی تلاش میں ہوں۔

عمارت کے کام میں میں نہیں سمجھتا کہ کیا دقتیں حائل ہیں۔ آیا یہ ہے کہ جلسہ نے اس کو طے نہیں کیا ہے یا یہ ہے کہ مزدور و معمار اور مسالہ نہیں ملتا! اگر دوسری دقت ہے تو خیر، اگر پہلی دقت ہے تو تعجب ہے کہ اب تک حل نہ ہوا۔ میرے خیال میں تو ایک تخمینہ بنوا کر جلسۂ نظامت سے بالفعل منظوری لے کر اتنا روپیہ معتمد تعمیرات کے نام بنک میں علاحدہ کرا دیجیے یا معتمدِ مال کی معرفت وقتاً فوقتاً ادا کرتے رہنا چاہیے۔

علمی کاموں کے لیے قوانین کی لفظی پابندی کبھی نہیں چل سکتی اور ہمیشہ کام میں رکاوٹ پیش آئے گی۔ آپ بے قاعدگی اور اعتراضات کا خوف نہ کیجیے، اس سے کوئی کام کرنے والا آدمی نہیں بچا ہے اور نہ بچے گا اور نہ بچ سکتا ہے یہ خیال دِل سے دور کر دیجیے۔

مولوی مسعود علی صاحب ندوہ کے کام سے گھبرا اُٹھے ہیں کہ ان حالات میں کام کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ چھوڑ کر چلے آنا چاہتے ہیں۔ بارے میں نے عید اضحیٰ تک روکا ہے کہ ۱۲-۱۳ عید تک میں بھی آؤں گا۔

خان بہادر سید حسین صاحب تو تعمیر کو خصوصاً گنبد کی تعمیر کو بہت ضروری سمجھتے تھے! ان کی وجہ سے تو دقت ہو نہیں سکتی! پھر کیا دقت ہے جس کے لیے اس قدر تعویق و تاخیر و تعلل ہے۔

مولانا شروانی عید الضحیٰ میں مکان آ رہے ہیں، مجھے لکھا ہے کہ دل یہ چاہتا ہے کہ اس مرتبہ لکھنؤ آؤں، میں بھی ان سے آنے کا اصرار کرتا ہوں، میں بھی اس زمانے میں وہیں ہوں گا۔

والسلام

سید سلیمان - ۱۶؍ جولائی ۱۹۳۳ء

نواب صاحب کا انتقال حضرت سید صاحب کی زندگی میں ہو گیا تھا سید صاحب نے ان کے انتقال پر معارف میں جو تعزیت کی تھی، اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ایک نواب عالم کی وفات

ہندوستان کے اُن پرانے مسلمان خاندانوں میں سے جو شرافتِ نسب کے ساتھ علم اور دولت دونوں کے جامع ہیں، اب خال خال گھرانے رہ گئے ہیں، انھیں میں سے ایک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان مرحوم کا خاندان تھا، جن کے چھوٹے صاحبزادے صفی الدولہ حسام الملک شمس العلماء نواب سید محمد علی حسن خان مرحوم نے ۱۹؍ نومبر ۱۹۳۶ء مطابق ۳؍ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ کی صبح کو اپنی کوٹھی بھوپال ہاؤس، لال باغ، لکھنؤ میں، بہتر ۷۲ برس کی عمر میں وفات پائی، افسوس ہے کہ ایک پرانے خاندان کے فضل و کمال اور جاہ و جلال کی یادگار آج مٹ گئی۔

مرحوم ان لوگوں میں تھے جن کی آنکھوں نے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی، سیاسی و تمدنی انقلاب کے مناظر دیکھے، وہ پیدا تو ایک "کنسرویٹو" گھرانے میں ہوئے، اور اسی ماحول میں تعلیم و تربیت پائی، لیکن فطرت کی طرف سے وہ ایک اثر پذیر اور حساس دل لائے تھے، باوجود اس کے کہ وہ بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں حد درجہ قدامت کی حکومت اور سطوت تھی اور ممکن نہ تھا کہ نور محل میں نئی روشنی کی ایک کرن بھی پہنچ سکے، مگر استعداد طبع دیکھیے کہ خود بخود ادھر طبیعت کا میلان ہوا، سرسید کی جدید تعلیمی تحریک میں اور پھر ندوۃ العلماء کی مذہبی تحریک میں شریک ہوئے اور ہر قسم کی جانی و مالی خدمتیں انجام دیں۔ مدت تک ندوہ کے اعزازی ناظم رہے، دار المصنفین کے اساسی ارکان میں تھے، اور لکھنؤ کی ہر سنجیدہ تحریک میں ان کا نام سرِ فہرست رہتا تھا۔

وہ عربی زبان کے عالم، فارسی زبان کے ماہر اور اردو کے مشاق اہل قلم تھے۔ فارسی شعر و سخن اور محاورات پر ان کو عبور کامل حاصل تھا، فارسی کا مشکل سے کوئی اچھا شعر ہوگا جو ان کو یاد نہ ہو، خود بھی فارسی میں اکثر اور اردو میں کمتر شعر کہتے تھے، انھوں نے اپنے والد ماجد کے زمانۂ عروج میں دنیا بھر کے مشرقی علما و فضلا کی صحبتیں اٹھائی تھیں، اور سوائے علمی و ادبی چرچوں کے اُن کے کانوں میں کوئی بات پڑی بھی نہ تھی، ان کے لیے اُن کے والد نے ہر فن کے باکمال استاد مقرر کیے تھے جن کے سایۂ تربیت میں وہ پل کر جوان ہوئے۔

وہ ہماری زبان کے مصنف بھی تھے۔ متعدد مذہبی اور تاریخی کتابیں اُن کے قلم سے نکلیں، شعرا کے تذکرے ان کی جوانی کی یادگار رہیں، فطرتِ اسلام اور مآثرِ صدیقی ان کی بہترین کتابیں ہیں،

آخر میں "مردم دیدہ" کے نام سے ان باکمالوں کے حالات لکھ رہے تھے، جن سے ان کو ملنے کا اتفاق ہوا، اور ان کی تعداد کچھ کم نہیں، اُن میں بڑا حصہ شعرا کا تھا۔

وہ مولانا شبلی مرحوم کے بے تکلف دوستوں میں تھے اور ایک دوسرے کے سچے قدردان تھے۔ یہی وراثت منتقل ہو کر ہم تک پہنچی، موصوف کو ہم لوگوں سے اس درجے محبت اور شفقت تھی جو خاندانی محبت سے کسی طرح کم نہ تھی، اور اس کو اس وضع داری سے نباہا کہ تیس برس کے عرصے میں ایک دفعہ بھی اس میں فرق نہ آیا۔ وہ مجسم اخلاق، حد درجہ پاک باطن اور نیک طینت تھے۔ شر و فساد سے طبعی نفور، اور ہنگامہ آرائیوں سے کوسوں دور تھے، تمول کے باوجود خاکسار اور علم و فضل کے باوجود ملنسار تھے۔

مذہبی خیالات میں گو وہ عقلیت کی طرف مائل تھے، لیکن اسی کے ساتھ مذہبی پابندی ان میں اتنی سخت تھی کہ ان کی ایک نماز بھی ان کے مقررہ وقت سے ٹلنے نہیں پاتی تھی، رسم و رواج بدعات کا ان کے گھر میں نشان نہ تھا اور اس بارے میں وہ نہایت سخت تھے۔ ان کی محفل میں علم و فن، شعر و سخن اور قومی مسئلوں کے سوا کوئی اور مذکور نہ تھا۔ عربی کتابیں ان کو پڑھے ہوئے مدت ہو چکی تھی اور پھر ان کا کوئی مشغلہ نہ رہا، تاہم جب ذکر آجاتا تو ان کو بھولے ہوئے خواب کی طرح بہت سی باتیں یاد آجاتیں۔

نور محل کے رہنے والے! تو بڑے باپ کا چشم و چراغ اور ایک پرانے خاندان کا چراغ سحر تھا، ۵/ نومبر ۱۹۳۶ء کو تیرا آخری دیدار نصیب ہوا، خیال نہ تھا کہ علم و فضل کا یہ ٹمٹماتا ہوا دیا اتنا جلد بجھ جانے والا ہے، اب تو وہاں ہوگا، جہاں خدا چاہے نور کے سوا ظلمت کا گزر نہیں۔ صفی الدولہ احتشام الملک اب تو وہاں ہے جہاں کسی کی دولت ہے اور نہ کسی کا ملک ہے، دعا ہے کہ وہ شہنشاہ علی الاطلاق اپنے ملک لازوال کی دولت جاوید سے تجھ کو سرفراز فرمائے،

(یادِ رفتگاں)

نامعلوم

(۱۹)

اعظم گڑھ

محترم! السلام علیکم

اللہ اکبر! آپ کا مجھ پر الزام ہے کہ میں غبار خاطر تو نہیں رکھتا یہ شیشہ اب اس قدر چور ہے کہ غبار پڑے بغیر بھی کوئی عکس نہیں دیتا نہ اپنا ہی چہرہ اس میں نظر آتا ہے نہ کسی اور کا۔ فطرت کا شاعر نہیں ہوں۔ مگر احساس کا شاعر ضرور ہوں۔ جس قدر میں اپنے دل میں احساس کی تکلیف اٹھاتا ہوں۔ اسی قدر واقعی اور مادی تکالیف کا احساس نہیں کرتا ہوں۔

یہ میری طبیعت ہے اس کو میں کیا کروں۔ وہ سمجھاتے ہیں مگر میں سمجھنے سے عاری ہوں۔

بہر آپ یقین جانیے کہ میری خاموشی کسی خاص اثر کا نتیجہ نہیں بلکہ تمام تر اپنی معروفیت کا نتیجہ ہے۔ دن تو سیرت اور معارف کے کاموں کے نذر ہوتا ہے اور رات ماضی کے خیال اور مستقبل کی فکر میں۔ اپنے کو ایک بڑے کام کے لیے تیار کرنا چاہتا ہوں دیکھیے کہاں تک علمی کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ خدا کے ہاتھ

جس سلیمان نے آپ سے وعدہ کیا تھا وہ تو اس دنیا میں موجود نہیں اور جو موجود ہے اس کو وعدہ کی خبر نہیں۔ اگر کوئی اور تدبیر ممکن ہو تو اس سلیمان کو اس سلیمان کا ذمے دار نہ بنائیے۔

اچھا ہوں لیکن پاؤں کی تکلیف ہنوز باقی ہے۔ شاید رگیں اپنی جگہ پر نہیں آئی ہیں۔ آج کل دلینہ کی پالیٹکس کیا ہے؟

والسلام

سید سلیمان۔ ۲۲ر نومبر ۲۱ء

۲۰

غیر مصرحہ حواشی فاضل مکتوب نگار کے قلم سے ہیں

دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ

محترم السلام علیکم۔

آپ نے بہت اچھا سوال کیا۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے جہاں زرد رنگ کی پسندیدگی کا ذکر ہے۔ اُس سے معمولی زرد رنگ[1] مراد ہے۔ اور جہاں ممانعت کا ذکر ہے اُس سے زعفران کا رنگ مراد ہے۔ طبع دوم میں اس تشابہ اور غلط فہمی کو واضح کردوں گا۔

کتنے آدمی ہیں جو کتابیں پڑھتے ہیں مگر چوں کہ عمل کا ارادہ نہیں ہوتا اس لیے اُن کی نظر اس قسم کی باتوں پر نہیں پڑتی خدا ہر شخص کو کتابوں کو غور و تعمق سے پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سیرۃ کی تیسری جلد مطبع میں ہے۔ یہ حصہ معجزات پر ہے۔ والسلام

سید سلیمان۔ ۱۷ر جنوری سنہ ۲۳ء

۲۱

اعظم گڑھ

مکرم وعلیکم السلام:

مکرمت نامہ کا شکریہ۔ یہ آپ اچھا کر رہے ہیں کہ اُس ذنکلسن کی کتاب) پر ایک مفصل تنقید کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُس کے قابلِ اعتراض مقامات مولوی خواجہ عبدالواجد صاحب ندوی ایم۔ اے پروفیسر مشن کالج کا نپور سے پوچھیے۔ اُنھوں نے اُس کا ترجمہ اردو میں (انجمن ترقی اردو کے لیے) کیا ہے۔ اور اُس پر حواشی تردیدی لکھے ہیں۔

”نگار“ کی طرف توجہ کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ شبابیات واہیات مضامین کے ذریعے سے نوجوان طالب علموں میں الحاد کا بیج بو رہا ہے۔ اگر صرف پنجاب میں اس کا بائیکاٹ ہو جائے۔

---

[1] سیرۃ النبی کی دوسری جلد کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک جگہ میں نے پڑھا کہ حضورؐ کو زرد رنگ بہت پسند تھا۔ دوسری جگہ لکھا تھا کہ حضورؐ اس سے نفرت فرماتے تھے۔ میں نے مولانا سے اس تضاد کی وجہ دریافت کی۔ یہ خط اسی استفسار کے جواب میں ہے۔

تو اُس کی آنکھیں کھولنے کو کافی ہے، آئندہ ہفتہ میں ہمت لکھنؤ میں ایک مراسلہ اس کی بابت چھپے گا۔ وہ نمبر آپ کے پاس بھیجوں گا۔ اخراجات میں شرکت کا شکریہ!

انقلاب کے اڈیٹروں[1] کو اس کی بابت لکھا۔ مگر جواب سے بھی محرومی رہی۔ تا بہ دیگراں چہ رسد۔

ہمارے دوست مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی عنقریب اس کام کو شروع کریں گے۔ میں آپ کا خط اُن کی خدمت میں بھی بھیج دیتا ہوں۔

والسلام

سید سلیمان۔ یکم ستمبر ۱۹۳۱ء

۲۲

شبلی ہوسٹل
بادشاہ باغ۔ لکھنؤ

مکرم! اسلام علیکم

نامۂ عالی کا شکریہ۔ نکلسن کی کتاب کا کیا حشر ہوا؟ پروفیسر شفیع صاحب کا بھی عنایت نامہ ملا ہے۔

نیاز کا فتنۂ نگار تو بحمد اللہ ختم ہوا[2]۔ احمد معمار کے متعلق آپ نے جن معلومات سے بہرہ ور کیا ہے۔ ان کا شکریہ۔ تاج کے جس مضمون میں آپ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ میں وہی مضمون چاہتا ہوں کہ آپ کو کس سند کی بنا پر علم ہوا کہ اس کا ہاتھ تاج میں بھی ہے۔

آپ کا مضمون کتبۂ دیوبند معارف میں بھیج دیا ہے۔ دفتر سے اطلاع ملی ہے کہ مضمون "عالمگیر" آپ کو بھیج دیا گیا ہے۔

سرکار[3] کی غلطی کا اظہار آپ نے خوب کیا ہے۔ والسلام

سید سلیمان۔ ۱۹ر اکتوبر ۳۱ء

---

[1] مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک کی طرف اشارہ ہے۔

[2] اس خط کا یہ حصہ میرے متعلق ہے اور بعد کا ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے متعلق ہے۔ اتفاق سے ہم دونوں کی خط و کتابت بیک وقت ہو رہی تھی۔ مولانا نے دونوں کو ایک سمجھ لیا۔ میں نے قریشی اور چغتائی کی طرف توجہ دلائی تو آپ نے التباس نام میں غلطی کا اعتراف کیا (ح۔ قریشی)۔

[3] جادو ناتھ سرکار مشہور مورخ۔

۲۳

دار المصنفین اعظم گڑھ

مکرم و علیکم السلام!

شرمندہ ہوں کہ اس التباس نام میں دو دفعہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ بات یہ ہے کہ ایک مسئلہ میں اُن سے خط و کتابت جاری تھی۔ کہ آپ کا عنایت نامہ آیا۔ اس سے ذہن مشارکت اسم کے بجائے وحدت اسمین کی طرف متوجہ ہوگیا۔ آیندہ آپ کی نسبت قریشی کو دھیان میں رکھوں گا۔ آج ہی قرآن کی اس آیت وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا کا امتیازی مطلب نمایاں ہوا۔

میں نے خواجہ عبدالوحید نہیں پروفیسر خواجہ عبدالواحد ندوی ایم اے پروفیسر مشن کالج، کانپور کا نام لکھا تھا انھوں نے (انجمن) ترقی اردو کے اشارے سے اس کا (نکلسن کی کتاب) اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اور مناسب حواشی تردیدی لکھے ہیں۔ وہ اس کتاب کے حسن و قبح پر پوری نظر رکھتے ہیں۔ میں نے بھی اُنھیں سے اس کتاب پر ریویو کی فرمایش کی ہے۔

آپ نے کون سی چند باتیں دریافت کی تھیں؟ مطلق یاد نہیں۔ آج کل انحراف صحت کے سبب بات پوری طرح یاد نہیں رہتی۔

آپ ہی نے تو فارسی ہند و ادبیات پر ریسرچ کا کام کیا ہے۔ کیا آپ کی کتاب چھپ گئی؟ پروفیسر شفیع صاحب[1] کا ایک خط اس باب میں میرے پاس بھی آیا تھا مگر میں نے ان کے خیال سے موافقت نہیں کی۔

والسلام

سید سلیمان۔ ۲۱ر نومبر ۳۱ء

---

[1] مشہور محقق مولوی محمد شفیع (لاہور) کی طرف اشارہ ہے۔

عبد القیوم ابن مولوی عبد الحکیم دیسنوی

۲۴

جدہ

بحضرت اخی المعظم دام مجدہٗ! السلام علیکم

خدا کا بے انتہا شکر ہے کہ میں بالکل اچھا ہوں، باوجود اس کے کہ جدہ ملیریس مقام ہے مگر میں ہر طرح محفوظ ہوں، سمندر کے کنارے جہاں حاجی لوگ اُترتے ہیں، اس عمارت کے بالمقابل ایک عماوت ہے جو شریف عبد اللہ کی بنوائی ہوئی ہے، اور اب بھی وہ شرفا کی ملکیت ہے، اسی کی تیسری چوتھی منزل میں ٹھہرایا گیا ہوں۔

شریف علی اور ان کے تمام وزرا سے بار بار ملاقات کر چکا ہوں۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ شریف علی کی فوج جدہ میں مستحکم ہو کر بند ہے، اچھا خاصا سامان، توپیں ہیں، طیارے ہیں، مگر آدمی کم ہیں۔ ادھر ابن سعود کے پاس بدو بہت ہیں مگر سامان حرب نہیں ہے ادھر کے فریق کو اصرار ہے کہ شریف علی کو پہلے بادشاہ مان لو۔ ادھر سے انکار ہے کہ ہم شریف حسین کے خاندان کو کبھی بادشاہ حجاز نہ مانیں گے۔ ہم نے سلطان کو اپنی آمد کا خط لکھا تھا، انھوں نے خط پا کر بلایا بھی، مگر شریف کی حکومت شریف کی بادشاہی مانے بغیر آگے نہیں جانے دیتی یہ معاملہ جلد ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔

اگر مرکزی خلافت کمیٹی سے واپسی کا حکم ہو گیا تو ہم بہت جلد دو ایک ہفتہ کے اندر واپسی کا سامان کریں گے، اور اگر رُکنا پڑا تو نہیں کہہ سکتا کہ کب تک رُکنا پڑے گا۔

بھابھی صاحبہ کو سلام فرما دیجیے، رقیہ وحمراء کو دعا۔ ہاجرہ کو دعا لکھ دیجیے گا۔ جب سے دیسنہ سے نکلا ہوں، آج تک کسی کا خط نہیں پہنچا ہے۔ اب اگر خط لکھیے تو میرا نام اور صرف جدہ کافی ہے، میرے نام کے ساتھ "رئیس الوفد الہندۃ" لکھ دیجیے گا۔

والسلام

سید سلیمان ۔ ۱۷؍ جنوری ۱۹۲۵ء

پروفیسر میمن عبد العزیز

۲۵

صدیقی الجلیل اسعدک اللہ!

والانامہ نے مشرف کیا، ایک شامی عیسائی عرب نے (امین ریحانی نام ہے) ابوالعلاء کا انگریزی ترجمہ کیا ہے، جدہ میں اس کا ساتھ تھا، اس کی بڑی کوشش تھی کہ تمام عرب طریقۂ ابوالعلائی پر آجائیں، تو بیڑا پار ہے۔ آپ کا ابوالعلائی چرخہ مئی کے معارف میں نکلے گا۔ اس کی ایک کاپی گاندھی جی کے پاس بھی بھیج دوں گا۔

ندوہ میں ضرور آیئے۔ تاریخ مناسب ہے، یکم جون کو مدرسہ کھلے گا، ہمارے ہاں لڑکوں کی بڑی تعداد نہیں چھوٹے سے لے کر بڑے تک صرف ۱۵۰ ہے، مگر کیفیت بہترین ہے۔

افسوس ہے کہ اس وقت ہمارے ہاں کوئی یعنی خالص ادیب نہیں، مولوی یوسف ندوی اور مولوی عبد الرحمٰن نگرامی ہیں، خاصے ادیب ہیں، قلم برداشتہ لکھتے ہیں، مگر خصوصی نہیں، خواجہ عبد الواحد ندوی تھے، مگر وہ قسمت دیکھیے کہ مشن کالج کانپور میں لڑکوں کو فارسی پڑھاتے ہیں۔ کیوں کہ وہاں ان کو سوا سو ملتے ہیں اور ہم سو سے زیادہ نہیں دے سکتے۔ مدرسہ کی آمدنی کم ہے، لیکن لوگوں کی ضروریات بڑھ گئی ہیں اور وہ اس قدر ایثار نہیں کر سکتے۔ اچھے لوگ کیوں کر آئیں، مستقبل سخت تاریک ہے، جدید علماء میں برابر سطحیت آرہی ہے۔

میں نے الزہرا اب تک نہیں دیکھا ہے۔ مہربانی کر کے ایک کاپی بھیج دیجیے۔ دیکھ کر واپس کر دوں گا۔ رجسٹرڈ ہو تو اچھا ہے۔ اورینٹل کالج کا میگزین دیکھا، ماشاء اللہ!

سید سلیمان

۱۸ر مئی ۱۹۲۵ء۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (لاہور)

(۲۶)

صدیقی الفاضل الاعز الکریم ادام اللہ سعدہ! السلام علیکم

آپ کے متعدد خطوط میرے ذمہ واجب الادا ہیں، میرا عذر یہ ہے کہ میں ۲۱؍جون سے ۱۴؍جولائی تک اپنے مستقر سے باہر شہر بہ شہر ندوہ کے چندہ کے لیے مارا مارا پھرا، ڈاک کہیں نہیں منگائی، واپس آکر آپ کے اکٹھے کئی خطوط ملے، کل کی ڈاک سے مضمون کتب خانۂ شروانیہ اور رسالۂ تاریخ فیروان ملا، شکریہ۔ مزید، آپ ابھی تک غالباً حیدرآباد ہی میں ہوں گے۔ اس لیے یہ خط وہیں کے پتے سے بھیجتا ہوں، رسالے بھی وہیں بھیجتا ہوں۔

معارف میں مضامین نگاروں کے معاوضہ کے متعلق آپ کیا سمجھے۔ اسسٹنٹ اڈیٹر اور سب اڈیٹر، میں نے تو حسب وعدہ آپ سے لکھنؤ ہی میں سفر کا بل مانگا تھا، مگر آپ نے بیجا شرم کو راہ دیا اور انکار کیا۔ اب آپ کا کارڈ آیا ہے، اس کے مطابق میں دفتر ندوہ میں لکھتا ہوں۔ امید ہے کہ ۱۵، ۲۰ دن میں بل منظور ہو جائے اور آپ کو لاہور کے پتے سے مل جائے گا۔

مولانا شروانی نے آپ کی آمد اور آپ کی ملاقات پر ایک خط میں بے حد خوشی ظاہر کی ہے، اور لکھا ہے کہ "جیسا تم نے لکھا تھا ویسا ہی پایا۔"

مولانا کے ناتمام قصیدۂ فارسی مطبوعۂ معارف کے متعلق ایک اور صاحب نے جو اس زمانے میں حیدرآباد میں تھے، وہی بات لکھی ہے جو آپ نے نواب اکبر یار جنگ کی زبانی نقل کی ہے، ستمبر و اکتوبر میں میرا عزم مدراس میں قیام کا ہے،

معارف مئی، جون، جولائی کا مرسل ہے۔ والسلام

سید سلیمان
۲۲؍اگست ۲۵ء

(۲۷)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ
مکرم! السلام علیکم

آپ کا دلچسپ مضمون پڑھا۔ آپ نے تو خاک کے تودے سے سونے کے ذرات

نکالنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون معارف میں شائع ہوگا، تمہید لکھ دی جائے گی۔

پچھلے تازہ اورنٹیل میگزین میں آپ کے [ہمنام کا] ایک مضمون "تاج محل کا ضمیمہ فہرست رسالہ میں درج ہے۔ مگر رسالہ میں نہیں، یا اُس نسخہ میں نہیں، جو میرے پاس آیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو کیا آپ وہ ضمیمہ مجھے بھجوادیں گے[1]

ماشاءاللہ آپ کا میگزین اپنی انفرادی شان میں برابر ترقی کر رہا ہے۔ نقد و تبصرہ کا مستقل عنوان بڑھا کر آپ لوگوں نے بڑا کام کیا ہے۔

لطیفہ فیضی والا مضمون ایک لطیفہ تھا۔ میرے ایک دوست کو یہ ناز تھا کہ یہ نسخہ صرف انھیں کے پاس ہے۔ اس لیے میں نے اُن کا خط چھاپ کر لوگوں سے خواہش کی تھی کہ جس کے پاس اس کا نسخہ ہو وہ مطلع فرمائیں۔ اس سلسلے میں وہ مضمون آیا تھا۔

شاید دسمبر کے آخر میں ملاقات ہو، مگر ابھی یقین نہیں۔ ادارۂ معارف کا جلسہ کیا امسال دلّی میں ہے۔ والسلام

۲۵؍ رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ[2]　　　سید سلیمان

(۲۸)

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرم! السلام علیکم

سرسید کے تعلق سے ایک تو وہ حلقہ ہے جو علی گڑھ کے ماحول میں چکر کاٹتا رہا۔ تو وہ تو وہی ہیں جن کا نام آپ نے لکھا ہے، یعنی حالی، نذیر احمد، شبلی، وقار الملک و محسن الملک، مگر دوسرے وہ ہیں جو اُن سے متاثر ہوئے، ان میں آپ خلیفہ محمد حسین صاحب مصنف اعجاز التنزیل مولوی ممتاز علی صاحب تہذیب نسواں، مولوی بشیر الدین صاحب البشیر، اور مولوی سراج دین

---

[1] ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے پیرس کے کتب خانہ بین الملی میں ایک مخطوطہ دریافت کیا تھا اور اسے اورنٹیل کالج میگزین (لاہور) کے نومبر ۱۹۳۷ء کے شمارے میں "یادداشت روضہ تاج محل آگرہ" کے عنوان سے بہ طور ضمیمہ چھپوایا تھا۔ یہ یادداشت ساٹھ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس وقت تک سید صاحب کو دستیاب نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں چغتائی صاحب نے انھیں بھیج دی تھی سید صاحب نے اس کے واقعی ہونے میں شک کیا تھا لیکن وہ اس وقت اور بعد میں بھی اس کا کوئی ثبوت مہیا نہیں کر سکے تھے

[2] ۲۵؍ رمضان ۱۳۵۷ھ مطابق ۲۷؍ جنوری ۱۹۳۹ء

اڈیٹر چودھویں صدی راولپنڈی مصنف سیرۃ صلاح الدین، الفاروق و مولوی وحید الدین صاحب سلیم وغیرہ ہیں۔

شرر پر اثر سر سید کی تحریک کا ہوا ہو، مگر اُس دائرہ میں نہ تھے۔

مضمون مارچ میں چھپ رہا ہے، تمہید لکھ دی گئی ہے، خدا کرے پسند آئے۔ والسّلام

۷؍ مارچ ۱۹۳۸ء

سیّد سلیمان

۲۹

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

مکرم! السلام علیکم۔

عنایت نامہ ملا۔ جو بات میرے دل میں تھی، وہ کاغذ پر آ گئی، باقی جدھر آپ کا خیال گیا وہ صفِ اوّل سے آ گئے۔ صحفِ اوّلین میں ہیں، الندوہ کا آغاز جمادی الاوّل ۱۳۲۲ھ سے ہوا۔

اور الندوہ مرتبۂ مولانا شبلی کا خاتمہ جمادی الاوّل ۱۳۳۰ھ پر ہوا۔ اس کے بعد چند روز اور لوگ نکالتے رہے۔ پھر بند ہو گیا۔ اس کے جوائنٹ اڈیٹر مولانا حبیب الرحمان خان شروانی تھے، اس میں باہر کے لوگ بہت کم لکھتے تھے، شروع میں شروانی صاحب بھی کچھ لکھتے تھے۔

ایڈیٹروں کے علاوہ اس کے سب اڈیٹر رکھا کرتے تھے، سب سے پہلے سب ایڈیٹر مولانا ابوالکلام آزاد ہوئے[1] ان کا زمانہ ۱۹۰۵ء و ۱۹۰۶ء پھر مولانا عبداللہ عمادی ہوئے، پھر خاکسار ہوا۔ میرے بعد مولانا عبدالسلام صاحب ندوی ہوئے، پھر میں ہوا، پھر میرے ہی ہاتھ میں بند ہوا، اور انھیں لوگوں کے مضامین اس میں ہوتے تھے، ضیاء الحسن علوی ایم اے ندوی رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی الہ آباد۔ خواجہ عبدالواجد ندوی ایم اے کانپور، شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولانا سید عبدالحی صاحب ناظم ندوہ وغیرہ کے مضمون کبھی کبھی نکلے۔

---

[1] مولانا آزاد کی سب ایڈیٹری کا زمانہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے شروع ہو کر مارچ ۱۹۰۶ء پر ختم ہوتا ہے۔

اس کے امتیازی خصوصیات، مذہبی، تاریخی اور علمی تھے۔ والسلام

سید سلیمان
۳/ اپریل ۱۹۳۹ء

(۲۰)

دارالمصنفین اعظم گڑھ

مکرم! السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۱۶/ جون کا جواب ۲۲/ جولائی کو دینا ہر چند آئینِ اخلاق سے دور ہے، مگر چند سال سے یہ عہد کیا ہے کہ ڈھائی مہینے گرمیوں کے کسی کوردہ میں بسر کروں جو تمدنِ جدید کی رعنائیوں سے خالی ہو، چناں چہ یکم مئی سے ۱۵/ جولائی تک وہیں بسر ہوا، اسی اثنا میں عنایت نامہ آیا۔

مشرقی صاحب کے "تذکرہ"[1] پر تبصرہ میں نے لکھا تھا، جو زمیندار میں چھپا تھا۔ امرت سر میں مولانا قاسمی صاحب نے چند رسالوں کے ساتھ اس مضمون کو بھی چھاپا ہے، ان سے طلب فرمایئے میرے پاس نہیں۔

یہ صاحب سر سید سے بھی آگے ہیں، اور کم از کم "تذکرہ" کا فلسفہ ایسی جہالت کی بنیاد پر قائم ہے، جس کا ڈھانا ہر سمجھ دار مسلمان کا فرض ہے۔ باقی مسلمانوں کی عسکری تنظیم کے مقصد سے ہمیں اختلاف نہیں۔ سطح اتنی ساکن ہے کہ اس میں حرکت پیدا کرنے کے لیے کوئی تنظیمی قوت جو غیر اشتدادی عسکریت پر مبنی ہو بے حد ضروری ہے۔ والسلام

سید سلیمان
۲۲/ جولائی ۱۹۳۹ء

آپ کی کتاب کے جو ٹکڑے نظر سے گزرے وہ بہت دلچسپ اور مفید معلوم ہوئے۔ اب پوری کتاب ایک ساتھ دیکھوں گا۔ آپ نے سیرت کی چھٹی جلد ملاحظہ کی۔ والسلام

---

[1] علامہ عنایت اللہ المشرقی (ف ۱۹۶۳ء) اور ان کی مشہور تصنیف "تذکرہ"

مولانا محمد عرفان[1]

(۲۱)

۲۲ - ۴۴ ٹنڈرسن اسٹریٹ، مدراس

مخدوم محترم دام کرمہ! السلام علیکم

آپ کے اخیر تار نے مجھے بے چین کردیا، کئی دفعہ تار لکھوایا، اور پھر کٹوایا، یقین جانیے کہ رات بھر سکون سے نیند نہیں آئی، گو یوں بھی دماغ کی خشکی اور معدہ کی تبخیر کے باعث تین مہینے ہوگئے کہ نیند کی اصلی لذت سے محروم ہوں، مگر آج کی شب تو صرف کروٹ ہی بدلتے بدلتے گزر گئی اور زبان پر یہ مصرع تھا: ”دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور“

گو میں اپنے پہلے خط میں اپنی معذرت کے اسباب پوری طرح لکھ چکا ہوں، مگر آپ نے شاید باور نہیں کیا، اس لیے میں دوبارہ اپنا حلفیہ بیان پیش کرتا ہوں اور یہ اس لیے کہ مجھے آپ کے ساتھ جو محبت ہے اس کی وجہ سے یہ خیال کر کے دل میں تکلیف محسوس کرتا ہوں کہ آپ میرے عذرات کو محض بہانہ تصور کرتے ہیں۔

۱- میں یہاں چند ہفتوں کے لیے مسافرانہ آیا، اسباب و سامان جو ایسے بڑے سفر یعنی حجاز کے لیے درکار رہتے[2] وہ ساتھ نہیں، پاسپورٹ میرے پاس نہیں۔ پچھلا پاسپورٹ کہیں اعظم گڑھ میں پڑا ہے۔ پاسپورٹ مدراس میں نہیں مل سکتا، بمبئی میں نہیں مل سکتا، پھر کیوں کر، اگر یا یں ہمہ بے سروسامانی چل کھڑا ہوں تو ۲۹ کو کراچی یا ۳۱ کو بمبئی پی اوٗ سے روانہ ہو سکتا ہوں۔ غور فرمائیے۔

۲- ہر شخص جو کچھ بھی اپنے پیچھے تعلقات رکھتا ہے، وہ کسی بڑے سفر سے پہلے کچھ انتظامات کرتا ہے۔ میں پٹنہ کے جلسے میں شریک ہو کر ابھی تک اعظم گڑھ نہیں گیا، چند ہفتوں کے لیے دارالمصنفین اور معارف کا کام سنبھال کر، اور مطبع میں چھپنے کی چیزوں کا

---

[1] وفد خلافت میں شریک ہو کر حجاز کے حالات و مسائل کے مطالعہ و تصفیہ کے لیے حجاز کے سفر اور شاہ فیصل آل سعود کی منعقدہ موتمر اسلامی میں شرکت کا مسئلہ درپیش تھا۔

[2] ۱۹۲۴ء میں وفد خلافت میں شریک ہو کر حجاز جانے کے لیے نکلے تھے لیکن یہ وفد جدہ میں دو ماہ کے قیام کے بعد ناکام واپس آ گیا تھا۔

سامان کر کے مدراس چلا آیا، میں نے مجلس عالمہ میں شرکت وفد سے انکار کر دیا تھا، اب ادھر آپ کے تاروں نے بتایا کہ میرا نام ضروری ہے اور مٹ نہیں سکتا۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ میں اعظم گڑھ جا کر چند مہینوں کے کام متعین کر دوں، مطبع میں کتابوں کی چھپائی کا کام مقرر کروں، معارف کے مضامین کا سامان کر جاؤں۔ پچھلی دفعہ جب[1] یورپ گیا خوش قسمتی سے میرے شریکِ ادارت مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی تھے، اُنھوں نے معارف سے مجھے مستغنی کر دیا تھا۔ اور مطبع میں سیرت دوم کا کام سال بھر کے لیے کافی تھا، دوسری مرتبہ تین مہینوں کا کام درست کر کے گیا، اب نہ مولوی عبدالماجد صاحب ہیں اور نہ مولوی ابوالحسنات مرحوم، اور نہ اور کوئی کام سنبھالنے والا ہے۔ بایں ہمہ مجھے عرب کے سفر کے لیے مدراس سے واپس جا کر چند مہینوں کے انتظامات اپنی غیر حاضری کے زمانے کے درست کر کے تیار ہونا تھا، اور اس کا موقع نہیں، ایسی حالت میں جانے کے معنی معارف اور دارالمصنفین کے بند کر دینے کے ہیں۔

۲۔ مصیبت جب آتی ہے ایک ساتھ آتی ہے۔ مولوی مسعود علی صاحب کی بھتیجی کی شادی درپیش ہے، بہت دنوں سے وہ ٹال رہے تھے، نومبر کا مہینہ فریق دوم نے آخری مہینہ مقرر کیا ہے، کہ شادی کیجیے یا جواب دیجیے اور یہی مہینہ ان کے دو ہزار ادائے قرض کی قسط کا ہے۔ جس کا قصہ شاید آپ جانتے ہوں، اس لیے وہ اوائل نومبر سے ایک ماہ کے لیے دارالمصنفین چھوڑ کر مجبوراً مکان رہیں گے، اور دارالمصنفین کے لیے ہم میں سے ایک کا رہنا ضروری ہے اور اسی لیے اُن کو آزاد کرنے کے لیے مجھے یہاں سے دو چار روز میں روانہ ہو جانا ہے، کیوں کہ یہاں جو لیکچر دینے تھے وہ ختم ہو چکے، صرف ایک باقی ہے، جو آج کل میں ہو جائے گا[2]۔

۴۔ میں باقاعدہ دارالمصنفین کا نوکر ہوں، اس میں دونوں طرح کے ارکان ہیں، پہلے یورپ گیا تو بلا اطلاع گیا، اور تنخواہ جاری رہی مگر اُس وقت ہوا ایسی تھی کہ وہ مخالفت نہ کر سکے۔ دوسری دفعہ حجاز گیا تو ان کی اجازت لے کر تین مہینہ کی رخصت پر گیا، مگر اس دفعہ باہم بدمزگی ہوئی،

---

[1] سنہ ۱۹۲۰ء میں وفدِ خلافت میں شامل ہو کر یورپ کے سفر کی طرف اشارہ ہے۔

[2] اسی سفرِ مدراس میں سید صاحب نے سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر معرکہ آرا لیکچر دیے تھے، جو بعد میں "خطبات مدراس" کے نام سے طبع ہو کر مشہور و مقبولِ عالم ہو چکے ہیں۔

اب اس دفعہ پھر اس بدمزگی کو بڑھانا سوسائٹی یعنی دارالمصنفین کو برباد کرنا ہے، ان میں بعض وہ ممبر بھی ہیں جن کے ذریعے سے حیدرآباد کی امداد آتی ہے، مجھے یا تو مستعفی ہو جانا چاہیے یا دارالمصنفین کو باہمی اختلاف کی بنا پر توڑ دینا چاہیے۔ گو میں اب بھی زبردستی جا سکتا ہوں، مگر بار بار درخواست کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

۵۔ ندوہ کا قصہ یہ ہے کہ نومبر کے آخر میں انبالہ میں اس کا سالانہ جلسہ ہے، مولوی مسعود علی صاحب اپنی خانگی ضرورتوں کے باعث گھر سے باہر نہیں ہو سکتے۔ اب مجھی کو اس جلسے کو سنبھالنا ہے، اس مہینے میں میری غیر حاضری کے باعث بعض مخالف ارکان نے مدرسہ پر مجلس تحقیقات تعلیم و اخلاق یعنی انکویزیشن مجھ پر قائم کیا ہے، تاکہ میرے زمانۂ معتمدی پر الزام رکھ کر مجھے بدنام کیا جا سکے، اس سے پریشان ہوں۔ اس کے بچاؤ کی صورت کرنا ہے، ایک مدرس کا انتقال ہو گیا اس کی جگہ کا انتظام مجھے کرنا ہے، نصاب بنانا اور بنوانا ہے اور سرمایہ کی فراہمی کا انتظام کرنا ہے۔

یہ سب تو دور دور کی یعنی آفیشل مجبوریاں تھیں، اب میں آخر اپنا جسم آپ کو دکھاتا ہوں، یورپ سے یہ بیماری لے کر آیا کہ کھانے کے دو گھنٹے بعد جگر سے لے کر گردہ تک درد ہوتا ہے، علاج سے دب جاتا ہے اور پھر ہو جاتا ہے، اس کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ خاص قسم کی غذا کھائی جائے اور خاص طریق سے رہا جائے۔ آپ اپنی مہربانی سے ہر قسم کا انتظام اپنے سر لینے کو تیار ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں عرب کو دیکھ چکا ہوں اور آپ صرف سن کر فرماتے ہیں۔ پچھلی دفعہ عرب کے سفر نے پھر مرض کو پیدا کر دیا، بلکہ اور ایک نئے مرض میں مبتلا کر دیا۔ عرب میں گوشت عموماً دنبے کا ہوتا ہے جو میرے لیے زہر، روٹی بازاروں میں خمیر کی پکتی ہے نہایت ثقیل، سبزیاں اور ترکاریاں جو میں کھاتا ہوں وہاں نہیں ملتیں، پچھلی دفعہ ہندوستانی باورچی رکھا گیا، مگر گوشت اور روٹی کی قسم کو وہ کیا کرتا، وہاں درد شروع ہو گیا، تو دوا بھی بہ مشکل میسر آ سکی، اینٹ کو آگ میں گرم کر کے اس سے جگر، پیٹ اور گردہ کو سینک کر علاج کرتا تھا اور تسکین حاصل کرتا تھا۔ پاخانہ کا وہاں سسٹم ایسا ہے جو ایک دائم المرض کے لیے سوہانِ روح ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ ایک مہینے میں اس کی کیا تکلیف وہاں اٹھائی ہے، اس سے ایک مرض نیا یہ تحفہ لایا ہوں کہ دونوں سرین کے بیچ میں کوئی رگ، یا پٹھا یا ہڈی ہے، اس میں درد ہو جاتا ہے، اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے، اور اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ اس حالت میں موٹر کی سواری پر بھی حرکت ہوتی ہے، تو جان نکل جاتی ہے، ایسی حالت میں رابغ سے مکہ معظمہ تک

کئی دن اونٹ یا شغدف کی سواری میرے لیے ناقابلِ تحمل ہے۔ دماغ کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ذرا سی فکر یا کسی خیال کی آمد سے نیند جاتی رہتی ہے، تین مہینے سے یہ حال ہے، قلب پر یہ اثر ہے کہ بالکل افسردگی اور پژمردگی آگئی ہے، ذرا سا بولتا ہوں یا تقریر کرتا ہوں تو تھک جاتا ہوں اور سینہ میں درد ہو جاتا ہے۔ یہاں آیا تھا کہ کام کے ساتھ کچھ تفریح اور تبدیل آب و ہوا ہو جائے گی، یہاں ایک مرض جو جاتا رہا تھا عود کر آیا یعنی قار درہ میں سوزش، اور ایک مرض ترقی کر گیا یعنی سوزش اور دردِ شکم کے ساتھ دو تین دفعہ دست۔ ڈاکٹری علاج یہاں کیا کوئی فائدہ نہ ہوا، آخر ایک ہفتہ کے لیے بنگلور گیا تھا، وہاں حکیم صاحب قبلہ کے ایک مستعد شاگرد حکیم ہیں انھوں نے دیکھا اور دو تین یونانی قرص، معجون اور شربت تجویز کیا ہے جو روزانہ استعمال میں ہے اور اس سے کسی قدر تخفیف ہے۔

میں نے اپنا دل نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور خدا جانتا ہے کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔ ناز و نخرہ اور بہانے کی عادت نہیں، اور نہ طمع دنیا میں گرفتار ہوں، میری سات آٹھ برس کی ملاقات آپ سے ہے۔ آپ جیسے آدمیوں کی شناخت کے مدعی سے میرا کوئی عیب یا ہنر چھپا نہ ہوگا، خدا جانتا ہے کہ آپ کی خواہش کو پوری نہ کرنے کا کس درجہ افسوس ہے، میں گنہگار ہوں، اور اپنی گنہگاری کی سزا آپ کے ہاتھ سے برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ کیا کسی طرح اس کی تلافی ہو سکتی ہے؟

میں دو چار روز میں یعنی یکم نومبر کو اعظم گڑھ روانہ ہو جاؤں گا۔ والسلام

سید سلیمان۔ ۲۶ ر اکتوبر ۲۵ء

(۴۲)

اعظم گڑھ

محترم دوست الطافکم! السلام علیکم۔

والا نامہ کا شکریہ، ایں بہ بیداری است یا رب یا بخواب، خواہ کسی دوست کی ضرورت ہی سے آپ نے 'یاد تو کیا اور اس پر شکریہ واجب،

میں تو قومیات و مجلسیات کی دنیا سے شاید تین سال سے کنارہ کش ہوں، امروہہ کا واقعہ اتفاقی تھا، میں علی گڑھ جا رہا تھا کہ بیچ میں یہ حادثہ پیش آگیا،

آپ کی طرح میرے اکثر ملنے والوں نے امروہہ کے فیصلے کو میری قوت تقریر کا نتیجہ بنا کر

مورد الزام بنایا، خیر یہ بحث تو الگ رہی کہ اس پر مورد الزام بنانا مناسب ہے یا مورد اکرام! بہر حال اگر یہ صحیح ہے تو مجھے معذور ہونے دیجیے کہ میں اس قدر پُر تاثیر مقرر ہوں کہ حاضرین کو جدھر چاہوں جھونک دوں۔

آپ کے خط پر "خلافت کمیٹی آفس" کا پتہ پڑھ کر میں چونک گیا کہ بار الٰہا! میں اور خلافت کمیٹی! آپ نے دیکھا جس معاملے پر آپ کی خلافت کمیٹی نے مجھے مطعون کیا، اس کا حشر کیا ہوا، اور ابن سعود سے بگاڑ کر کیا پایا، یا کیا کر سکے! بہر حال گذشت آنچہ گذشت، اب صرف اس کی تلخ یاد باقی رہ گئی ہے، زمانہ اس کو بھی مٹا دے گا۔

اگست میں لکھنؤ اگر میری زیارت آپ نہیں کر سکتے۔ اگر اس غرض کو ادا کرنا ہے تو اعظم گڑھ آنا پڑے گا۔ آپ دار الخلافت سے جہاں چاہیں جا سکتے ہیں، مگر جو جہاں ہے وہ دار الخلافت نہیں پہنچ سکتا۔

آپ کے پر کیف حالات سے میں بے گانہ نہیں ہوں، اللھم زد فزد آپ نے مولویوں کو چھوڑ کر گریجوٹیوں سے عہد باندھا، کیا پوچھ سکتا ہوں — تو عہد باکہ، واز کہ گسستی۔

بہر حال آپ نے جس معاملے کی نسبت لکھا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ سالہا سال کے تجربوں کے بعد یہ طے کر لینا پڑا ایجنسیوں کا معاملہ سخت نقصان رساں ہے، بیسیوں واقعات پیش آ چکے، شروع میں جوش پیدا ہوا اور پھر جب مشکل آ پڑی یا نقصان آیا تو کتابوں تک کو واپس نہ کیا، سید جالب، رحمانیہ بک ڈپو، زمانہ بک ڈپو، اور خدا جانے کون کون، اکابر سے معاملہ پڑا اور سخت نقصان دار المصنفین نے اٹھایا۔ اس وقت سے ہم لوگوں نے یہ قاعدہ بنایا ہے کہ کسی کو ایجنسی اس طرح نہ دی جائے، آپ بھی اپنے دوست کا تجربہ کر لیں، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے اہل ملک اور ہم قوم کہاں تک حسن معاملہ کی صلاحیت رکھتے ہیں، بہر حال چوں کہ آپ نے لکھا ہے، اس لیے ہم اتنا کر سکتے ہیں کہ آپ ان سے سو روپیہ پیشگی بھجوا دیجیے، اور فہرست بھیجی جاتی ہے اس میں سے وہ ہر ایک کتاب کے جس کو وہ رکھنا پسند کریں، ایک ایک دو دو نسخے منگوا لیں اور ہر مہینہ کے آخر میں جو حساب و کتاب ہو وہ دیتے رہیں اور قیمت ادا کرتے رہیں، مولوی عبد الماجد کی تصنیفات بھی یہیں سے ملتی ہیں، اور ان کے لیے بھی یہی شرائط ہیں۔

براہِ عنایت اپنے دوست سے فرمایئے کہ آیندہ معاملات کے متعلق مولانا مسعود علی صاحب منیجر دار المصنفین کو لکھیں اور طے کریں۔

مولانا شوکت علی صاحب کو سلام فرما دیجیے ۔ والسلام

سید سلیمان ۔ ۲۴؍ جولائی ۱۹۳۰ء

مکتوب الیہ کے انتقال پر فاضل مکتوب نگار نے معارف میں ان الفاظ میں ان کا ماتم کیا:

ایک مجاہد کا ماتم

مولانا محمد عرفان خاں صاحب معتمد خلافت بمبئی کی ناگہانی وفات کی خبر اخباروں کے ذریعے آپ تک پہنچی ہوگی۔ مرحوم ہزارہ سرحد کے رہنے والے تھے، اور سلسلۂ خیرآباد کے عالم معقولات اور مدرس تھے۔ ۱۹۲۰ء کی قومی تحریکات نے درس و تدریس کی مسند سے اٹھا کر قوم و ملت کے اعلیٰ کاموں سے ان کو وابستہ کر دیا۔ ان کی سب سے مخلصانہ خدمت ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں ملکانوں کے فتنۂ ارتداد کے موقع پر ان کی جاں بازی، ایثار و محنت ہے۔ اُن کے علاقوں میں بیسوں میل پیادہ اور بھوکے پیاسے سفر کرنا اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں مارے مارے پھرنا، ان کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے جمعیۃ العلمائے ہند۔ دہلی سے وابستہ ہو کر جمعیۃ کے کاموں کو کچھ زمانے تک انجام دیا، اور شریف حجاز اور ابن سعود کی لڑائی کے زمانے میں حجاز جا کر معاملات کی تحقیقات کے لیے نامزد ہوئے۔ پھر ۱۹۲۶ء میں موتمر اسلام کی شرکت کے لیے گئے، اور وہاں سے واپسی پر وہ بمبئی کی مجلس خلافت کے کاموں میں مصروف ہو گئے اور اسی مصروفیت میں ان کی زندگی کے آخر سال بسر ہوئے۔ ان کی عمر اس وقت پچاس سے زیادہ نہ ہوگی، بلند و بالا، مضبوط و قوی تھے۔ ایک دفعہ وہ قومی تحریکوں کے سلسلے میں قید بھی ہوئے تھے، اور اسی قید میں انھوں نے یہ سعادت پائی کہ حافظ قرآن ہوئے۔

مرحوم نہایت دوست پرور، ہنس مکھ، ظریف اور فیاض تھے۔ صوبہ سرحد سے وہ مدتوں جلاوطن رہے۔ جلاوطنی کا دور ختم ہوا، تب بھی وطن جا کر اپنی خدمات کی وسعت کو انھوں نے محدود کرنا پسند نہیں کیا۔ تمام عمر مجرد رہے اور اسی طرح پوری عمر گزار دی۔ ایک طرف وہ فقیر بے نوا تھے، دوسری طرف حد درجہ غیور و شریف۔ غالب کا مصرع آج ہی صادق آیا ہے:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا　(یاد رفتگاں)

مولانا محمد عرفان کا ۱۴؍ اپریل ۱۹۳۹ء کو انتقال ہوا تھا۔

خواجہ عبدالوحید (لاہور):

۴۳

دار المصنفین اعظم گڑھ
۷ر مئی ۱۹۲۷ء

محترم! علیکم السلام

آپ نے ۱۱ر اپریل کو مجھے خط لکھا تھا، جو یہاں ۱۴ر اپریل کو پہنچا تھا۔ میں اس سے پہلے یہاں سے لاہور کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ واپسی کے بعد خط پڑھا۔ افسوس ہوا کہ آپ سے بروقت نیاز نہ ہو سکا، اور نہ اطلاع دے سکا، واپسی کے بعد پھر مجھے لکھنے کی جلدی نہ رہی تاہم آپ کی یاد فرمائی کی عنایت، کا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا۔ یار زندہ صحبت باقی۔ والسلام

سید سلیمان

۴۴

دار المصنفین اعظم گڑھ
۲۲ر جنوری ۱۹۲۹ء

محترم! علیکم السلام

خط ملا، میں سفر میں تھا، اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔ تاخیر کی معذرت قبول فرمائیں۔
آپ کے اس مضمون کی تعریف میں نے سنی۔ آپ مضمون بھیج دیں۔ ترجمہ ہو کر شائع ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی بات قابل بحث ہوگی، تو دریافت کر لوں گا۔ والسلام

سید سلیمان

۴۵

دار المصنفین اعظم گڑھ
۲۱ر جولائی ۱۹۲۷ء

مکرم! السلام علیکم

میں کل پونے تین مہینوں کی گرمائی تعطیل ایک گاؤں میں بسر کر کے اعظم گڑھ واپس آیا ہوں۔ الحمد للہ بخیریت ہوں۔

دمے کہ می گزرد بس غنیمت است

مبارز الدین صاحب، کا مضمون ایک ہی نمبر میں تھا۔ آپ اس کا انگریزی ترجمہ شائع کر سکتے ہیں۔

آپ کا اسلام[عه] مفید ثابت ہو رہا ہے۔ مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں سلام مسنون پہنچا دیجیے۔ میں نے ان کے پاس ان کے حواشی قرآن پاک کے اخیر پر ایک مضمون دیباچے کے طور پر لکھ کر بھیجا تھا۔ جس کو کسی سبب سے مولانا نے شائع نہیں کیا۔ اگر وہ مضمون مولانا میرے پاس واپس فرما دیتے تو میرے کام آتا۔ آپ اس کا انگریزی ترجمہ بھی چھاپ سکتے ہیں۔ والسلام

سید سلیمان

مضمون نگار کا پتا یہ ہے:

سید مبارز الدین صاحب۔ قاضی پورہ ۶۲۸۹
حیدر آباد (دکن)

㊱

دار المصنفین اعظم گڑھ
۲۶ر دسمبر ۱۹۳۸ء

محترم! السلام علیکم

ہاں صاحب! مدت کے بعد آپ نے یاد فرمایا۔ آپ نے میرے لاہور آنے کی خبر پاکر خط تو لکھا۔ مگر یہ نہیں لکھا کہ "آپ میرے یہاں ٹھہریں"۔ اس لیے میں نے لاہور کا سفر ملتوی کر دیا۔ سکریٹری صاحب نے میرے شکوک الفاظ کو یقین سمجھ کر اپنے پروگرام میں نام شائع کر دیا۔ اس پر بھی میں آمادہ تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ مجھے ۱۹ر دسمبر کو پٹنہ کا سفر رات کو کرنا پڑا، راستہ ہی میں زکام اور کھانسی اور گلے میں خراش ہو گیا۔ چوں کہ دو سال پہلے اسی تمہید کے بعد میں ذات الجنب میں مبتلا ہوا تھا اس لیے ہمت نہ پڑی اور سفر ملتوی کر دیا۔ اور میں دلی بھی نہیں گیا۔ اب تک طبیعت صاف نہیں، میری صحت اب جاڑوں میں بڑے سفر کے لائق نہیں رہی۔

الفاروق صفحہ ۲۰۸ جاپان کے قتل کا واقعہ صحیح ہے طبری صفحہ ۲۱۶۶ یورپ البتہ اس کے قتل کی عبارت غلط اور مبہم ہے۔ یعنی "عین معرکہ میں گرفتار ہو گئے"۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ جوشن شاہ اور مردان شاہ گرفتار ہو گئے۔ حالاں کہ گرفتار ہوئے جاپان اور مردان شاہ، مردان شاہ

[عه] انجمن خدام الدین کا دینی پندرہ روزہ انگریزی رسالہ جو مکتوب الیہ (خواجہ صاحب مرحوم) کی ادارت میں جاری تھا

کے قتل کو بدقسمتی اس لیے کہہ دیا کہ اس کو اسلام لاتے یا کوئی اور مفید کام اس سے لینے کا موقع مسلمانوں کو نہیں ملا۔ بہرحال یہ تاویل ہے۔ صفحہ ۷۵ پر جو عبارت ہے جس میں حرکت کا لفظ ہے مولانا حمید الدین صاحب کو بھی یہ لفظ کھٹکتا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عزت و حرمت کے مقابلے میں حضرت عمرؓ کے اس فعل پر ”حرکت“ کا اطلاق کر دیا۔ معافی کے قابل ہے۔

مولانا کی خدمت میں سلام محبت۔ غالباً ہمارے حلقے میں مولانا عبیداللہ صاحب[عـ] کی تشریف آوری سے نئی روح پیدا ہو۔

بھائی میرا مضمون قرآن (کے متعلق) بھیج دو تو میں کوئی کام لوں۔ والسلام

سید سلیمان

(۲۷)

دارالمصنفین اعظم گڑھ
۲ر جنوری ۱۹۳۹ء

مکرم! السلام علیکم

میرے ”لطیف سوال“ کا ”دلچسپ جواب“ موصول ہوا۔ مگر اگلوں کا طریقہ یہ تھا کہ ”طاقت مہمان نداشتی خانہ بہ مہمان گزاشتی“ اب اس زمانے میں یہ اصول چنداں مفید نہیں۔ انشاء اللہ ۱۹۳۹ء راست آئے۔ اور آپ ”صاحبِ خانہ“ ہو جائیں۔

مضمون مرسلہ پہنچا شکریہ۔

ہاں صاحب! اگلے سال ادارہ[عہ] کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی ہے۔ آپ کو ابھی سے دعوت ہے۔ والسلام

سید سلیمان

[عـ] مولانا عبیداللہ صاحب سندھی مرحوم کی طرف اشارہ ہے جو تقریباً چوبیس سال کی جلاوطنی کے بعد مارچ ۱۹۳۹ء میں سندھ کے وزیر اعلیٰ اللہ بخش سومرو شہید کی حکومت کے زمانے میں ہندوستان لوٹے تھے۔

۳۸

دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۹؍ مارچ ۱۹۳۹ء

مکرم: السلام علیکم

"وعدہ" ابھی سے یاد رہے۔ ایسا نہ ہو کہ وقت پر مکر جائیں۔ سیرت النبیؐ کے مقدمہ کا ترجمہ اگر بن پڑے ضرور شائع کیجیے۔ پوری اجازت ہے۔ ابھی آپ کے اس خط سے پہلے سیرت کامل کے بنگالی ترجمہ کی اجازت دی ہے۔ خدا توفیق بخشے۔

سیرۃ کی چھٹی جلد بحمداللہ چھپ کر تیار ہوگئی مجھے اس دفعہ اس کتاب کے متعلق اہل علم اور علمائے کرام کی آراء کی ضرورت ہے۔ جناب مولانا احمد علی کی خدمت میں بھیجوں گا کہ وہ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ اگر جناب مولانا عبیداللہ صاحب لاہور میں تشریف رکھتے ہوں تو میری طرف سے سلام مسنون عرض کر دیجیے۔ والسلام

سید سلیمان

۳۹

دارالمصنفین اعظم گڑھ
۲۵؍ اپریل ۱۹۳۹ء

مکرم: السلام علیکم

اخبار ملا۔ مضمون دیکھا۔ مجھ میں انگریزی کی اتنی صلاحیت کہاں کہ خردہ گیری کروں۔ آپ نے جو کچھ کیا ہوگا اچھا ہی کیا ہوگا۔ امید کہ بخیر ہوں گے۔ والسلام

سید سلیمان

۴۰

دارالمصنفین اعظم گڑھ
۴؍ مارچ ۱۹۴۰ء

مکرمی: السلام علیکم

عنایت نامہ مورخہ ۲۲؍ جنوری سفر کی حالت میں ملا، دارالمصنفین اب ایسے مقام میں ہے جہاں انگریزی ٹائپ نہیں۔ اور نہ انگریزی کا اچھا مطبع ہے۔ اس لیے عرض ہے کہ آپ لاہور میں مقدمہ سیرت کے انگریزی ترجمہ کی چھپائی کا تخمینہ بنوا کر بھجوا دیجیے۔ وہاں آپ تصحیح بھی کر سکیں گے۔

میں پرسوں انشاءاللہ یہاں سے پشاور کے ارادے سے نکلنے والا ہوں۔ ۸؍ کی صبح کو میل سے لاہور پہنچوں گا اور اسی وقت فرنٹیر میل سے پشاور جاؤں گا۔ واپسی میں شاید ٹھہروں کیوں کہ بہاول پور کا قصد ہے۔

کیا میں یہ امید رکھوں کہ آپ ۸؍ کی صبح کو اسٹیشن پر ملیں گے؟ میل اور ایکسپریس دونوں میں دیکھیے گا۔ میرے پاس یہاں نیا ٹائم ٹیبل نہیں۔ لکھنؤ سے روانہ ہوں گا۔ والسلام

سید سلیمان

(۴۱)

دارالمصنفین اعظم گڑھ
۱۶؍ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

مکرم! اسعدکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم، شرمندہ ہوں کہ واپسی کے بعد آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ آنے کے ساتھ ہی ہنوز راستہ کا تکان بھی دور نہیں ہوا تھا کہ مسلسل کاموں میں مبتلا ہو گیا۔ آپ نے یہ خوشخبری سنی ہو گی کہ مولانا شبلی نے سنہ ۱۸۸۴ء میں جو نیشنل اسکول قائم کیا تھا اور جو ان کی وفات کے بعد شبلی اسکول کے نام سے مشہور ہوا اب سنہ ۱۹۴۰ء میں وہ انٹر کالج ہو گیا۔ اس کی رسمِ افتتاح مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی ادا کرنے آئے تھے، پرسوں چوتھے روز واپس گئے۔

ممنون ہوں کہ آپ نے مسافر نوازی فرمائی، اور آپ کے بدولت بہت سے بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا موقع ملا۔ جی چاہتا ہے کہ اس طرح میں بار بار آپ کو تکلیف دیا کروں، مگر از ضعف بہر جا کہ نشستم نشستم۔

تخمینہ ملا، مگر اس میں یہ نہیں لکھا ہے کہ کتنی تعداد طبع پر یہ لاگت ہے؟ مہربانی فرما کر اس کی تصریح فرمائیے۔

مولانا احمد علی کی خدمت میں سلامِ شوق۔ والسلام

سید سلیمان

(۴۲)

دارالمصنفین اعظم گڑھ
۹؍ مئی سنہ ۱۹۴۱ء

محب محترم! دام لطفہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، نادم ہوں کہ اب تک آپ کو خط نہ لکھ سکا، اور نہ آپ کے

عنایات کا شکریہ ادا کر سکا۔ میں علی گڑھ ہو کر جس دن یہاں پہنچا، اس کے دوسرے ہی دن میری یک سالہ بچی جس کے اضطراب میں میں جلد چلا آیا تھا اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ گویا اس کو میری ہی آخری ملاقات کا انتظار تھا۔ خیال ہوا کہ بیوی کی تغیر ماحول کے لیے وطن کا سفر کروں۔ یکم مئی کی تاریخ روانگی کی تھی کہ ۲۹ اپریل ہی کو وطن کے عزیز کا تار آیا کہ سفر ملتوی کر دوں۔ بہار اور اس کے اطراف کے دیہات میں قتل و خون برپا ہے۔ سفر ملتوی کیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت یہ تھی کہ اسی رات کو مجھے دوران سر کا ایسا شدید عارضہ لاحق ہوا کہ تکیہ سے سر اٹھانا محال ہو گیا۔ بارے چند روز میں افاقہ ہوا۔ مگر دماغ میں ابھی تک یہ کیفیت ہے۔ سر ہلتا ہے۔ بس ایک کارڈ صوفی صاحب[۱۲] کو لکھ سکا اور بس۔ خدا فضل فرمائے۔

سیرت کے انگریزی ترجمہ کی نسبت مفصل گفتگو زبانی نہ ہو سکی بہر حال یہ تو طے ہے کہ دیباچہ ایک ہزار کی تعداد میں چھپنے کو دے دیں۔ اور جو کچھ مصارف کا بل ہو وہ دفتر سیرت میں بھیجیں۔ اب انتظار کی ضرورت نہیں۔

اثنائے قیام لاہور میں آپ اور آپ کے احباب کی محبت بے حساب کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں آپ کی خاموش عنایات آپ کے احباب کا سب سے بڑا توشہ ہے۔

آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ خلفائے راشدین کے جوان مصنف حاجی معین الدین ندوی (پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ و سابق کیٹلاگر بوہار لائبریری) چل بسے! والسلام

سید سلیمان

آپ کے گھر کا پتا نہیں معلوم۔

(۴۲)

دار المصنفین اعظم گڑھ

۲۰ر مئی ۱۹۴۱ء

مکرم! السلام علیکم

میں بحمد اللہ اس وقت اچھا ہوں۔ آپ کی محبت و بندہ نوازی کے اثر سے میرا دل معمور ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی مزید نوازشوں سے سرفراز فرمائے۔

موجودہ دیباچہ سیرت جب تک چھپے گا کیا آپ مزید پچاس اوراق یا صفحات کا ترجمہ پورا نہ کر لیں گے۔ ظاہر ہے کہ میرا مقصد اس پورے دیباچے سے ہے، جہاں تک میں نے آپ کو نشان دے کر بتایا تھا۔

جی چاہتا ہے کہ کبھی لاہور جی بھر کر رہوں اور احباب کی خدمت کر سکوں یعنی قرآن پاک کا درس اپنے مذاق کے مطابق کچھ دن دے سکوں، مگر نفسِ آمارہ مہلت نہیں لینے دیتا۔

مرا اگر تو بگذاری اے نفسِ طامع
بسے بادشاہی کنم در گدائی ـــ!

ہاں جناب ندوہ کی ماہوار، سالانہ امداد کا وعدہ احباب کو یاد دلایئے۔ ناظم معین الندوہ خود لاہور پہنچ گئے۔ میں آج ایک ماہ کے لیے وطن جا رہا ہوں۔ وہاں کا پتا یہ ہے:

دیسنہ۔ ضلع پٹنہ والسلام

سید سلیمان

(۴۴)

دارالمصنفین اعظم گڑھ
۲۶ر نومبر ۱۹۴۱ء

محبِ مکرم! السلام علیکم

آپ کی آمدِ بہار ان شاء اللہ موجب انبساط! اللہ کرے آپ علی گڑھ کے محشرستان میں اپنا صور پھونک کر مردوں کو نشاتِ ثانیہ بخشیں۔

جواب میں دیر ہوئی میں الہ آباد تھا۔

آپ ۳ر کو وہاں سے روانہ ہو کر ایک دو روز کے لیے لکھنؤ آئیں گے۔ خیر مقدم بہتر یہ ہے کہ آپ علی گڑھ ایک دن اور رہیں اور میں ۵ر دسمبر کی صبح کو چل کر شام کو لکھنؤ پہنچوں اور لطفِ ملاقات حاصل کروں۔ مجھے ۸ر کو علی گڑھ جانا ہے۔

میں نے مہتمم دارالعلوم مولوی عمران خان صاحب کو لکھنؤ لکھ دیا ہے آپ لکھنؤ میں ندوہ کے مہمان خانہ میں ٹھہریں۔ اگر آپ انہیں وقت اور تاریخ دے دیں تو اچھا ہے۔

میں نے "رحمت عالم" کی سو جلدیں مولوی محمد حنیف صاحب ندوی کو بھیجی تھیں۔ ندوہ روپیہ بھیجتے ہیں نہ جواب دیتے ہیں۔ کیا مایوس ہو جانا چاہیے۔ والسلام

سید سلیمان

(۴۵)

دارالمصنفین اعظم گڑھ
۸ر مارچ ۱۳۶۵ھ

مکرم! السلام علیکم

ایک مدت کے بعد آپ نے یاد فرمایا۔ میں ادھر دو تین برس سے ایک سخت درد سینہ کی تکلیف میں مبتلا تھا جس کا شدید حملہ گزشتہ رمضان مبارک میں ہوا جس سے شفایاب ہونے کے بعد بحمداللہ کہ اصل مرض بھی بفضلہٖ تعالیٰ دور ہوگیا۔ اس کے بعد کئی ماہ حسب تجویزِ اطبا استراحت میں رہا اور اس کے لیے میرٹھ کا مقام پسند آیا جہاں میرے عزیز دادر برسرِ کار ہیں۔ اب واپس آیا ہوں لیکن جلد ہی گرمیوں میں وطن یعنی بہار کا قصد ہے جہاں سے جولائی میں انشاءاللہ واپسی ہوگی۔

ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت حضرت کے والد ماجد کی مختلف روایات سیرۃ ابن ہشام میں ہیں مشہور یہی ہے کہ ان کی وفات کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہنوز شکم مادر میں تھے چوں کہ بحیثیت سیرۃ کی کتاب کے یہ کتاب زیادہ تر مشہور ہے۔ اس لیے زبانوں پر یہی روایت ہے۔ مگر دوسری روایتیں بھی کتابوں میں موجود ہیں جن کے ماخذ میں سے وہ ہے جس کو مولانا شبلیؒ نے بداء الاسلام میں اختیار کیا تھا۔

امام سہیلی سیرۃ ابن ہشام کی شرح میں لکھتے ہیں:

”وذکر انہ مات ابوہ وھو حمل واکثر العلماء انہ فی المھد ذکرہ الدولابی وغیرہ وقیل ابن شھرین ذکرہ ابن ابی خیثمہ، وقیل اکثر من ذلک وقیل مات ابوہ وھو ابن ثمان وعشرین شھراً“ (روض الانف سہیلی صفحہ ۱۰۷)

ترجمہ (ابن ہشام کا بیان ہے کہ آپ حمل ہی میں تھے کہ آپ کے والد نے وفات پائی۔ اور اکثر علما اس پر متفق ہیں کہ آپ اپنے والد کی وفات کے وقت گہوارے میں تھے۔ اس کو محدث دولابی وغیرہ نے بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ آپ دو مہینہ کے تھے اس کا ذکر محدث ابن ابی خیثمہ نے کیا ہے ---- اور یہ بھی کہا ہے کہ آپ اس وقت اٹھائیس مہینہ کے تھے۔)

حافظ زرقانی مواہب لدنیہ کی شرح میں اس مسئلے کی حسب ذیل تحقیق کرتے ہیں:

”اور جب حضرت پر حمل کے دو مہینے گزرے اور یہ بھی کہا گیا ہے مدالش کو دو

ماہ باقی تھے تو آپ کے والد نے وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر پچیس برس کی تھی جیسا کہ واقدی کا بیان ہے ـــــــ یا تیس برس کے تھے جیسا کہ ابو احمد حاکم نے کہا ہے یا اٹھائیس برس کے تھے۔ اور اسی کو حافظ مغلطائی اور حافظ ابن حجر نے صحیح کہا ہے۔ اور اسی کو حافظ سیوطی نے پسند کیا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ آپ اپنے والد کی وفات کے وقت گہوارۂ طفولیت میں تھے۔ سہیلی نے کہا ہے کہ یہی اکثر علما کا قول ہے محدث، دولابی نے اسی کو کہا ہے۔ ... اب تو اس قول کے بعد کہ آپ اپنے والد کی وفات کے وقت گہوارے میں تھے اس میں اختلاف ہے کہ اس وقت آپ کی کیا عمر تھی۔ محدث ابن ابی خیثمہ کی روایت ہے کہ دو ماہ کے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ۷ ماہ کے تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ۲۸ ماہ کے تھے۔ لیکن راجح اور مشہور قول یہ ہے کہ جیسا کہ امام نووی نے کہا ہے اور واقدی اور ابن سعد اور بلاذری اور ذہبی نے اسی کو راجح کہا ہے کہ آپ اپنے والد کی وفات کے وقت ابھی تک شکم مادر ہی میں تھے اور اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو حاکم نے روایت کیا ہے، اور جس کو حاکم نے صحیح مسلم کی شرط کے مطابق کہا۔ اور امام ذہبی نے بھی اسے تسلیم کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد نے وفات پائی اور آپ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھے۔" (جلد اول صفحہ ۱۳۲، ۱۳۳)۔

قیس بن مخرمہ صحابی آپ کے خاندان کے تھے اور بالکل ہم عمر تھے یعنی اسی سال پیدا ہوئے جس سال آپ پیدا ہوئے۔ (مستدرک حاکم ج ۲ صفحہ ۶۰۴ حیدر آباد دکن) اس لیے یہی روایت صحیح ہے اور یہی علما میں معتبر اور مسلمانوں میں مشہور ہے حاکم کی یہ حدیث مستدرک (ج ۲ صفحہ ۶۰۵) میں ان لفظوں کے ساتھ ہے (توفی ابوہ وامہ حبلی بہ ھذا حدیث صحیح علی شرط مسلم)۔ آپ اس رسالے پر یہ حاشیہ لکھ دیں کہ ایک روایت یہ بھی ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ ولادت سے پہلے ہی آپ کے والد کی وفات ہو چکی تھی جیسا کہ مصنف نے اپنی بعد کی تصنیف میں اختیار کیا ہے۔

انجمن خدام الدین نے جس ترجمہ قرآن کا اہتمام کیا ہے اس میں آپ میرا نام کس حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں جب کہ میں انگریزی ایسی نہیں جانتا جو اس میں کام آئے۔ پھر معاملہ حواشی کا مشکل ہے حضرت مولانا کے جو حواشی اردو میں ہیں انگریزی میں ہوں گے تو مجھے اس سے اختلاف ہے اگر کوئی اور صورت ہے تو مطلع فرمایا جائے۔

ہاں خوب یاد آیا گزشتہ رمضان المبارک میں حضرت مولاناؒ سے میری مکاتبت حواشی تفسیری ترجمۂ قرآن مرتبۂ حضرت مولانا کی نسبت رہی۔ حضرت مولانا نے یہ پسند فرمایا کہ میں اپنے مشورے پیش کروں ایک دو پاروں کا کام کیا تھا کہ میں بیمار پڑ گیا اور پھر اس کے بعد اب اس قابل ہوا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں وہ تحریریں حضرت تک پہنچیں یا نہیں۔ اور انھوں نے اس سے اتفاق کیا یا اختلاف کیا اور اب آیندہ مزید لکھنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر ایسے عنوان سے جس میں مولانا کو ناگواری نہ ہو آپ استفسار کر کے مطلع کریں تو بڑی مہربانی ہو۔ میں خود شرمندہ ہوں کہ اتنے دنوں خاموش رہا۔ لاہور آنے کو تو بہت جی چاہتا ہے لوگ جلسے جلسوں میں بلاتے ہیں اور اب اس سے طبیعت سیر ہو چکی ہے اور اب نہ صحت ایسی ہے اور نہ قوتِ تقریر رہی ہے۔

والسلام

سید سلیمان

حواشی

[1] یہ مولانا مرحوم کا میرے نام پہلا خط ہے۔ مرحوم انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لا رہے تھے۔ میں نے انھیں لکھا کہ میں آپ کی ملاقات کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں اس لیے ملاقات کا وقت پہلے سے مقرر فرما دیں۔ لیکن میرا خط ملنے سے پہلے وہ لاہور کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ میں نے لاہور میں ان سے ملاقات کر لی۔ واپسی پر جب انھیں میرا خط ملا تو انھوں نے یہ جواب دیا۔

[2] ۱۹۲۸ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تھا۔ میں نے اس کے شعبہ عربی و اسلامیات میں علامہ سر محمد اقبال کے زیرِ صدارت ایک انگریزی مقالہ بعنوان "قرآن اور سائنس" پڑھا تھا۔ اس خط میں اسی مقالے کا ذکر ہے۔ بعد میں اس مقالے کا اردو ترجمہ معارف کے جنوری و فروری ۱۹۳۰ء کے پرچوں میں شائع ہوا تھا۔

[3] مرحوم انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے تشریف لانے والے تھے۔ اس سے پیشتر ۱۹۳۶ء جب وہ ادارہ معارف اسلامیہ کے جلسے میں تشریف لائے تھے تو وہ مع اپنے رفقاء کے میرے ہاں مہمان ہوئے تھے اور اس کے بعد جب

کبھی لاہور آئے تو میرے ہاں ہی فروکش ہوئے۔ اس مرتبہ میں نے انھیں اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت ارادۃً نہ دی تھی۔ اس لیے کہ اب جس مکان میں میں رہتا تھا وہ تنگ تھا اور اس میں مہمانوں کے ٹھہرنے کی جگہ نہ تھی۔ چناں چہ اس خط کے جواب میں میں نے انھیں یہی لکھ دیا۔ جس پر ان کا وہ خط آیا جو اوپر درج ہے۔

۴؎ اس زمانے میں ”الفاروق“ کا انگریزی ترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم مدیر زمیندار کا کیا ہوا شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور کے ہاں سے شائع ہونے والا تھا اور میں اس پر نظر ثانی کر رہا تھا۔ اس موقع پر حضرت مولانا شبلی کے ایک سہو پر نظر پڑ گئی تو میں نے سید صاحب مرحوم سے اس کے متعلق استفسار کیا تھا۔ جس کے جواب میں یہ خط آیا۔

۵؎ مراد ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور سے ہے۔

۶؎ یہ وعدہ ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے مجوزہ اجلاس لکھنؤ میں شرکت کے لیے تھا۔

۷؎ لاہور سے انجمن خدام الدین کے زیر اہتمام ایک پندرہ روزہ انگریزی رسالہ ”اسلام“ نکلتا تھا۔ جس میں میں نے سیرۃ النبی کا انگریزی ترجمہ شائع کرنا چاہا تھا۔ یہ اجازت اسی کے لیے تھی۔ ”اسلام“ میں سیرۃ کے مقدمہ کا مکمل ترجمہ بالاقساط چھپ گیا تھا۔

۸؎ میں نے مولانا مرحوم سے عرض کیا تھا کہ مقدمہ ”سیرۃ“ کا انگریزی ترجمہ ”اسلام“ میں مکمل چھپ چکا ہے اب مناسب ہوگا کہ دارالمصنفین اس کو کتابی صورت میں چھاپ دے۔ یہ اسی کا جواب ہے۔

۹؎ مولانا صدر یار جنگ بہادر مرحوم۔

۱۰؎ پشاور اور بہاولپور کے سفر میں مولانا لاہور بھی تشریف لائے تھے۔ اور حسب دستور میرے ہاں ہی فروکش ہوئے تھے۔

۱۱؎ یہ تخمینہ مقدمہ ”سیرۃ“ کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت کا تھا۔

۱۲؎ مراد صوفی غلام مصطفےٰ تبسم سے ہے۔

۱۳؎ میں علی گڑھ یونیورسٹی کی مجلس اسلامیات میں کرمی ڈاکٹر افضال حسین قادری (حال پروفیسر کراچی یونیورسٹی) کی دعوت پر ایک انگریزی مقالہ ”جدید سائنس کا اسلامی پس منظر“ پڑھنے جا رہا تھا۔ وہاں سے لکھنؤ جانے کا ارادہ تھا۔ اس کی اطلاع میں نے مولانا مرحوم کو دی تھی۔ اس خط میں اسی کا ذکر ہے۔

[۱۲] یہ میرے نام مولانا مرحوم کا آخری خط ہے۔

[۱۳] مولانا شبلیؒ کا مشہور عربی رسالہ۔ اس کا اردو ترجمہ دیکھتے وقت میں نے مولانا مرحوم کو لکھا تھا کہ علامہ شبلی نے یہ کیسے لکھ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد محترم کی وفات آپؐ کی پیدائش کے بعد ہوئی تھی۔ یہ اسی کا جواب ہے۔ میرا ارادہ مولانا شبلیؒ کے رسالہ کا انگریزی ترجمہ کرنے کا تھا۔

[۱۴] انجمن خدام الدین لاہور نے قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور یہ کام میرے سپرد کیا گیا تھا۔ تجویز تھی کہ میں جو کام کروں علامہ مرحوم اس پر نظر ثانی فرمائیں۔

[۱۵] مراد حضرت الحاج مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور سے ہے۔

سید الملت کا ماتم

سید سلیمان ندوی مرحوم کے انتقال پر اخبارات و رسائل نے تعزیتی اداریے لکھے، علمی و دینی اور تعلیمی اداروں نے تعزیت کے جلسے کیے اور قراردادیں پاس کیں۔ بہت سے لوگوں نے مرحوم کی بیوہ، بیٹے، بھتیجے اور داماد سے مل کر اور خطوط کے ذریعے تعزیت کی، بہت سوں نے رفقائے دارالمصنفین اعظم گڑھ اور مرحوم کے دوست، مولانا عبدالماجد دریابادی سے تعزیت کی۔ مولانا دریابادی کے نام تعزیت کے جو خطوط پہنچے انھوں نے صدق جدید میں "سید الملت کا ماتم" کے عنوان سے ایک کالم ۱۱ دسمبر ۱۹۵۳ء سے قائم کر دیا تھا جو ۲۶ فروری ۱۹۵۴ء تک ضرور قائم رہا لیکن ہے اس کے بعد بھی یہ سلسلہ بڑھا ہو جو خاکسار کی نظر سے نہیں گزرا۔ اسی سلسلے میں سید صاحب مرحوم کے مکتوب الیہ خواجہ عبدالوحید نے بھی مولانا دریابادی سے تعزیت کی تھی۔ مولانا نے یہ تعزیت نامہ صدق جدید کے ۱۹ فروری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں چھاپ دیا تھا۔

مناسب معلوم ہوا کہ مکتوب نگار کے بارے میں مکتوب الیہ کے یہ تاثرات بھی اس مقام پر شامل کر دیے جائیں۔ (مرتب)

"پاکستان کے ممتاز انگریزی اہل قلم خواجہ عبدالوحید لاہوری ثم کراچوی کے قلم سے:

"حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات، حسرت آیات نے جس قدر نقصان

پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کو پہنچایا اس سے کچھ کم نقصان دنیاے اسلام کو نہیں پہنچایا۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کی بدبختی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر وہ بلند پایہ شخصیت جو ہم میں سے اٹھ جاتی ہے اس کی جگہ لینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ نہ معلوم سید صاحب مرحوم و مغفور کا نعم البدل اس برصغیر میں کب پیدا ہوگا۔

سید صاحب میرے بہت قریبی ہمسایہ تھے۔ میرے اور ان کے مکانوں کا درمیانی فاصلہ دو تین سو گز سے زیادہ نہیں۔ جب سے وہ پاکستان تشریف لائے تھے۔ ان سے وقتاً فوقتاً ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ دوران قیام پاکستان میں دو بار ان کو میرے ہاں دعوتِ طعام میں شامل ہونے کا موقع ہوا۔ اور ان موقعوں پر ان کے علاوہ اور بزرگان دین بھی موجود تھے جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا احمد علی صاحب وغیرہ۔ ان مجلسوں کی یاد ہمیشہ قلب پر قائم رہے گی۔ اول مرتبہ تو سید صاحب تندرست تھے۔ انھوں نے گفتگو میں بھی خوب حصہ لیا۔ اور کھانے پینے میں بھی مگر دوسری مرتبہ ان کی صحت جواب دے چکی تھی اور وہ دسترخوان پر رکھی ہوئی کوئی چیز نہ کھا سکے اس لیے کہ اس وقت ان کے لیے نمک کا استعمال ممنوع ہو چکا تھا۔ اس لیے اسی وقت ان کے لیے بازار سے آسٹریلیا کا شہد منگوایا اور اسی سے لگا لگا کر انھوں نے چپاتی کھائی کیا معلوم تھا کہ اب اس سے بھی محرومی ہونے والی ہے،

ان دونوں دعوتوں کے درمیانی عرصے میں ایک بار میں نے ایک بزرگ سے یہ شکوہ کیا کہ سید صاحب میرے ہاں تشریف نہیں لاتے۔ انھوں نے خود سید صاحب سے میری موجودگی میں یہ بات کہہ دی۔ مرحوم کی بذلہ سنجی فی الفور کارفرما ہوئی۔ فرمانے لگے۔ خواجہ صاحب نے کب دعوت کی جو میں آتا! یہ جملہ ان کا اب تک کانوں میں گونج رہا ہے۔

آپ حضرات کو مدت العمر کے رفیق کی رفاقت سے جو محرومی ہوئی وہ ناقابل برداشت ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کن الفاظ سے آپ لوگوں کے دلوں کو ڈھارس دلاؤں۔ یہ اسی مقلب القلوب کے قبضۂ قدرت میں ہے کہ وہ آپ کے زخمی دلوں کے اندمال کا سامان بہم پہنچائے۔

رب العلمین مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

ہمایوں مرزا بیرسٹر؛

(۴۶)

محترم دام السامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

حضرت شادؔ[۱] مرحوم کی وفات کا سانحہ گو غیر متوقع نہ تھا۔ مگر دل نہیں چاہتا تھا کہ مرحوم کبھی ہم سے جدا ہوں۔ حضرت فریادؔ کی سوانح عمری[۲] کی طباعت کے متعلق شادؔ مرحوم کا بھی ایک والا نامہ آیا تھا۔ اس کا جواب دیا گیا تھا۔ پھر سے کوئی اطلاع نہ آئی۔ شاید یہی علالت کا تسلسل اس کا باعث ہو۔

بہرحال آپ کے والا نامے نے عزت بخشی اور بہت سے دل پر اثر کرنے والے واقعات سے واقفیت ہوئی۔ آپ مسودہ پر میری نظر ثانی اگر ضروری سمجھیں تو نہایت خوشی سے میں اس کے لیے وقت نکالوں گا۔ مگر مناسب یہ ہے کہ کسی کاتب سے مسودہ صاف کرا لیا جائے تاکہ دیکھنے میں آسانی ہو اور اغلاط کم ہوں۔

مطبع کا نرخ طبع مرسل ہے ہمارے مہتمم مطبع کا بیان ہے کہ کاغذ کی قیمت اور حساب میں آپ سے غلطی ہوئی ہے۔ بقیہ حساب ٹھیک ہے۔ اب آپ جب چاہیں مسودہ اور پیشگی بھیج دیں۔ انشاء اللہ باہتمام اور توجہ سے چھاپی جائے گی۔ تخمینہ کے وقت سائز، ہر صفحہ کی سطروں کی تعداد اور نسخوں کی تعداد بھی لکھیے گا۔ میرے خیال میں ۲۰×۲۶ کا کتابی سائز جو عموماً رائج ہے مناسب ہو گا۔ ہر صفحہ میں ۱۷ یا ۱۹ سطریں ہوں۔ اور ۵۰۰ کاپیاں کافی ہوں گی۔

آئندہ اگر آپ حساب طبع وارسال زر وغیرہ کے متعلق منیجر صاحب دار المصنفین کے نام سے خط لکھیں گے تو آپ کو جوابات جلد ملتے رہیں گے۔ والسلام

سید سلیمان
۱۶؍ اکتوبر ۱۹۲۷ء

---

[۱] میر علی محمد شادؔ عظیم آبادی نے ۸۲ سال کی عمر میں ۸؍ جنوری ۱۹۲۷ء کو انتقال کیا تھا۔

[۲] ”حیاتِ فریاد“ کے نام سے شادؔ مرحوم نے اپنے استاد الفت حسین فریادؔ کی سوانح عمری لکھی تھی۔ فریادؔ مکتوب الیہ ہمایوں مرزا بیرسٹر کے والد تھے۔ اب ”حیاتِ فریادؔ“ کی اشاعت کا معاملہ درپیش تھا۔

صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ:

(۴۷)

۱۔ عقد بیوگان کا کام الحمد للہ رواج پذیر ہو رہا ہے اور میرا تو اس پر ذاتی عمل ہے۔ پنجاب، صوبہ متحدہ، دہلی اور جو کہ صوبہ بہار میں بھی شرفا کے خاندانوں میں اس کا رواج ہو رہا ہے اس کے لیے رسمی کمیٹی کی چنداں ضرورت نہیں۔ علما اور نیک خیال اصحاب اس کام کو پھیلا رہے ہیں۔

۲۔ موجودہ سخت پردے کے بجائے اسلامی پردہ کا رواج بہت بہتر ہے۔ بشرطیکہ اسلامی پردہ پر صحیح طور سے عمل کیا جائے۔ ہمارے ہاں گھروں میں جس سے پردہ ہے تو اس قدر سخت کہ قد و قامت اور آواز کا بھی پردہ ہے اور جس سے علاوہ محرم کے پردہ نہیں اُس سے سر و دوش کا بھی پردہ نہیں۔ عورت کا تمام جسم چہرہ اور ہاتھوں کے سوا سب ستر ہے۔ کسی عورت کا اس ستر کے ساتھ کسی غیر محرم کے سامنے آنا گناہ نہیں۔ اسلامی حدود پردہ پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی ضرورت ہے۔

۳۔ فضول رسوم اور ہندوانی طریقوں کو یقیناً چھوڑ دینا چاہیے۔

۴۔ یقیناً عورتوں کی تعلیم مردوں کی طرح ضروری ہے مگر عورتوں کے لیے نصاب تعلیم مردانہ اسکولوں اور کالجوں سے الگ ہونا چاہیے۔ جو عورتوں کے حالات اور ضروریات کے مطابق ہو۔

سید سلیمان ندوی

۲۲، اکتوبر سنہ ۱۹۲۷ء

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی (لاہور)

ڈاکٹر چغتائی مرحوم نے اپنے نام حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کے تمام خطوط مرتب و مدوّن کرکے سہ ماہی اردو ادب، (علی گڑھ) کے شمارۂ دسمبر ۱۹۶۰ء میں چھپوا دیے تھے ان کے خطوط کے آغاز میں انھوں تے ایک مقدمہ اور خطوط کے بعض اشارات کی وضاحت میں حواشی بھی تحریر کیے تھے۔ خطوط کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقدمہ اور حواشی من و عن شائع کردیے ہیں۔ اگر کسی مقام پر مزید حاشیے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو وہاں حاشیے کے ساتھ حاشیہ نگار کا اشارہ موجود ہے۔ (ا۔ س۔ ش)

مقدمہ:

میری زندگی میں کچھ لمحات ایسے بھی گزرے ہیں کہ چند ملنے والے، جن سے علمی یا دوستانہ مراسم تھے جب اس دارِ فانی سے اپنی مستعار زندگی کے ایام و مراحل طے کرکے اعلی العلّیین سے جا ملے تو میرے لیے ایک معمہ سا بن گیا کہ اب ان مرحومین سے متعلق اپنے ذاتی غم و اندوہ اور ان کے خلا کے تاثرات کا جو ان سے تعلقات کی نوعیت کے اعتبار سے بہ طور احساس ہی رہ گئے ہیں، کیسے اظہار کروں جب کہ خموشی سے وہ اپنا کام ضرور طبیعت پر ان کی یاد میں کرتے رہتے ہیں ؎

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

چناں چہ ان تعلقات و جذبات کے احساسات کے اظہار کی خاطر بالخصوص جو قبلہ سید سلیمان ندویؒ سے باہمی علمی استفادہ کے طور پر تھے ان کے چند خطوط کو یہاں مع مختصر مگر ضروری حواشی کے جن کے بغیر ان کا پورے طور پر سمجھنا کسی قدر دشوار امر ہوگا شائع کرکے ایک طرح ان احساسات کا اظہار کرنا ہے۔

راقم کا نظریہ ہے کہ خطوط میں انسان اپنے مافی الضمیر کو بلاتامل فوراً بغیر کسی تصنع کے اپنے مکتوب الیہ سے بیان کردیتا ہے جس کے عام طور پر اظہار کا کبھی موقع نہیں آتا اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑی بڑی ہستیوں کے خطوط نے ہی ان کی حیات کی بعض گم شدہ کڑیوں کو پورا کرنے میں مدد دی ہے۔ ان خطوط کا پس منظر سمجھنے کے لیے یہاں چند سطور میں مرحوم سید صاحب

موصوف کی زندگی کا خاکہ اور ان سے تعلقات کو بہ طور مقدمہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ بروز جمعہ بتاریخ ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۲ر صفر ۱۳۰۲ھ کو موضع دیسنہ (پٹنہ) صوبہ بہار میں پیدا ہوئے آپ کے والد سید ابوالحسن بڑے طبیب تھے۔ آپ زہد و تقویٰ کے مجسمہ تھے شائستگی و نفاست کے نمونہ تھے۔ آپ بہار کے اکثر قدیم طرز کے مدارس سے مستفید ہو کر ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں داخل ہوئے شمس العلما مولانا شبلی مرحوم سے براہ راست مستفید ہوئے اور استاد کے رنگ میں خوب رنگے گئے جہاں سات سال متواتر تعلیم کے بعد فارغ التحصیل ہوئے۔ مضمون نگاری کا شوق ابتداء ہی تھا۔ مگر ندوہ میں آ کر پہلی مرتبہ ۱۹۰۳ء میں مضامین مخزن لاہور جیسے پرچوں میں شائع کیے مولانا شبلی کی خدمت میں ۱۹۰۵ء میں ایک مرتبہ ندوہ میں ایک فارسی قصیدہ پیش کیا یعنی آپ نے ایک خطیبانہ انداز پیدا کیا رسالہ "الندوۃ" کے سب ایڈیٹر ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں ندوہ کے مدرسین میں شامل ہوئے ۱۹۱۱ء میں الہلال ابوالکلام آزاد کی ادارت میں بھی شامل ہوئے[1] مولانا شبلی مرحوم کے ہمراہ سیرۃ النبی کی تالیف میں بھی شرکت کی جو سلسلہ آپ کی وفات تک بھی جاری رہا مگر آپ ۱۹۱۳ء میں دکن کالج پونہ میں بھی پروفیسر ہوئے جہاں آپ کے رفیق کالج پروفیسر خان بہادر شیخ عبدالقادر سرفراز مرحوم بھی تھے اور راقم بھی اس کالج میں ۱۹۲۰ء سے پاکستان ظہور میں آنے تک رہا مگر سید صاحب کو فوراً لکھنؤ واپس آنا پڑا جس کے بعد آپ کا تصنیف و تالیف کا زمانہ شروع ہوا جو متواتر تادم واپسیں قائم رہا ۱۹۲۰ء میں آپ یورپ وفد خلافت کے ہمراہ جو مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں گیا تھا تشریف لے گئے وفد حجاز ۱۹۲۴ء میں آپ حرمین شریفین گئے ۱۹۲۹ء میں آپ کو ہندستانی اکیڈمی الٰہ آباد نے "عرب و ہند کے تعلقات" پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا جو ایک مبسوط بہترین محقق کتاب کی صورت میں طبع ہو چکے ہیں۔ سر اقبال، سید راس مسعود پروفیسر ڈاکٹر ہادی حسن علی گڑھ کے ہمراہ ۱۹۳۳ء

---

[1] الہلال کا پہلا شمارہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا تھا اور دور اول کا خاتمہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کے شمارے پر ہو گیا۔ سید صاحب کا تعلق الہلال سے مئی یا جون ۱۹۱۲ء سے لے کر اکتوبر تک چند مہینوں ہی رہا۔ الہلال سے سید صاحب وابستگی اور علاحدگی کی قطعی تاریخیں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکیں۔ الہلال سے سید صاحب پونا کالج میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے چلے گئے۔ یہ تعلق علامہ شبلی کی وفات تک رہا

میں افغانستان کے سفر پر گئے۔ پاکستان بننے کے بعد آپ جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان میں ہجرت کر کے آئے جہاں آپ ۱۲/ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲/ نومبر ۱۹۵۳ء کو عشا کی نماز کے بعد رحلت کر گئے۔ ؎

"جگہ خالی کرو مداح آتا ہے محمد کا"

علامہ سید سلیمان ندویؒ سے میری پہلی ملاقات لاہور میں مولانا ظفر علی خاں کے مسکن دفتر زمیندار میں اپریل ۱۹۲۷ء میں سر اقبال مرحوم کے توسط سے ہوئی جس کا ذکر آپ کے ہی ایک ذاتی خط یہاں شائع شدہ ص ۱۶ سے واضح ہے جسے راقم نے ایک مستقل مضمون کی صورت میں کہیں الگ بیان کیا ہے آپ اسی زمانہ میں لاہور میں انجمن حمایت الاسلام لاہور کی دعوت پر ایک تقریر کے لیے آئے ہوئے تھے آپ سے علمی مراسم اگرچہ اس سے قبل پیدا ہو چکے تھے اور اسی کی تصدیق مزید عزیز محترم معظم جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی حال پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ کے ایک مضمون سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے بعنوان "مولانا سید سلیمان ندوی میری نظر میں" معارف کے سلیمان نمبر مئی ۱۹۵۵ء میں لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:

> "........ ص ۱۶۴ .... چناں چہ راقم کو یاد ہے کہ ندوۃ العلما کا سالانہ جلسہ (غالباً ۲۸ء میں) امرتسر میں منعقد ہو رہا تھا اس زمانہ میں طالب علم تھا اور لاہور میں مقیم تھا لاہور سے میں اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی جو ڈاکٹر اقبال مرحوم سے خاص تقرب رکھتے تھے اور ان کے ایڈیکانگ کی حیثیت سے رہتے تھے اسی اجلاس میں شرکت کے لیے امرتسر پہنچے ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی عذر کی بنا پر اس میں شرکت نہیں کر سکتے تھے میں اور چغتائی صاحب مغرب کے بعد مولانا سلیمان ندوی کی قیام گاہ پر حاضر ہو کر مولانا سے ملے تو مولانا نے علیک سلیک کے بعد چغتائی صاحب سے خطاب کر کے پوچھا کیوں ماسٹر صاحب ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر اقبال) تشریف نہیں لائیں گے چغتائی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی طرف سے عذر بیان کیا تو مولانا نے فوراً اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا اگر ڈاکٹر صاحب تشریف لے ہی آتے تو اچھا ہوتا یہاں سب علما جمع ہوں گے ان کو سنانے کا اس سے بہتر اور کیا موقع ہوگا......

جو حضرات اس وقت وہاں موجود تھے انھوں نے مولانا کے اس فقرے سے

بڑا لطف لیا۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے بعد آپ سے اکثر ملاقاتیں سفر و حضر میں ہوئیں اور آپ کو ہمیشہ اخلاق زہد و تقویٰ کا مجسمہ ہی پایا آپ کے علمی کارناموں سے اکثر مستفید ہونے کا موقع ملا بلکہ وہ فیضان کا باعث ہوئے اور بعض اوقات ان سے بعض تحقیقات کے ضمن میں کسی قدر اختلاف بھی ہوا مگر وہ ہمیشہ علمی جستجو کی حد تک رہا آپ کا اخلاق بہت وسیع تھا اس کی ایک مثال ضرور پیش کرتا ہوں یہ علمی دنیا کو خوب علم ہے کہ پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم نے شبلی مرحوم کی شہرہ آفاق تالیف "شعر العجم" پر ایک تنقید کی ہے جس نے خاصا چرچا پیدا کر لیا تھا اور علمی حلقوں میں لوگ نہایت دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے جو آج بصورت کتاب بھی طبع ہو چکی ہے

اس اثنا میں ایک مرتبہ شیرانی صاحب لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہ اپنے ہم وطن مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی محدث ندوۃ العلما کے مہمان ہوئے مگر حسن اتفاق سے اس زمانے میں سید صاحب بھی وہاں مقیم تھے جب ان کو علم ہوا تو مولانا حیدر حسن خاں کے توسط سے شیرانی صاحب سے وہاں ملاقات ہو گئی تو سید صاحب نے آپ کی اپنے خاص انداز میں ایک پر تکلف دعوت بھی کی جب لاہور واپس آئے تو شیرانی صاحب نے بسبیل تذکرہ اس دعوت کا حال سنایا۔ اس کے بعد اکثر میں نے شیرانی صاحب کو شعر العجم کی تنقید کو جاری رکھنے پر اکسایا مگر وہ یہی کہہ کر ٹال دیتے کہ یہ پٹھان (شیرانی) سید کی روٹیاں کھا آیا ہے اور ساتھ ہی ان کے اعلیٰ اخلاق کی تعریف بھی ہمیشہ کرتے۔ لاہور میں جب آپ تشریف لاتے تو اکثر محفلیں قائم ہوتیں ایسا معلوم ہوتا کہ ان قدیم زمانے کی علمی مجالس کا نقشہ سامنے آ گیا جن کا ذکر بعض علماء کے تذکروں میں ملتا ہے افسوس آج وہ مجالس موجودہ مغربی تمدن کے سیلاب میں محو ہو گئی ہیں بلکہ یوں کہیے کہ یہ علمی حضرات اپنے ہمراہ ہی لے گئے نہ کوئی آج ایسا محقق ہے اور نہ کوئی ہوگا۔ ایک مرتبہ ان سے ملتان کے اسٹیشن پر بالکل اتفاقیہ ملاقات ہو گئی ہم دونوں ایک ہی گاڑی میں کراچی سے لاہور آ رہے تھے اور علم نہیں تھا کہ وہ بھی اسی گاڑی میں ہیں فوراً علیک سلیک کے بعد انھوں نے راقم کے ایک مقالہ "سلاطین بہمنی دکن کے نام و نسب" کے متعلق استفسار فرمایا جو میں نے ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد دکن میں ہسٹری کانفرنس کے موقع پر پیش کیا تھا اور یہ مضمون برہان دہلی میں بھی طبع ہو چکا تھا کیوں کہ آپ نے بھی اسی موضوع پر ایک مقالہ کراچی کے مجلہ "تاریخ و سیاست" میں طبع کیا تھا۔ آپ نے اس خاندان بہمنی کو ہندی نژاد ثابت کرنے کی کوشش کی

حالاں کہ یہ خانوادہ خالص ایرانی نژاد ہے۔ آپ سے جب پاکستان آنے پر پہلے لاہور میں ملاقات ہوئی تو بہت مسرت اور عقیدت سے ملے۔ آپ اس وقت لاہور سے پروگرام سے فارغ ہو کر واپس جا رہے تھے۔ میں نے کچھ بیزاری کے عالم میں پاکستان کے ظہور میں آنے پر تاریخی رنگ میں ذکر شروع کیا کہ دیکھیے ایک زمانہ تھا کہ مسلمان ابتدا میں جب فتوحات کر رہے تھے اور غوری اور قطب الدین ایبک کے ہاتھوں دہلی فتح ہو رہی تھی تو مسلمان متوازی طور پر فتح کرتے ہوئے محمد بختیار خلجی کی قیادت میں ۵۹۹ھ میں لکھنوتی (بنگال) کو فتح کر چکے تھے۔ اور تمام ہندوستان پر چھا گئے تھے اور آج ہم ایک چھلتر سی لے کر مطمئن ہو گئے ہیں۔ اس پر ہم دونوں پر ایک سکتہ سا چھا گیا اور کچھ تاسف کی صورت میں آبدیدہ بھی ہوئے مگر زبان سے کوئی الفاظ نہیں نکلے۔ غرضے کہ نہایت دردمند انسان تھے۔

آپ کی ذات تو صفات کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر میں محض ایک امر کی طرف قارئین کرام کی توجہ ضرور منعطف کراتا ہوں وہ آپ کی طرز نگارش یعنی اسٹائل خطوط نویسی ہے آپ ہمیشہ چھوٹے چھوٹے جملے تحریر فرما کر ایک طرح کوزہ میں دریا بند کر دیتے اور نہایت معنی خیز الفاظ ہوتے یعنی صحیح معنوں میں قلَّ و دلَّ کے مصداق ہوتے۔ مزید یہ بھی خوبی قابل بیان ہے کہ آپ ہمیشہ خط کا جواب نہایت پابندی سے دیتے خواہ کبھی حالات کے اعتبار سے دیر ہی کیوں نہ ہو جائے۔

آپ صحیح معنوں میں طالب علم تھے جہاں آپ سے سہو ہو جاتا اس کا نہایت عمدگی سے اقرار بھی کرتے میرے نزدیک یہی ایک بڑے آدمیوں کی نشانی ہے اور ہمیشہ جستجو علم میں ہی رہے اور ہمیشہ صائب رائے سے مستفید فرماتے۔ یہ ضرور ہے کہ آپ نے بعض اوقات ایسے ایسے موضوعات پر بھی لکھا جو ظاہرہ آپ کا میدان نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مگر جب آپ نے لکھا پھر آپ ہی اس کے امام نظر آئے یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو صحیح طالب علم ہو آپ کی وفات سے جو نقصان عظیم ہوا ہے وہ واضح ہے۔ آپ سے جب بھی ملنے کا اتفاق ہوا آپ کو ہمیشہ خاموش اور علم میں منہمک اور ہمیشہ خندہ پیشانی پایا اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت کرے۔ مجھے توقع ہے کہ میرے یہاں شائع کردہ آپ کے چند خطوط بعض علمی حضرات کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں گے جو میری غرض و غایت ہے۔ (محمد عبداللہ چغتائی)

مکاتیب :

(۴۸)

دیسنہ، بہار

محترم! دامت معالیکم

میں اس وقت مرکز سے دور ہوں، ڈاکٹر صاحب کے دو والا نامے میرے پاس بھی آئے ہیں، میں یکم اپریل کو اعظم گڑھ پہنچ سکوں گا، ڈاکٹر صاحب نے امام رازی کی مباحث مشرقیہ کا خلاصہ طلب فرمایا ہے، اس کی تعمیل بھی وہیں سے ہو سکے گی ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دے دیجیے۔"(۱)

نالۂ عندلیب، خواجہ میر ناصر، خواجہ میر درد کے والد بزرگوار تھے، بڑے پایہ کے صوفی تھے ان کی تصنیف ہے، ہمارے ہاں اعظم گڑھ میں یہ کتاب نہیں، یہاں دیسنہ لائبریری میں بھی کتاب تلاش کی ہنوز نہیں ملی، مجھے یاد آتا ہے کہ یہ کتاب پرانے وقتوں میں ٹائپ میں چھپی ہے علم الکتاب بھی انہی کی یا خود خواجہ میر درد کی ہے، کتاب دیکھی ہے، مجددی تصوف

---

(۱) یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ اور علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے درمیان بعض علمی امور میں خط و کتابت ہمیشہ رہی جیسا کہ علامہ کے اپنے ذاتی خطوط بنام قبلہ سید صاحب طبع ہو چکے ہیں جن خطوں کی طرف جناب سید صاحب مرحوم نے اشارہ کیا ہے وہ مجموعہ میں ص۴۳ و ۱۴۴، ص۱۵۷، ص۱۵۹ پر طبع ہو چکے ہیں۔

ان میں بہت سے علمی امور پر آپ سے خط و کتابت کا ذکر ملتا ہے اور ان میں علامہ نے خط نمبر ۴۲ مورخہ ۱۵ مارچ ۲۷ء میں یہ بھی لکھا ہے کہ "معاف فرمائیے گا مباحث مشرقیہ" لاہور میں دستیاب نہیں ہو سکتی کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلم بند فرما کر مجھے ارسال فرما دیں۔ میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع ہوگا۔ یعنی آپ نے سید صاحب سے مباحث مشرقیہ امام فخر الدین رازی کی تصنیف مباحث مشرقیہ) کے حصہ بحث زمان کا ملخص طلب کیا ہے اور یہی میرے خط میں بھی سید صاحب کی طرف سے صراحت ہے کہ وہ اس پر لکھ کر اعظم گڑھ سے ارسال کریں گے۔

اسی سے ایک امر ضرور وضاحت طلب معلوم ہوتا ہے کہ راقم نے اکثر قبلہ علامہ مرحوم کی طرف سے بعض علما و فضلاء سے خط و کتابت کی اور اکثر سے ملاقات بھی کی بلکہ بعض علما کو آپ کی خدمت میں بلا کر حاضر کیا تاکہ آپ سے بالشافہ بھی بعض ضروری علمی امور پر گفتگو ہو جائے۔ راقم ان امور کو الگ ایک مستقل کتاب کی صورت میں "بعنوان" علامہ سر اقبال مرحوم کی صحبت میں" بیان کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

پر ہے۔

دوسرا کارڈ بھی آپ کا ملا، میں ان شاء اللہ کل پٹنہ جاؤں گا اور تاج کے متعلق مشمولہ رسالہ دیکھوں گا تو مطلع کروں گا، آپ کا مضمون زیر طبع ہے۔

"تفریح العمارات" تو بہت عام کتاب ہے، آگرہ میں ایک ایک روپیہ کو ملا کرتی ہے، مجھے تو گپ معلوم ہوتی ہے۔

والسلام

سید سلیمان

۲، شوال ۱۳۴۶ھ (۲۵، مارچ ۲۸ء)

㊾

محترما! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

میں پرسوں وطن سے واپس آیا، کتب خانہ بانکی پور میں تاریخ آگرہ کے متعلق تین کتابیں ہیں، ایک وہی بے نام کا رسالہ جو ہمارے پاس بھی ہے، اور عام طور سے ملتا ہے، اس کا نام میں نے "تفریح العمارات" قیاساً لکھ دیا تھا، دوسری کتاب اسی بے نام والی کتاب کا اضافہ شدہ بڑا اڈیشن جس کا نام کتب خانہ میں "تاریخ آگرہ" ہے اس میں دیگر عمارتوں کا بھی تذکرہ ہے، تیسری کتاب جو ضخیم ہے، لالہ بھل چند کی ہے، جو آغاز عہد انگریزی میں تھا، یہ کتاب آگرہ اور عمارات آگرہ کی تفصیلی تاریخ ہے، مگر استاد عیسیٰ[1] کا حال صرف اول و دوم میں ہے اور اس کا بھی یہ حال ہے، کہ ایک نسخہ

---

[1] اس زمانے میں راقم نے اپنا مقالہ "تاج محل آگرہ" لکھنا شروع کر دیا تھا اور تحقیقات کے ضمن میں مختلف لائبریریوں سے مواد کی تلاش شروع کر دی تھی چنانچہ سید صاحب نے میرے ایک استفسار کے جواب میں یہ جواب دیا اور ایک مخطوطہ عام طور پر تاج پر پیش کیا جاتا ہے جس میں عمارت تاج کی پیمائش اور کاریگروں کی فہرست و سامان کی فرد بھی ملتی ہیں۔ مگر یہ سب بناوٹی ہیں چناں چہ سید صاحب کی مندرجہ اطلاع سے واضح ہے کہ ایک مخطوطہ میں استاد عیسیٰ کو باشندہ روم اور دوسرے میں چین کا باشندہ درج کیا ہے میں نے اپنی کتاب "تاج" میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ عیسیٰ معمار کا کوئی وجود نہیں تھا اور یہ مخطوطے اس وقت ۱۸۲۵ء کے بعد آگرہ کالج کے طلبہ نے ایک اشتہار کے جواب میں تیار کیے تھے جس کی تصدیق برٹش میوزیم کے ایک ایسے ہی مخطوطے سے ہوتی ہے۔ ہاں ایک مخطوطہ پیرس کے کتب خانہ بین الملی میں ہے جو صحیح ہے راقم نے اسے مکمل ۱۹۳۸ء میں شائع کر دیا تھا جب کہ راقم کی کتاب "تاج محل آگرہ" پر مکمل فرانسیسی زبان میں طبع ہوئی تھی۔

ہیں اس کو ساکن روم اور دوسرے میں ساکن چین لکھا ہے ۔

میرے پاس جو بے نام والی کتاب ہے، وہ "تفریح العمارات" نہیں ہے، تفریح[1] العمارات بانکی پور کے کتب خانہ میں ہے ۔

ڈاکٹر صاحب کو کل جواب[2] دوں گا، آپ کا مضمون اپریل[3] نمبر میں چھپ گیا ہے، دو چار دن میں جائے گا ۔

سید سلیمان

۷ اپریل ۱۹۲۸ء

(۵۰)

---

[1] "تفریح العمارات" غالباً ابھی تک طبع نہیں ہوئی یہ دراصل آگرہ کی تمام عمارات کی بطور گائیڈ کے ایک فہرست ہے اور اس کا مصنف ایک شخص مسمی سیل چند ہے ۔

[2] یہاں امام فخرالدین رازی کی کتاب "مباحث مشرقیہ" کی طرف اشارہ ہے جس کے حصے "بحث زمان" کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم امام رازی کے خیالات کا جائزہ لینا چاہتے تھے جس کے متعلق پہلے خط میں بھی اس کا ذکر آچکا ہے کیوں کہ علامہ اقبال امام رازی کے خیالات متعلقہ زمان سے اپنے مدراس کے لیکچروں میں استفادہ کرنا چاہتے تھے ۔ اس لیے یہاں یہ بیان کرنا مناسب ہوگا کہ جب آپ کی طرف سے سید صاحب کے اپنے دیگر مشاغل کی وجہ سے دیر ہوئی تو لاہور میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں حیدرآباد دکن دائرۃ المعارف سے ایک مکمل نسخہ مباحث مشرقیہ کا منگوایا گیا اور اس کا ضروری حصہ زمان و مکان کا ایک لفظی ترجمہ راقم نے اور مولوی سعید احمد اکبرآبادی حال صدر مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ نے مل کر الگ تیار کیا ۔ وہ املا کراتے تھے اور راقم لکھتا تھا جس سے علامہ اقبال نے استفادہ کیا اور اس طرح مزید استفسار وغیرہ علامہ اکثر ہر ذی علم سے کیا کرتے تھے ۔

[3] راقم کا ایک مضمون بعنوان "تاریخ ابن خلدون کے قلمی نسخے" مارچ ۲۸ء کے معارف میں شائع ہوا تھا یہ اس کی طرف اشارہ ہے ۔

بخدمت مولوی عبداللہ صاحب چغتائی! دام لطفہٗ۔ السلام علیکم

رقعہ ملا، آپ کے پہلے مضمون[1] میں پشاور میں مسقف بازار بنانے کا جو ذکر ہے، ایک پشاوری نے اس کو آپ کا شبہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ بازاز کابل میں ہے۔

آپ احمد معمار[2] سے واقف ہیں، اگر اس کا حال معلوم ہو تو پتا بتائیے، آپ نے تاج کے سلسلے میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

آپ کا دوسرا[3] مضمون چھپ رہا ہے۔

مرقع[4] کا شکریہ چغتائی صاحب کو ادا کر چکا ہوں، آپ کا بھی شکریہ کہ روا روی کے وعدہ کو یاد رکھا۔

والسلام

سید سلیمان

۱۱ر مارچ ۱۹۳۱ء

---

[1] میرا ایک مختصر مضمون تاج پر معارف جنوری ۱۹۳۰ء کے پرچہ میں طبع ہوا تھا جس میں میں نے علی مردان خاں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تعمیرات کے ضمن میں بیان کیا کہ اس نے ایک مسقف بازار پشاور میں تعمیر کیا تھا۔ جس کا اس نے ایک نقشہ کرمت خاں شیرازی کو بھی ارسال کیا تھا کہ اس کے مطابق ایک مسقف بازار دہلی میں تعمیر کرے اس کا حوالہ میں نے خافی خان کی منتخب اللباب (صـ ۶۲۱ ج جلد اول) کا دیا تھا مگر سید صاحب کو اس پر شک ہوا اور آپ نے پھر مارچ ۱۹۳۱ء کے معارف کے شذرات میں وضاحت سے لکھ کر حمایت بھی کی۔

[2] سید صاحب کو احمد معمار کے لڑکے لطف اللہ مہندس کا ایک دیوان کہیں سے ملا تھا جس میں لطف اللہ نے اپنے باپ احمد کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ میرے باپ احمد نے علاوہ دیگر عمارات عہد شاہجہانی کے تاج بھی تعمیر کیا تھا جس کے لیے آپ نے مزید حالات و حوالے دریافت کیے تھے۔ اس کے متعلق اگلے خطوط میں مفصل آئے گا۔

[3] راقم کا ایک اور مضمون بعنوان "اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کے چند ہندو مصور" زیر طبع تھا جو اپریل ۱۹۳۱ء معارف میں طبع ہوا جسے آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس پٹنہ میں ۱۹۳۰ء میں پیش کیا گیا تھا یہ اشارہ اسی کی طرف ہے۔

[4] مرقع چغتائی یعنی دیوانِ غالب کے مصور ایڈیشن کی خاص اشاعت ۱۹۳۰ء میں لاہور سے ہو چکی تھی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(۵۱)

محترما وعلیکم السلام

تین ہفتوں سے میں پونہ بھوپال کے سفر میں تھا۔ "مرقع غالب" پر ریویو ہوگا، فنون لطیفہ پر کوئی عربی یا ترکی کتاب[1] ہمارے کتب خانہ میں اور نہ خطاطی پر کوئی کتاب سوائے تذکرہ خوشنویسان ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ غلام رسول سورتی تاجر کتب بھنڈی بازار بمبئی سے فہرست کتب منگوا کر دیکھیے، مجھے اپنی گفتگو یاد نہیں کہ کن مضامین یا رسائل کو خیال کر کے میں نے ایسا کہا تھا اگر آپ کو کچھ یاد ہو تو فرمائیے۔

آپ نے احمد معمار کا پتا نہ دیا، اس کا بیٹا مہندس خاں تھا، کہیں یہ نام آپ کی نظر سے گزرے ہیں[2]۔

خطاطی کی نمائش کسی کانفرنس کے ضمن میں حمایت اسلام یا ایجوکیشنل کانفرنس ہو تو زیادہ کامیاب ہو[3]، آپ کا مضمون چھپ گیا ہے۔

والسلام

(بقیہ حاشیہ گذشتہ)

مگر اس کا عام ایڈیشن بھی اس کے بعد شائع کیا گیا تھا سید صاحب کا اس متاخر نسخہ کی طرف اشارہ ہے جس کی ایک جلد آپ کی خدمت میں ان کی ایک مجلس میں ملاقات میں بطور حسن طلب کے یاد دہانی کرانے پر بطور ہدیہ ارسال کر دی گئی تھی۔ غرض کہ یہ ایک طرح رسید ہے اور آپ سے یہ ملاقات پٹنہ میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے موقع پر ہوئی تھی جب کہ آپ نے وہاں ایک معرکۃ الآرا مضمون "عمر خیام" پر پڑھا تھا اور اس جلسہ کی صدارت مرحوم فاضل صلاح الدین خدا بخش نے کی تھی۔

---

[1] مجھے اکثر یہ خیال رہا ہے اور عقیدہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے فن خطاطی میں ہی تمام اسلامی ثقافت پنہاں ہے اور ہمیشہ سے خیال دامن گیر ہے کہ ایک نہایت شاندار نمائش کی جائے چناں چہ اس ضمن میں آپ سے بھی اکثر تبادلہ خیال ہوتا رہا مگر یہ آرزو آج تک پوری نہیں ہوئی۔

[2] احمد معمار کے حالات وغیرہ سے متعلق آپ نے پھر استفسار فرمایا جس پر بندہ نے ان سے بعض مزید امور دریافت کیے جن کا اشارہ اگلے خط میں بھی ہے۔

[3] میں نے ایک نمائش نقاشی کی لاہور میں انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے کے موقع پر ۱۹۳۱ء میں کی جس میں بہت سے نوجوان مسلمان مصوروں نے حصہ لیا اور خطاطی کے ضمن میں قابل ذکر کام مرحوم عبدالمجید پروین رقم کا کام تھا جو اپنے زمانہ میں نستعلیق لکھنے میں خاص طرز رکھتے تھے اور اس نمائش کا افتتاح سر چودھری شہاب الدین صدر پنجاب لیجسلیٹو کونسل نے کیا تھا اور ان کے عزیز نواب احمد یار خاں دولتانہ مرحوم و الامتاز دولتانہ نے بہت سے نمونے خطاطی خرید کر حوصلہ افزائی کی تھی۔

سید سلیمان
۱۱/ اپریل ۱۹۳۱ء

---

(۵۲)

محترم! وعلیکم السلام

عنایت نامہ ملا، ناموں کا اشتباہ بھی عجیب چیز ہے، میں نے آپ کے مضمون کی رسید لکھنؤ سے بھیجی، مگر وہ محمد عبداللہ قریشی کوچہ کمانگراں کا ایک خط آیا ہوا تھا، اس کے جواب میں لکھ کر بھیجی آپ کو انتظار رہا ہوگا، اور ان کو میری اس بوالفضولی پر حیرت ہوئی بہرحال دونوں صاحبوں سے خواستگار معافی ہوں[۱]۔

آپ کا مرسلہ ٹکٹ موازی عہ/ قیمت کتاب پہنچ گیا، دفتر کے حوالہ کر دیا گیا معارف آپ کے نام آپ کے مضامین کا بھجوا دیا جائے گا[۲]

آپ سے میں نے پوچھا تھا، کہ احمد معمار کا نام کس کتاب تاریخ میں آپ کو ملا ہے؟ اور آپ نے اپنے مضمون تاج میں اس کا نام کس سند کی بنا پر لیا ہے؟ وہ سند مجھے درکار ہے احمد والا نوٹ ابھی میں شائع کروں گا، اُسے آپ ہی کے حوالے سے لینا ہے[۳] دیوبند والا نوٹ ابھی نہیں دینا ہوں[۴]، پہلے دسمبر میں الملک عقیم[۵] والا دیا جا رہا ہے۔ جنوری میں دیوبند والا

---

[۱] آپ نے میرے ایک خط کا جواب میرے ایک کرم فرما ہم نام کو ارسال کر دیا یہ اس طرف اشارہ ہے عہ

عہ یہ خط عبداللہ قریشی کے نام ہے اور اس مجموعے میں شامل ہے

[۲] میں نے ایک مرتبہ مولانا شبلی مرحوم کی کتاب "اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر" منگوائی تھی اس کی قیمت بصورت ٹکٹ ادا کی تھی۔

[۳] احمد معمار کے ضمن میں میں نے آپ کو عمل صالح وغیرہ کے حوالے دیے تھے جس کے متعلق اگلے خطوط میں ذرا وضاحت سے ملے گا۔

[۴] میں ایک مرتبہ استاد محترم و معظم قبلہ حضرت سید انور شاہ صاحبؒ سے ملنے دیوبند گیا تو اتفاق سے آپ مکان پر تشریف نہیں رکھتے تھے بھوپال گئے ہوئے تھے مگر قیام وہیں ہوا تھا نماز عصر کے وقت ان کے مکان کے قریب ایک مسجد جو شمال کی طرف تھی نماز ادا کی۔ اتفاق سے اس مسجد کی پیشانی پر ایک

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

آئے گا۔ پرچہ آپ کے نام بھیج دیا جائے گا۔

والسّلام

سید سلیمان

۲۱ر اکتوبر ۱۹۳۱ء

(۵۴)

محترم! وعلیکم السلام

مجھے ایک دیوان فارسی ہاتھ لگا ہے، اس میں احمد معمار کا نام ہے، اس کے لیے میں نے احمد معمار کا نام تلاش کرنا چاہا، چوں کہ آپ کو اس قسم کے مضامین سے دلچسپی ہے اس لیے آپ سے پوچھا کہ آپ کی نظر سے تیموری تواریخ میں یا شاہجہاں کے عمارتی سلسلے میں کہیں اس کا نام گزرا ہے جس سے اس کا پورا حال معلوم ہو سکے، یا یہ تصریح ملتی ہے کہ تاج کی تعمیر میں یہ بھی شامل تھا صرف حوالہ مقصود ہے، آپ جو حوالہ بتائیں گے، آپ کے نام کے اظہار و شکریہ کے بعد میں درج کروں گا۔

والسلام

سید سلیمان

۱۲ر دسمبر ۳۱ء

(بقیہ حاشیہ گزشتہ)

تحریر پتھر پر نظر پڑی دیکھتے دیکھتے معلوم ہوا کہ کوئی قدیم کتبہ ہے جب سیڑھی لے کر اس کا ایک چربا لیا تو معلوم ہوا کہ وہ اکبر کے عہد کا کتبہ ہے جس پر ایک مستقل مضمون لکھ کر معارف میں برائے طباعت ارسال کیا جو جنوری ۳۲ء میں طبع ہوا جیسا کہ سید صاحب کے اپنے الفاظ سے واضح ہے۔

۵؎ سر جادوناتھ سرکار پروفیسر تاریخ ایک مشہور ہستی تھی جس نے اورنگ زیب عالمگیر پر ۵ ضخیم جلدیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک مختصر سی کتاب "احکام عالمگیری" لکھی تھی اصل فارسی میں طبع کی ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں بھی کر دیا ہے اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے جس میں کہا گیا ہے "کلمۃ الملک عقیم یا بدداشت" جس کا عام ترجمہ تو یہ ہے مثال "ملک بانجھ ہے اس کو مد نظر رکھو" مگر سرکار نے انگریزی میں جو ترجمہ کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے "کلمۃ الملک عقیم" بادشاہ کا لفظ (کلام) بے معنی ہوتا ہے جو ایک فحش غلطی ہے جس پر راقم نے ایک مستقل مضمون معارف میں برائے اشاعت ارسال کیا چناں چہ یہ اس کی طرف اشارہ ہے اور یہ مضمون طبع ہو چکا ہے۔

۶؎ اب اس خط میں سید صاحب نے احمد معمار سے متعلق کچھ وضاحت فرمائی جس کا جواب راقم نے مع حالات و اقتباس کے ارسال کیا جس کی رسید اگلے خط سے واضح ہے۔

(۵۴)

محترم! وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ

عنایت نامہ کا شکریہ، مجھے آپ کی واپسی کا علم نہیں تھا، بہرحال آپ کی اس کامیاب واپسی پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں[1]

میرا مضمون احمد معمار[2] بحمد اللہ کہ پورا ہوگیا، جابجا سے پتا چلا۔ مانڈو کے کتبات میرے پاس تھے، جن کو ظفر حسن صاحب نے شائع کیا ہے۔ لطف اللہ کی بہت سی تصانیف کا پتا لگا ہے۔

میں نے نواب جعفر خاں کے خط کے تعلق سے آپ کا حوالہ دیا ہے، مگر یہ آپ نے نہیں لکھا کہ یہ مجموعہ خطوط کس کا ہے، آپ کے پاس جو نسخہ ہے اس کا سال کتابت کیا ہے؟ نواب جعفر خاں کا یہ خط کب کا ہے؟ بہرحال اس خط کے وثوق کی ذمہ داری آپ پر ہے۔

یہ مضمون انشاء اللہ لاہور ہی میں اپریل میں پڑھا جائے گا، مطلع کیجیے کہ "ادارۂ معارف اسلامیہ" کی حیثیت کیا ہے[ع]؟ اس کا کہاں تک وجود ہے؟ اس نے اپنے اجلاس میں بلایا ہے۔

والسلام

سید سلیمان ۹ر فروری ۱۹۳۳ء

---

[1] راقم ۱۹۳۲ء کے وسط میں یورپ بعض علمی تحقیقات کے ضمن میں گیا تھا اور وہاں سے آخر دسمبر ۳۲ء کو واپس آگیا یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔

[2] آپ نے احمد معمار پر ایک مبسوط مضمون لکھا اور اس میں آپ نے نواب جعفر خاں کے نام ایک خط کا اقتباس بھی دیا تھا جسے راقم نے آپ کو ارسال کیا تھا جس میں احمد معمار کا ذکر حسن ابدال کی تعمیرات کے ضمن میں ملتا ہے اور مجھے ایک گمنام مجموعہ خطوط میں ملا تھا جو عہد شاہجہاں سے تعلق رکھتا تھا جس پر آپ تاکید فرما رہے ہیں اور یہ مضمون آپ نے لاہور میں ہی آکر ادارۂ معارف اسلامیہ کے جلسہ میں اپریل میں پڑھا تھا جس کے متعلق اگلے خط میں بھی درج ہے۔ [ع] یہ ادارہ حضرت علامہ اقبال کی صدارت میں خواجہ عبدالوحید مرحوم نے قائم کیا تھا۔ اپریل ۱۹۳۳ء میں جو اس کا جلسہ علمی ہوا تھا، خواجہ صاحب نے اس میں وقت کے کئی اکابر علم کو جمع کیا تھا۔ جلسہ نہایت کامیاب ہوا۔ اس کی روداد مع مقالات کے شائع ہوگئی تھی

(۴۴)

محترم! اکرمکم اللہ تعہ۔ السلام علیکم!

عنایت نامے کا شکریہ، آپ نے جہاں اتنا صبر فرمایا ہے، ایک مہینہ اور صبر فرماتے جس چیز کو آپ بہ اصرار چاہتے ہیں، وہی تو صرف مضمون میں جانِ سخن ہے، اگر اسی کی تشہیر قبل از وقت کر دی جائے[1] تو اس مردہ اور بے جان مضمون کی حیثیت کیا رہ جائے گی۔ امید ہے کہ اپریل میں آپ سے ملاقات ہو سکے گی۔

والسلام

۲۸/ فروری ۱۹۳۳ء سید سلیمان ندوی

---

[1] میں نے آپ سے ذرا بے صبر ہو کر جو ایسے علمی کام کرنے والوں کا شیوہ ہے آپ کے نتائج مضمون سے متعلق دریافت کیا جس کا جواب آپ نے اس طرح دیا کہ اب مضمون میں اصل سن لینا جو لاہور میں اپریل ۳۳ء میں پڑھا جانے والا تھا۔ چناں چہ یہ جلسہ نہایت شان و شوکت سے لاہور میں زیر صدارت علامہ سر محمد اقبال ہوا یہ علمی جلسہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہماری علمی جدوجہد کی تاریخ میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے کیونکہ اس میں دارالمصنفین کے ارکان مرحوم سید سلیمان ندوی، سید ریاست علی اور مولانا سعید انصاری نے بھی شرکت کر کے مضامین پڑھے تھے اور ان کے علاوہ دیگر اہل علم حضرات نے بھی خوب حصہ لیا یعنی نواب صدر الصدور حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسوں نے بھی شرکت کی تھی۔ آپ نے اپنا معرکۃ الآرا مضمون بعنوان "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج محل اور لال قلعہ بنایا" پڑھا اور راقم کا بھی اس خط وغیرہ کے ضمن میں باقاعدہ حوالہ تھا جب آپ نے مضمون ختم کیا تو راقم نے بھی باجازت مرحوم علامہ اقبال صدر جلسہ آپ کے مضمون پر کچھ تبصرہ کیا اور ساتھ ہی احمد و حامد کا ذکر بھی بحوالہ "عمل صالح" کیا کیوں کہ مطبوعہ نسخہ "عمل صالح" میں غلطی سے احمد کا ہی ذکر ملتا ہے مگر آپ نے نہایت خوبی سے ہر دو معماروں کا ذکر خوب کیا تھا ویسے میں نے اس وقت شک ظاہر کیا تھا کہ "احمد" کو ہمیں فوراً اس کے لڑکے کی محض ایک شہادت پر معمار تاج قرار دینے میں ذرا تامل کرنا چاہیے اور کسی مزید شہادت کا انتظار کرنا چاہیے چناں چہ آج تک بھی کوئی اور شہادت میسر نہیں آئی۔

حال ہی میں ڈاکٹر نذیر احمد لکھنؤ یونیورسٹی نے ایک محققانہ مضمون احمد معمار کے پوتے امام الدین ریاضی کی ایک تصنیف "تذکرہ باغستان" پر مفصل لکھا ہے (رسالہ اردو انجمن ترقی اردو ہند) جس سے اس خاندان کے افراد و حالات پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے مگر اس میں اس کا اقرار نہیں ملتا کہ احمد معمار تاج بھی تھا۔ اس جلسہ ۱۹۳۳ء ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کی مکمل روداد طبع ہے۔

(۵۶)

محبِ مکرم! دام لطفہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ نے مفتخر کیا میں سفر میں تھا، گجرات کے بعض مقامات کی سیاحت میں مصروف تھا، ۱۶ر کو واپس آیا، اس سفر میں زبدا[1] پر ایک چھوٹی سی نظم لکھی گئی ہے۔ اگر فرمائیں تو وہ کاروان[2] کے لیے حاضر کر دوں یا کوئی اور نظم۔

سیر الصحابہ حصہ ششم اور تاریخ صقلیہ حصہ[3] اول امسال نئی کتابیں چھپی ہیں، مرسل خدمت ہیں۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

والسّلام

سیّد سلیمان

۱۶ر جولائی ۱۹۳۳ء

(۵۷)

محبِ محترم! دام لطفہ

السلام علیکم، جی ہاں آپ کی فرمایش نظم زبدا[4] کی نسبت موصول ہوئی تھی، لیکن میں ڈر رہا تھا کہ آیا یہ بھیجنے کے قابل بھی ہے یا نہیں اب آپ کے اصرار سے مجبور ہو کر بھیج رہا ہوں۔

تاریخ صقلیہ کی عبارت مذکورہ میں جو ٹکڑا ابن[5] اثیر سے منقول ہے اس میں یہ جھوں کی بجائے

---

[1] راقم نے سالنامہ "کارواں" کی خاطر آپ سے کوئی مضمون یا نظم طلب کی جس کے جواب میں آپ نے "نظم زبدا" کا ذکر کیا ہے۔

[2] کاروان، لاہور کا پہلا پرچہ ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر تاثیر کی ادارت میں نکلا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں اس کا دوسرا شمارہ مجید ملک کی ادارت میں شائع ہوا تھا

[3] آپ اکثر کتابیں ارسال کر دیا کرتے تھے۔

[4] آپ نے میرے اصرار پر آخر یہ نظم ارسال کر دی جسے رقم نے سالنامہ کارواں میں طبع کیا یہ سالنامہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک عجیب وغریب مرقع علم ادب و فن کا تھا اس کے صرف دو شمارے شائع ہوئے۔

[5] اس کتاب میں صـ پر کچھ عبارت ابن اثیر سے نقل کر کے استنباط کیا گیا ہے اور اس کے مفہوم کو ادا کرنے میں کچھ اور ہونا چاہیے جس طرف آپ کی توجہ دلائی گئی تھی چناں چہ اس کا جواب تھا اور آپ نے اس کی وضاحت بھی کر دی۔

مضمون چھپ گیا ہے، حاصل ترجمہ صحیح ہے، مگر لفظی ترجمہ یوں ہوگا۔

اور صقلیہ والے، صقلیہ اور قلوریہ کے ان حصوں پر جو رومیوں کے ہاتھوں میں تھے، حملہ کرتے رہے اور ان کو لوٹتے اور ویران کرتے رہے۔

کچھ خبر ہے کہ ادارۂ معارف[1] اسلامیہ کی روداد اور مجموعۂ مضامین کی اشاعت کب ہوگی، دوستوں کو سلام۔

والسّلام

سید سلیمان ۱۷؍ اگست ۱۹۳۳ء

(۵۸)

مکرم! السلام علیکم

یاد فرمائی کا شکریہ، صقلیہ دوم ارسالِ خدمت کی گئی، رسید کا انتظار رہے گا۔

مجھے مدت سے آپ کی تلاش تھی، زمانے بھر میں آپ پھرتے ہیں، مگر کبھی دارالمصنفین کے جھونپڑے میں آپ قدم نہیں رکھتے۔

دارالمصنفین میں اسلامی تمدن ہند کی تاریخ زیرِ تحریر ہے[2]، چاہتا ہوں کہ اس کے مختلف ابواب مختلف اصحاب اپنے اپنے دائرہ کے لکھیں، اسلامی فن تعمیر، تصویر اور خوش خطی پر تین ابواب کی ضرورت ہے، مضامین محققانہ ہوں، یہ مضامین انھیں اصحاب کے نام سے اس مجموعہ میں چھپیں گے۔

کیا آپ ان تینوں پر یا ان میں سے کسی ایک پر لکھیں گے[3]؟ خوش خطی اور تاریخ خط در ہند پر تو پروفیسر محفوظ الحق بھی لکھ سکتے ہیں، یا کسی اور کا نام بتائیے، بڑے لوگ تو خطوں کا جواب

---

[1] خط ۵۷ کے حاشیے میں واضح کر دیا ہے کہ آپ نے لاہور میں اگر مضمون پڑھا اب آپ کو اس کی طباعت کا انتظار ہے جو جلسہ ادارۂ معارف اسلامیہ کی روداد میں طبع ہوگا۔

[2] اسلامی ہند کی تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کی پندرہ جلدوں پر مشتمل ایک جامع تاریخ کی تالیف و تدوین کا دارالمصنفین نے ۱۹۳۴ء میں ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے مقالے کی فرمائش کی تھی۔ اس منصوبے کا ذکر نصیر الدین ہاشمی کے نام خط میں ذکر آیا ہے اور وہاں اس پر ایک حاشیہ بھی ہے۔

[3] آپ کی اس دعوت پر میں نے لکھنا شروع کیا مگر اسی سال مجھے پھر دسمبر ۳۴ء میں یورپ جانے کا اتفاق ہوگیا اور اس کے لیے میں نے کچھ مزید وضاحت کی خاطر خط لکھا جیسا کہ اگلے خط سے واضح ہو جائے گا۔

بھی نہیں دیتے، آثارِ قدیمہ کے محقّقین کا بھی تجربہ ناکام رہا، یا یوں کہیے کہ بڑی تنخواہوں کے مل جانے کے بعد پھر کام کا حوصلہ جاتا رہتا ہے۔

الحمدللہ اب اچھا ہوں۔ والسّلام

سیّد سلیمان

۲۷؍ اگست ۱۹۳۶ء

۵۹

مکرم! السلام علیکم

عنایت نامہ کا شکریہ۔ آپ کی مشغولیتیں بے حد مبارک ہیں۔ جمع آثار کا کام بے حد ضروری ہے۔ آپ مصوّری اور تعمیرات صرف دو مضامین لیں اور پوری تاریخ غزنویہ سے لے کر آخر تک نچوڑ کر رکھ دیں۔ عہد بہ عہد کی ترقیاں اور مدارج دیکھنا ہے۔ پچاس پچاس صفحے غالباً کافی ہوں۔ تصاویر کا انتظام ہو سکا تو کیا جائے گا۔ مدت ایک سال۔

آپ کے مذاق کی ایک چیز ہاتھ آئی ہے۔ انیس الحجاج ملا معین صفی قزوینی مصنف دربارِ زیب النساء بیگم مصوّر، بندر سورت، ممی تا جدہ منیٰ۔ حجاجِ ممالکِ اسلامیہ اور دیگر مناظر کی دستی تصاویر۔ ان تصاویر کی دستی قدر و قیمت آپ جانیے۔

جی ہاں "ادارۂ معارف" کے جلسے میں عدم حاضری [عہ] کے سبب آپ کی کوششوں کا نظارہ نہ کر سکا۔

یار زندہ صحبت باقی۔ والسّلام

سیّد سلیمان

۹؍ ستمبر ۱۹۳۶ء

۶۰

مکرم! السلام علیکم

آپ کے خطوط موصول ہوئے۔ میں کئی ہفتے سے سفر میں تھا۔ آپ کا مضمون جو علی مردان خان پر ہے ضرور شائع ہوگا، وہ اس لیے رکا تھا کہ اس کے ساتھ کا رسالہ تصیح طلب

[عہ] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب ۱۹۳۶ء کے جلسۂ علمی میں شریک نہ ہو سکے

تھا، میں رسالہ مذکور آپ نے پاس بھیجتا ہوں، اس کو صحیح کر کے بھیج دیجیے یا اس کی اشاعت ملتوی کر دیجیے، اس میں بہ کثرت غلطیاں ہیں[1]۔

میں نے جس عنوان پر لکھنے کی آپ سے فرمایش کی تھی، وہ درخواست اب بھی اسی طرح ہے اسلامی تمدن ہند کی تاریخ کے سلسلہ میں یہ دو باب چاہتا ہوں جن پر اگر لکھ سکیں تو دو چار مہینوں میں لکھ کر بھیج دیں۔

(۱) مسلمانوں کی تعمیرات ہند پر تبصرہ اور موجود مشہور عمارات کی نسبت فنی آرا وغیرہ۔

(۲) مسلمانوں کی تصاویر و نقاشی وغیرہ اور خط کی تاریخ اور مشہور مصوروں کی نقاشیوں اور خطاطوں کے حالات و کارنامے۔

میرے خیال میں ان دونوں پر سو سو صفحے کافی ہوں گے، یا جتنا آپ اپنے پیش نظر مولو کے لحاظ سے لکھ سکیں، مگر جو کچھ لکھا جائے محقّقانہ و مستند ہو۔ حوالے فٹ نوٹس میں ہوں اور اس طرح لکھا جائے کہ معلوم ہو کہ ہندوستان کی قدیم صنعتوں میں اسلامی عہد میں کیا ترقیاں ہوئیں، ہر باب کے لیے سو روپے کی نذر کرتا ہوں، مطلع فرمایئے[2]۔ والسلام

سید سلیمان

۱۳ر اپریل ۳۸ء

(۴۴)

مکرم! السلام علیکم

آپ کی بخیریت اور کامیاب واپسی پر مبارکباد۔ ابھی چند ہفتے ہوئے کہ آپ کے بھیجے ہوئے ایک فرنچ مراکشی پروفیسر سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور آپ کی خیریت

---

[1] میرا ایک مضمون علی مردان خاں پر معارف میں برائے اشاعت آپ کے پاس پڑا تھا جس کا ذکر آپ نے فرمایا ہے میں نے اس کے ساتھ ایک فارسی زبان میں رسالہ بھی ارسال کیا جس میں علی مردان خان کی اولاد و امجاد کا ذکر تھا میں چاہتا تھا کہ یہ بھی مضمون کے ساتھ فٹ نوٹوں میں شائع ہو جائے مگر آپ نے دیکھا کہ وہ کافی غلط تھا اس لیے آپ نے اسے واپس کر دیا اور مضمون کو شائع کر دیا۔

[2] آپ نے میرے استفسار پر اس کتاب کی وضاحت فرمائی۔

معلوم ہوئی تھی۔[1]

میری اور آپ کی ملاقات مرحوم ڈاکٹر اقبال ہی کے ذریعے سے ہوئی تھی، اس لیے آپ کے اور میرے خطوں کے تبادلہ میں اس سانحۂ عظیم کا ذکر ضروری ہے، مرحوم کی وفات پر چند رسمی غمگین لفظوں کا اظہار ناکافی ہے۔ یہ وہ غم ہے جس کے اظہار کے لیے الفاظ ناکافی ہیں۔[2]

آپ کے خطوط اور ایک تاریخی مضمون مع رسالۂ قلمی موصول ہوا، مضمون مذکور میں اور اس سے زیادہ اس فارسی رسالہ میں بیحد غلطیاں ہیں اس لیے ان کو چھاپا نہ جاسکا۔[3]

میں آج کل ایک دور افتادہ دیہات میں مقیم ہوں، اور گرمیوں بھر یہیں رہوں گا،

برادرم سید نجیب اشرف سے پٹنہ میں ملاقات ہوئی تھی، اور آپ کے واپس آجانے کی خبر پہلے انھیں سے معلوم ہوئی تھی۔[4]

---

[1] بندہ ۱۹۳۸ء میں ماہ اپریل کے وسط میں یورپ سے پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر واپس آیا اس لیے آپ مبارک باد دے رہے ہیں۔ اس اثنا میں ایک پروفیسر پیرس سے ہندوستان کی سیاحت پر آیا جس کا نام ”جونارا“ تھا اس نے تمام ہندوستان کے ان مقامات کی سیاحت کی جہاں علوم عربی و فارسی ذرا زیادہ اعلیٰ طریق پر پڑھائے جاتے تھے۔

[2] میں نے ابتدائی سطور میں یہ واضح کیا ہے کہ قبلہ سید صاحب مرحوم سے میری ملاقات علامہ سر اقبال کی معرفت لاہور میں ہوئی تھی چناں چہ آپ نے اقبال کی وفات ۲۱ اپریل ۳۸ء کو جو ہوئی مرحوم کی تعزیت بھی میرے ساتھ ہی کی یہ وہی معاملہ ہے جو میں نے ابتدا میں لکھا ہے کہ بعض اوقات کسی کی وفات کی تعزیت کرنا مرحوم کے پس ماندگان سے معما ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ مرحوم کے ان حضرات سے تعلقات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس لیے غالباً آپ نے علامہ کی تعزیت میرے ساتھ کی ویسے آپ نے معارف کے شذرات میں بھی اس کا اظہار فرمایا تھا۔

[3] یہ میرا مضمون علی مردان خاں تھا جس کے ساتھ میں نے ایک رسالہ بھی جو قدیم لکھا ہوا تھا مگر وہ قابل اطمینان نہیں تھا یہ اس کی طرف اشارہ ہے اور آخر یہ مضمون طبع ہوا جیسا کہ پچھلے خط سے واضح ہے۔

[4] پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب آج بھی یوسف اسمٰعیل کالج اندھیری بمبئی میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کیا آپ کی کتاب تاج کے کسی گوشہ میں میرا بھی ذکر ہے[1]؟

امید کہ ادارۂ معارف کے آیندہ جلسہ میں ملاقات ہو۔

والسلام
سید سلیمان
۱۲ر مئی ۱۹۳۸ء

(۶۲)

مکرم! السلام علیکم،

عنایت نامہ ملا،

(۱) سند کے کتبات کے سلسلے میں میں نے وہی لکھا جو پروفیسر شفیع صاحب نے مجھے لکھا تھا، اس کے علاوہ مجھے کچھ علم نہیں ہے[2]۔

(۲) معارف کے جن نمبروں میں آپ کے مضمون چھپے ہیں، ان کے لیے دفتر میں لکھیں۔

(۳) مناسب ہے کہ ہم سب لوگ آپس میں موالفت رکھیں اور کام کرنے والوں کی مدد کریں۔ مگر ضرورت ہے کہ کام کرنے والے دیانت سے کام کریں اور استحقاق سے زیادہ کی توقع نہ کریں یہ فقرہ تھوڑی تفصیل کا محتاج ہے[3]

پروفیسر اردو ہیں آپ سید صاحب مرحوم کے قریبی عزیز ہیں۔ سید نجیب اشرف سے راقم کے دوستانہ تعلقات ایک عرصے سے ہیں۔

[1] آپ کو یہ علم ہے کہ میری کتاب تاج محل آگرہ پر بلجیم میں فرنچ زبان میں طبع ہو چکی تھی چوں کہ اس سے بیشتر میرے اور آپ کے درمیان احمد معمار کے ضمن میں خاصی خط و کتابت رہی جیسا کہ بعض خطوط سے واضح ہے اس لیے لازمی تھا بلکہ توقع تھا کہ میں آپ کی تحقیقات کا ذکر بھی کرتا۔ چنانچہ میں نے جہاں احمد معمار کی سوانح حالات بیان کیے ہیں وہاں اس کے لڑکے لطف اللہ کے دیوان کا حوالہ آپ کے نام سے ہی دیا ہے۔

[2] قبلہ مولوی محمد شفیع صاحب مدظلہ العالی نے کچھ کتبات سندھ مقام سہوان سے جمع کیے تھے (اورینٹل کالج میگزین سنہ ۳۰ء) جن میں آپ نے سلطان محمد تغلق کی وفات اور قبر کے متعلق نہایت مفید اطلاع بہم پہنچائی تھی یہ تمام اس کی طرف اشارے ہیں۔

[3] راقم کا ارادہ یہ تھا کہ آپس میں تمام تحقیقی کام کرنے والوں کے درمیان ایک (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(۴) آپ کا مضمون علی مردان خان اعظم گڑھ میں ہے، اس کی تعمیل واپسی کے بعد ہو سکتی ہے[1]

(۵) آپ کا رسالہ "یادداشت تاج محل" مجھے نہیں ملا، بھجوا دیجیے۔[2]

(۶) آپ نے ہماری کتاب کے کچھ ابواب اگر لکھے ہوں تو میرے پاس بھجوا دیجیے، دارالمصنفین اپنی استطاعت کے مطابق ان اوراق کی قیمت ادا کرے گا، اور وہ اوراق آپ ہی کے نام سے طبع ہوں گے[3]

اوائل جولائی میں حیدرآباد کا قصد ہے۔

والسلام

سید سلیمان

۲۹ر مئی ۱۹۳۸ء

۶۴

مکرم! السلام علیکم

سفر میں آپ کا عنایت نامہ ملا اور تینوں مطبوعہ رسالے بھی ملے۔ اللہ تعہ آپ کی کوششوں

اخوت اور تعاون کا جذبہ ہونا چاہیے، تاکہ ایک دوسرے کے تعاون و اطلاع سے علمی کارنامے مکمل ہو جایا کریں بلکہ آپس میں ایک حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔

[1] راقم کا ایک طویل مضمون بعنوان "امیر الامراء علی مردان خان" معارف ۱۹۳۸ء جلد ۴۲ میں دو قسطوں میں طبع ہوا تھا، یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

[2] میں نے ایک مخطوطہ فارسی میں پیرس کے کتب خانۂ بین الملی سے متعلقہ "تاج محل آگرہ" جسے عرف عام میں "یادداشت تاج محل" کے نام سے لکھا جاتا ہے تلاش کر کے طبع کیا تھا اور اپنے مقالہ تاج محل کے ساتھ وہاں پیرس یونیورسٹی میں داخل کیا تھا۔ اس کے عوض میں پیرس یونیورسٹی نے ایک خاص انعام بھی دیا تھا جس سے اصل کتاب تاج کی طباعت میں خاصی سہولت بھی ہوئی تھی چنانچہ آپ نے اسے طلب فرمایا ہے کیونکہ نہایت محدود طور پر لاہور میں اورینٹل کالج میگزین کے ضمیمہ کے طور پر اسے شائع کیا گیا تھا اس لیے ذرا مشکل سے میسر آیا۔

[3] یہ اسی کتاب کی طرف اشارہ ہے جو سید صاحب نے راقم کو بعنوان فنِ تعمیر اور مصوری لکھنے کے لیے کہا تھا جس کا ذکر پچھلے خطوط میں آچکا ہے اور میں نے ہر چند آپ سے خواہش کی کہ ایسی کتب کو مع تصاویر

میں برکت دے کہ آپ ایسے مفید کام بہت سے انجام دے سکیں۔ آپ ان مصارف کے رسالہ کو صحیح سمجھتے ہیں مجھے تو فرضی معلوم ہوتا ہے،

میں سفر میں تھا، اور کل سے پھر سفر درپیش ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کے جلسہ مضامین میں جا رہا ہوں،

آپ سے دارالمصنفین جن مضامین پر ایک تالیف مانگ رہا ہے اس کو کب تک تیار کریں گے

والسلام

سید سلیمان

۲/ ربیع الاوّل ۱۳۵۷ھ (۲/ جون ۱۹۳۸ء)

(۴۳)

مکرم السلام علیکم،

میں دو مہینوں سے مرکز سے باہر گرمیوں میں ایک گاؤں میں مقیم ہوں، جو شہری ہنگاموں سے یکسر خالی ہے۔

آپ کے والا نامے ملے۔ میں نے اپنا مقصد بار بار آپ کے سامنے ظاہر کر دیا، مضمون کی تفصیل کر دی، آپ پھر اس کی تفصیل اور مزید تفصیل میں مصروف ہیں، مہربانی فرما کر اگر آپ کام کرنا پسند فرماتے ہوں تو مضمون لکھ کر عنایت فرمائیں، اور معاوضہ قبول فرمائیں کوئی رقم پیشگی بھیجنا میرے امکان سے باہر ہے اور نہ کوئی سفر خرچ ممکن ہے۔

شائع ہونا چاہیے مگر آپ سے اس ضمن میں معاملہ طے نہیں ہوا۔

[1] میں نے آپ کی خدمت میں تاج محل سے متعلق یادداشت مطبوعہ ارسال کی اور اس کے ساتھ ہی اور بھی مواد تھا آپ اس پر تبصرہ فرما رہے ہیں کہ بعض حصے فرضی ہیں مگر وہ رسالہ بطور "یادداشت لاہور تاج محل" جو راقم نے پیرس کے کتب خانہ بین الملّی سے دریافت کر کے طبع کیا تھا وہ نہایت صحیح اور اصلی ہے اس کے متعلق میں نے اپنی کتاب تاج میں مفصل لکھا ہے۔

[2] یہ کتاب معرض التوا میں اس وجہ سے رہی کہ میں ہر چند آپ سے پوچھتا رہا کہ ایسی تالیف کے لیے تصاویر لازمی ہیں اور آپ اس کے متعلق کوئی جواب ہی نہ دیتے یا آپ ایسی کتاب کے لیے تصاویر کی اہمیت کو مدِنظر رکھ کر زیادہ خرچ سے تامل فرماتے۔

میں نے معاملہ کو واضح کر دیا ہے، اب اس کے بعد کچھ مزید توضیح بیکار ہے امید کہ مزاج بخیر ہوگا[1]

والسلام

سید سلیمان

۲۶ر جون ۳۹ء

یہ دونوں خط اگرچہ سید صاحب کے قلم سے نہیں لیکن دراصل اسی مکاتبت کا ایک حصہ ہیں۔ ایک خط تو سید صاحب ہی کے ایما سے لکھا گیا ہے۔ دوسرا خط بھی سید صاحب کے ذکر سے خالی نہیں۔ اس لیے انھیں بھی اس سلسلے میں شامل کیا جاتا ہے۔

(۴۵)

محترم! زاد لطفہ

السلام علیکم۔ آپ کی کتاب اور مضمون موصول ہوئے شکریہ۔ جناب سید صاحب کے ارشادِ گرامی کے مطابق تاریخ صقلیہ جلد دوم روانۂ خدمت ہے۔ اب خدا کے فضل و کرم

---

[1] راقم سے آپ کی فرمایش کتاب تعمیرات اسلامی اور مصوری پر جو آپ نے میرے ذمہ لگائی مزید وضاحت کے ضمن میں خط و کتابت ہوتی رہی اور یہ آپ کا اسی طرف اشارہ ہے، مگر آج تک بھی یہ کام بعض رکاوٹوں کی بنا پر نہیں ہوا۔ پاکستان بننے پر میں نے آپ کے دار المصنفین کو لکھا تھا کہ اگر وہ فرمائیں تو میں اپنے موجودہ مقالات پیش کر سکتا ہوں مگر کسی قسم کی ترغیب نہیں دلائی گئی۔

[حضرت سید صاحب اس خط میں جھنجھلائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں اس منصوبے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اگست ۱۹۳۶ء سے چغتائی صاحب سے فنون لطیفہ میں سے تعمیرات، خوش نویسی یا مصوری پر لکھنے کی فرمایش کی تھی۔ اب تین سال ہونے والے تھے اور معاملہ وضاحتوں سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ سید صاحب جس گرد و پیش میں زندگی گزار رہے تھے، اس میں تصویروں کے جواز کی گنجایش نہ تھی، وہ کتاب میں تصویروں کی شمولیت سے انکار کر کے اپنے ذوقِ لطیف کی نفی بھی نہیں کرنا چاہتے تھے مصوری کی کتاب تصویروں کی شمولیت کے بغیر علم و فن کی دنیا میں قبول ہی نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے اس بارے میں وہ کوئی صاف جواب نہ دیتے تھے، صرف مضمون کا مطالبہ فرماتے تھے۔ اور تصویروں کے بغیر فنون لطیفہ کے کسی پہلو پر خصوصاً مصوری، رقص وغیرہ پر صرف مضمون لکھ دینا فنونِ لطیفہ کے ذوق آشنا مصنف کے لیے ممکن نہ تھا۔

سے وہ بالکل بخیر و عافیت ہیں اور اپنے کاموں میں مصروف۔ ان کی طرف سے سلام قبول فرمائیے۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ میں ادھر ایک ماہ سے تنفّس اور نزلہ میں گرفتار ہوں۔ آپ لائق مبارک باد ہیں کہ کچھ نہ کچھ کرتے جاتے ہیں۔ اس مفید کتاب کی اشاعت پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ والسّلام

سید ریاست علی ندوی
۱۴؍ اگست ۱۹۳۶ء

(۶۶)

محترم! السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ "معارف" کی زبان اردو ہے۔ یہ بدعت آپ نے کیوں کی۔ مدت کے بعد آپ نے معارف کو نوازا تو زبان اجنبی میں۔ بہتر ہوتا کہ اس مقالہ کا خلاصہ آپ اردو میں بھیج کر ہمیں شکر گزار فرماتے[عہ]

کتاب کے متعلق میں کیا عرض کروں۔ افسوس کہ یہ میرے فرائض و اختیارات سے بالا تر ہے۔ اگر میرے ذاتی نسخے بھی باقی رہ گئے ہوتے تو روانہ خدمت کرتا۔ یہاں کی کتابیں اولاً ریویو کے لیے بھیجی نہیں جاتیں اور جو چند پرچوں میں جاتی ہیں وہ جناب سید صاحب کی اجازت سے۔ وہ ان دنوں یہاں تشریف فرما نہیں، کیا اچھا ہوتا کہ آپ انھیں براہِ راست تحریر فرماتے۔ ان کا پتا نمبر ۲۰۔۱ اندر روڈ۔ ڈیرہ دون" ہے۔

امید ہے کہ یہ جواب ذاتی طور پر آپ کے لیے بار خاطر نہ ہوگا خصوصاً اس مرتبہ میں آپ کے اخلاص و صداقت کا تحفہ آپ سے رخصت ہوکر ساتھ لایا ہوں۔ والسّلام

سید ریاست علی ندوی
۶؍ مئی ۱۹۳۹ء

[عہ] ڈاکٹر چغتائی صاحب نے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مضمون انگریزی زبان میں بھیج دیا تھا

حفیظ جالندھری:

(۹۷)

مکرمی دام لطفکم!

السلام علیکم۔ مخزن کی اپیل پر اپنی سخت عدیم الفرصتی کے باوجود اپنی سرگزشت کی چند سطریں بھیجتا ہوں۔ قبول ہوں۔ آپ کے اسلامی شاہنامہ کی تعریفیں سُن رہا ہوں، خدا کرے اپنے کانوں سے سننے کا اتفاق ہو۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام

سید سلیمان۔ ۲۸ / جنوری ۱۹۲۹ء

سید صاحب علیہ الرحمہ نے اس مکتوب کے ساتھ مندرجۂ ذیل تحریر بھیجی تھی جو مخزن لاہور کے ۱۹۲۹ء کے سالنامے میں اس خط کے ساتھ شائع ہوئی تھی:

میری اور مخزن کی تاریخ

غالباً ۱۹۰۱ء تھا، ندوۃ العلما کا سب سے عظیم الشان اجلاس عظیم آباد پٹنہ میں منعقد تھا۔ اس وقت میری عمر کم و بیش سولہ برس کی تھی، یہ قومی اجلاس میری زندگی کا پہلا جلسہ تھا۔ اس اجلاس کے سب سے ممتاز مقرر شیخ عبدالقادر صاحب تھے، انھوں نے "کتب خانہ کی ضرورت" پر ایک تحریر ایسی دلآویز صورت میں پڑھی تھی کہ سارا جلسہ احسنت و آفریں کے ہنگامے سے پُر تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس جلسہ میں دو اہم اردو صحیفوں کے اجراء کا اعلان ہوا تھا جن میں ایک اُس زمانے کے ہردلعزیز اتحاد اسلامی دعوت کے اول داعی انشاء اللہ خاں مرحوم کے "وطن" کا اور دوسرے شیخ عبدالقادر کے "مخزن" کا۔

اجلاس کے بعد ہی مجھے لکھنؤ میں بغرض تعلیم "ندوہ" آنے کا اتفاق ہوا اور ادھر لاہور سے مخزن نکلا اور اس شان سے نکلا کہ تمام اہل نظر پکارا ٹھے:

اس طرح کا جمال ہو، ایسا شباب ہو!

اُس وقت تک انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب اردو انشاپردازی سے ناآشنا تھے۔ "مخزن" پہلی بزم سخن تھی جس میں نئے اور پرانے انشاپرداز اکٹھا ہوئے۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب نے اردو میں سخن وری اور سخن سرائی کی طرف توجہ کی۔ اس عہد کے پرانے تجربہ کار اہل قلم اُس

زمانے کے شوخ اور البیلے مضمون نگار اور شاعر تھے۔ ڈاکٹر اقبال، چودھری خوشی محمد ناظر میر نیرنگ، سید حسرت موہانی، مولانا محی الدین آزاد المعروف مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا غلام یٰسین آہ دہلوی (برادر مولانا ابوالکلام) وغیرہ اس بزم کے سخن ور اور نثار تھے۔

یہ پہلا رسالہ تھا جو میرے علمی و ادبی ہوش و تمیز کے عہد میں نکلا۔ اس کو دیکھ دیکھ کر میری طبیعت نے بھی جولانی دکھائی اور اس روش پر بے اختیار قدم پڑنے لگے۔ "آخر وقت" کے عنوان سے عمر میں پہلا مضمون لکھا جس نے "مخزن" کے صفحات میں جگہ پائی۔ اس کے بعد ایک نظم لکھ بھیجی جو انتخاب میں نہ آئی کیونکہ میں کبھی اچھا شاعر نہ تھا۔ لیکن اس کے بعد جب حماسہ میرے درس میں تھی، ایک مضمون "معشوقۂ عرب کی یاد" لکھا جس کو پھر "مخزن" نے قبول کیا۔ اور یہی مخزن میں میری آخری تحریر تھی۔

آہ! آج ان واقعات پر چوتھائی صدی کا زمانہ گزر گیا۔ اس عرصے میں قلم نے ہزاروں صفحات سیاہ کیے، سیکڑوں مضامین لکھے، ملک کے بڑے بڑے رسائل نے میرے حوصلے سے زیادہ قدر افزائی کی۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ وہ خوشی جو "مخزن" میں اپنے ابتدائی مضمون کے شائع ہونے سے ہوئی تھی، پھر حاصل نہ ہوئی اور جیسے زمانہ گزرتا جارہا ہے وہ چیز جو کبھی دنیا کی خوشی اور مسرت کا سرچشمہ معلوم ہوتی تھی، آج اس کی حیثیت سراب سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ پھر دنیا میں حقیقی خوشی کیا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی (حیدر آباد دکن)

(۴۹)

محترم و مکرم دامت مکارمکم! السلام علیکم

والا نامہ نے عزت بڑھائی۔ معارف کو نہ صرف انڈیا آفس لائبریری کی فہرست پیش کرنے کی پہلی عزت حاصل ہے۔ بلکہ نفس انڈیا آفس لائبریری کے اردو سیکشن کا علم بھی لوگوں کو اسی کے ذریعے سے ہوا۔ سب سے پہلے جب ۱۹۳۰ء میں انڈیا آفس لائبریری کے دیکھنے کا مجھے موقع ملا تو اس کی اردو کتابوں پر ایک مختصر مضمون معارف میں لکھ کر بھیجا تھا۔ اور اسی زمانے میں اس میں چھپ گیا تھا۔

اب آپ نے میرے ادھورے کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا ہے۔ مجھے خیال آتا ہے کہ

لہ ہاشمی صاحب کا یہ مکرر کام "یورپ میں دکنی مخطوطات" کے نام شائع ہو چکا ہے۔

وہاں رنگین کی تصنیفات کی تعداد کچھ زیادہ ہیں۔ بہرحال آپ تو اس سمندر کی تھاہ لے رہے ہیں۔ میں ساحل پر بیٹھا منجدھار کے مسافر کو کیا بتاؤں۔

آپ کا مضمون بھی پہنچا ہے۔ اس کی تمہید میں آپ کی کوششوں کا حوالہ دوں گا۔ اور شذرات میں بھی ذکر کروں گا۔ اگر آپ بجائے متفرق پرچوں میں لکھنے کے کسی ایک ہی پرچہ میں لکھا کریں تو علم کی وسعت اور یکجنگی اور حفاظت کی خدمت بہتر ہو سکے گی۔

معارف کا محولہ نمبر جاتا ہے۔ اسٹوری صاحب کو دکھا دیجیے۔ والسلام

سید سلیمان

۲۰ر اپریل ۱۹۲۹ء

([illegible])

دارالمصنفین اعظم گڑھ

محترم دام لطفکم۔ السلام علیکم!

میرا مضمون ہاشم علی برہان پوری "ہندستانی"[1] میں چھپ گیا ہے۔ اس کی ایک کاپی مرسل ہے۔

۲۔ شائع شدہ کتابوں اور رسالوں کا دوبارہ طبع کرانا معارف کے حدود سے باہر ہے۔

۳۔ آپ کے فاضلانہ مضامین قابل اشاعت ضرور ہیں مگر دارالمصنفین کو اپنے اصول کی بنا پر معذوری ہے۔ مدت سے آپ نے معارف کو یاد نہیں فرمایا۔

سید سلیمان

۱۹ر فروری ۱۹۳۴ء

(۷۰)

صاحب الفضل[2]۔ وعلیکم السلام!

عنایت نامہ کا شکریہ۔ سفرنامۂ افغانستان[3] آپ کو پسند آیا تو اس میں آپ کی محبت کی نظر کو دخل ہے۔ حسن لیلیٰ میں نہیں، بچشم مجنوں میں ہے۔

---

[1] ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد کا علمی مجلہ

[2] بیت الفضل ہاشمی مرحوم کے مکان کا نام تھا جو بعد میں فروخت کر دیا گیا۔

[3] سید صاحب مرحوم کا مشہور سفرنامہ یہ سفر علامہ اقبال مرحوم کی قیادت اور سر راس مسعود کی معیت میں ۱۹۳۲ء میں نادر شاہ کی درخواست پر کیا تھا۔

دسمبر کے معارف میں بضمن شذرات تاریخ ہندوستان کی جلدوں کی تعداد و ترتیب لکھی گئی ہے[1]۔ دسویں جلد بہمنیہ و سلطنت ہائے دکن سے متعلق ہوگی۔ اگر پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی اس جلد کو لکھنا چاہیں تو آپ دریافت کر کے مطلع فرمایئے۔ اگر وہ اس جلد کا کام اپنے ذمہ لیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔

عہد آصفی کے لیے سراج الدین صاحب طالب اور آرکاٹ کے لیے محمد غوث صاحب لکھ سکتے ہیں۔ مگر ان کے لیے چودھویں جلد میں صفحات محدود ہوں گے زیادہ سے زیادہ پچیس پچیس، تیس تیس صفحے۔

"حیات شبلی" لکھی پڑی ہے[2] اور میری فرصت کی منتظر ہے۔ حضرت امجد کی شاعری پر آپ کا رسالہ طاری یویو ہوگا۔ آپ کی عنایات کا شکریہ۔ تاریخ ہند کی طرف توجہ کیجیے۔ آپ کی پیشگی قیمتوں کے وصول کرنے سے بڑی ذمہ داری آ جاتی ہے۔ جس سے ڈرتا ہوں۔ والسلام۔

۱۱ر دسمبر ۱۹۳۲ء سید سلیمان

دار المصنفین اعظم گڑھ

مکرم دام لطفکم، السلام علیکم!

عنایت نامہ ملا، پرسش احوال کا شکریہ، وہ بچی اپنی علالت سے جانبر نہ ہو سکی،

---

[1] دار المصنفین نے اسلامی ہند کی سیاسی، قومی، علمی، تمدنی تاریخ کی تدوین کا ایک منصوبہ بنایا تھا، جس کا اعلان کیا گیا تھا۔ یہ تاریخ چودہ جلدوں میں تجویز کی گئی تھی۔ یہ منصوبہ بالکل اعلان و تجویز کے مطابق تو انجام نہیں پا سکا لیکن کئی نہایت مفید کام انجام دیے گئے ہیں۔

[2] یہ کسی طرح صحیح نہیں کہ "حیات شبلی" لکھی پڑی ہے۔ اس وقت تک انھوں نے کام شروع بھی نہیں کیا تھا۔ البتہ لکھنے کا ارادہ تو شبلی کی وفات کے بعد ہی سے تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے نام ۴ر ستمبر ۱۹۴۰ء کے خط میں لکھتے ہیں "سوانح شبلی جلد اول ختم ہو رہی ہے" پھر ۱۲ر اکتوبر کے خط میں تحریر فرماتے ہیں: "حیات شبلی ابھی تک مسودے کی صورت میں ہے، مگر الحمد للہ کہ قریب الختم ہے" سید صاحب مرحوم کے عزیز و محقق سید صباح الدین عبدالرحمن (مرحوم) لکھتے ہیں: "چنانچہ ۱۹۴۰ء میں اس کام کو شروع کر دیا اور تین برس کی جاں کاہ محنت کے بعد فروری ۱۹۴۳ء میں ۸۴۶ صفحے کی حیات شبلی لکھ کر اہل علم کے سامنے پیش کر دی" (معارف۔ اعظم گڑھ سلیمان نمبر ۱۹۵۵ء ص ۲۴)

اس کی وفات کی اطلاع مجھے حیدرآباد ہی میں مل چکی تھی، اس لیے جلد چل پڑا۔

میرے حسن سیرت کے ساتھ اگروہ ہے، آپ کی گرویدگی خود آپ کے حسن سیرت کی دلیل ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس دفعہ احبابِ دکن کی محبتوں کا بے حد ممنون رہا۔ خاص کر بے نیاز امجد کی نیازمندی کے شرف کو اس سفر کا حاصل سمجھتا ہوں۔ "کلیاتِ امجد" کی ترتیب بسا ضروری ہے۔ یہ امجد کے چمکانے کے لیے نہیں بلکہ امجد کے وجود سے دنیا کو مستفید ہونے کے لیے۔

جی ہاں! جن کتب خانوں کی کتابوں کی فہرستیں نوٹ کی ہیں، ان کا ذکر سفرِ دکن کے فوائدِ علمی میں آئے گا۔ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ کی فہرست چھپ جائے، تو بہتر ہے۔

میں نے غلام غوث صاحب کو ایک کتاب سحر حلال مصنّفہ ولد احمد معمار کے متعلق کتب خانہ مدراس سے دریافت کی فرمایش کی تھی، آپ سے ملاقات ہو تو پھر فرمایش کر دیجیے کہ کتاب کا پہلا صفحہ مجھے نقل کر کے بھیج دیں۔

جشنِ سیمیں کی شرکت بعض حالات پر مشروط ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ والسلام

یکم ستمبر ۱۹۲۵ء

سید سلیمان

(۷۲)

دار المصنفین اعظم گڑھ

مکرمی السلام علیکم۔

میں اپریل سے خانہ بدوش تھا۔ اب تک مرکز پر پاؤں نہیں جمے ہیں۔

حیدرآباد کی واپسی کے بعد بہت کچھ لکھنے کا ارادہ تھا۔ مگر میں ایسا بیمار پڑا کہ جینے کے لالے پڑ گئے، اب اچھا ہوا تو اکثر باتیں حافظہ سے نکل گئیں۔

کلامِ امجد کی تدوین و ترتیب ضروری فرض ہے، مکاتیبِ شبلی کی تیسری جلد کا ارادہ نہیں۔ سابقہ جلدیں دوبارہ طبع ہو چکی ہیں۔

یہ سن کر کہ سراج الدین صاحب مرحوم کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا افسوس ہوا، بظاہر خیریت ہے۔ اندر کا حال خدا جانے۔ والسلام۔

۸ر ستمبر ۱۹۲۷ء

سید سلیمان

۴۳

مکرم السلام علیکم۔

جواباً عرض ہے۔ جہاں تک میری نظر ہے چھوٹی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے گھر سے باہر کوئی چہار دیواری مسلمانوں نے نہیں بنائی۔ اور نہ مساجد میں اور نہ کتاب یعنی مکاتب میں لڑکوں کے ساتھ وہ نظر آئیں۔ صرف سواحلِ ہند میں ایک ساحلی شہر تھا۔ جہاں ابن بطوطہ کو لڑکیوں کے مکاتب نظر آئے۔ اُس کا بیان ہے کہ سواحلِ ہند میں ہنود کے مقام میں ۱۲ مکتب لڑکیوں کے تھے (جلد ۲ صفحہ ۱۲۲ مصر)۔

عملی تواتر سے جو واقعہ ثابت ہوتا ہے وہ وہی ہے جو اصغری خانم کے مدرسہ کا ہے۔ یا یہ کہ امراء اپنی لڑکیوں کے لیے کوئی معلمہ یا مستند و ثقہ و معمر معلم بہ پابندیِ پردہ مقرر کرتے تھے جیسا کہ سلاطین مغل کی خواتین زیب النساء وغیرہ کے احوال میں ہے۔

بے شبہ اعلیٰ تعلیم جیسے علم حدیث وغیرہ میں یہ طریقہ بھی مذکور ہے کہ مساجد و محافل میں کسی استاد یا محدث کے املا میں عورتیں بھی حاضر ہو کر سنتی تھیں اور روایت کرتی تھیں۔ بلکہ وہ بھی مجلس میں بیٹھ کر املا حدیث کرتی تھیں۔ اور مرد تلامذہ و سامعین ان کو سنتے تھے۔ لیکن پہلی صورت میں عورتوں کا انتظام نشست الگ تھا۔ اختلاط نہ ہوتا تھا۔ جیسا کہ احادیث میں ہے کہ عورتوں کے لیے الگ انتظام ہوتا تھا۔ اور دوسری صورت میں بیچ میں پردہ حائل ہوتا تھا۔ جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے احوال میں ہے۔ یا اگر وہ بہت بوڑھی ہوتی تھیں تو کشف وجہ بھی کرتی ہوں گی۔ مگر تصریح میری نظر میں نہیں ہے۔

یہ بھی تھا کہ باپ اور بھائی اپنی عزیز بیٹیوں اور بہنوں کو خود اعلیٰ تعلیم دیتے تھے۔ اور اُس کی مثالیں بہ کثرت ہندوستان میں پہلے بھی تھیں اور اب بھی ہیں۔ اور بعض فقیہات اسلام کے تذکروں میں بھی ہے۔ بعض اپنے شوہروں سے علم حاصل کرتی تھیں۔ والسلام

۱۵؍ ستمبر ۱۹۴۳ء سید سلیمان

۴۴

بھوپال

مکرم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

قرآن پاک کے اس مبارک نسخہ کا صدقہ ہے کہ آپ کا سوادِ خط ان نورانی حرفوں میں نظر آیا۔ الحمد للہ بخیر ہوں۔ اور دائمی خیر۔

ملکاپوری صاحب کا بیان جب تک کسی قدیم سند پر مبنی نہ ہو وثوق کے قابل نہیں۔ سلاطین کے کتب خانوں میں عموماً اُن کے کتب خانوں کی کتابوں پر مہریں ہوتی تھیں۔ ان مہروں سے اس نسخہ پاک کا خالی ہونا اُس کی نسبت کو مشکوک بناتا ہے۔

نسخے کی آخر کی عبارت "ضعیف عباد اللہ" اگر آپ نے صحیح نقل کیا ہے تو غلط ہے۔ اضعف عباد اللہ چاہیے۔ جیسے اس کے بعد "واعجز خلق اللہ" ہے۔ پھر نام کے آخر میں الحسنی الحسینی لکھا ہے۔ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کے طریق کے خلاف ہے۔ کیونکہ ان کی تصنیفات غنیۃ الطالبین وغیرہ میں اس طرح نہیں کہیں لکھا گیا ہے۔ علمائے عراق عربی و فارسی دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ تاہم ان اشعار کی زبان میں کسی قدامتِ عہد کا اثر نہیں معلوم ہوتا۔ اصل شئے خط اور کاغذ کی پہچان ہے۔ یہ اشعار اگر نستعلیق میں لکھے ہوئے ہیں تو وہ پھر حضرت سیدنا شیخ جیلانی قدس سرہ کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ یہ خط نویں صدی میں ایجاد ہوا ہے۔ عربی خط سے بھی کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

۲۰ر جنوری ۱۹۴۷ء　　سید سلیمان ندوی

(۴۵)

مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کا والا نامہ ملا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کے لیے معلومات کا تحفہ پیش کروں۔ مگر یہاں کتابیں نہ میرے پاس ہیں نہ دوسروں کے پاس ہیں۔ اس لیے معذوری رہی۔ اور امروز فردا میں معاملہ ٹلتا رہا۔ بہتر ہے کہ آپ سید صباح الدین عبدالرحمان رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ سے مغلیہ دور کی کوتوالی کے فرائض کے متعلق دریافت کریں۔ وہ ان چیزوں پر کتاب لکھ رہے ہیں اور وہاں ماخذ بھی موجود ہیں۔

غواصی کا دیوان بڑی غواصی کے بعد آپ کو ہاتھ آیا۔ اب یہ دُرِ نایاب آپ کو مبارک۔ معارف کے نمائش خانہ میں میں بھی اس کو دیکھوں گا۔

حیدرآباد آنا بلا تقریب تو ہوتا نہیں۔ اور کوئی مستقل تقریب ابھی تک پیدا ہوئی نہیں۔ اور یوں بھی اب وہ آزادی نہیں۔ پابندی ہے۔ والسلام

بھوپال - ۱۶ر اکتوبر ۱۹۴۷ء

سید سلیمان

مولانا اشرف علی تھانویؒ

(۷۶)

خانقاہ تھانہ بھون سے سید صاحب کی خدمت میں ایک رسالہ تقریظ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ یہ مکتوب اسی سلسلے میں ہے۔

حضرت العلامۃ المفضال متع اللہ المسلمین بطول بقائکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

رسالہ التنور متضمن رسالہ ''کشف الدجیٰ'' مع ہدایت نامہ سرفرازی کا باعث ہوا۔ میں اس کو اپنے لیے سعادتِ کبریٰ سمجھتا ہوں کہ آپ اس ظلوم وجہول سے تقریظ لکھنے کو فرمائیں۔ خدا گواہ ہے کہ میں اپنے کو اس سے کمتر سمجھتا ہوں کہ آپ کی کسی تحریر پر تقریظ لکھوں، مجھے یہ بھی شک ہے کہ میرا طریقہ، تحریر اور طرزِ استدلال پسند خاطرِ اشرف ہو، مگر بحکم الامر فوق الادب تعمیل کروں گا۔ اگر میرا یہ عذر قابلِ پذیرائی نہ ٹھیرا۔ ساتھ ہی زبان کے متعلق فیصلہ ہو کہ عربی ہو یا اردو، جواب کے لیے لفافہ و ٹکٹ کی حاجت نہیں۔

حضرتِ مستفتی[۱] میرے استاذ و شیخ ہیں۔ یہ رسالہ اُنھوں نے مجھے حیدر آباد (دکن) میں خود دیکھنے کے لیے دیا تھا اور میں اس کو بغور پڑھنے کے لیے ساتھ لایا تھا، پڑھ کر میں نے ان کو ان الفاظ کے ساتھ اس کو واپس کیا کہ آپ جس کو مکروہ سمجھتے ہیں میں اس کو عین ربوا کہتا ہوں اور میرے نزدیک تو قیل وقال و روایت سے زیادہ مستحکم دلیل عمل سلفِ کرام ہے کہ یہ ایسا کھلا اور شدید الاحتیاج مسئلہ ہونے کے باوجود کسی نے اس کو جائز نہیں بتایا اور نہ اس پر کبھی عمل کیا، لفظ بیع و دَین و قرض کے اصطلاح سے بڑھ کر لغت کا فیصلہ ہے، رسالہ کشف الدجیٰ کے مطالعہ سے بہرہ مند ہوا، طرزِ عبارت اور انشاء کی سلاست

---

[۱] مفتی عبد اللطیف صاحب مفتی ریاست حیدر آباد دکن نے ایک رسالہ شائع فرمایا تھا کہ ربا (سود) صرف بیع وشراء میں متحقق ہے قرض میں نہیں۔ سید صاحب نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ حضرت تھانوی نے اس کے جواب میں اپنے بھانجے مولانا ظفر احمد عثمانی سے یہ رسالہ لکھوایا تھا۔ یہ رسالہ مکتوب الیہ کا نہیں جیسا کہ مکتوب سے شبہ ہوتا ہے۔

اور جاذبیت نور، علیٰ نور ہے۔

بار بار میرا دل جب زمانے کے فتن و حوادث سے گھبرا اٹھتا ہے اور بے اختیار کسی سکینت و طمانیت کی تلاش ہوتی ہے تو خانقاہ امدادیہ کی یاد آتی ہے۔ لیکن ڈر تھا کہ معلوم نہیں کہ اجنبیت و بیگانگی سے میرے متعلق کیا کیا اب تک پہنچا ہو اور آپ مجھے تخاطب کا اہل بھی سمجھیں یا نہیں! میں تو اس رسالۂ استفتاء کا ممنون ہوں کہ اجنبیت و بیگانگی کی جگہ اس کی بدولت دانست و یک جہتی کی صورت پیدا ہوئی، اب میں اس کشمکش کی منزل میں ہوں جس میں علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں بنتے۔

دعا کا طالب و ہمت کا خواستگار ہوں۔

والسلام
سلیمان ندوی

(۷۷)

حضرت ہادیٔ طریقت متع اللہ المسلمین بطولِ بقائکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ جو لطف و عنایت سے بھرا ہوا تھا، درود فرما ہوا، اس سے ایک پریشان حال و متشتت البال کی سکینت ہوئی۔

مولانا! میں آپ کی دعا و دعوت کا بہترین مستحق ہوں، مسائلِ علمی کی الجھن سے نجات کا خواستگار نہیں بلکہ روح کی الجھن سے نجات کے لیے دعا و ہمت کا طالب ہوں۔

میں نے اعتزال سے لے کر سلفیت تک بمدارج ترقی کی ہے، عقائد میں امام مالک کے اس اصول کا پیرو ہوں: الاستوٰے معلوم والکیف مجہول والایمان بہ واجب والسوال عنہ بدعۃ۔ سیرۃ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ کی تالیف و تدوین میں خواہ مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں مگر اس مصروفیت نے ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جذبۂ محبت پیدا کر دیا ہے، وللہ الحمد، فقہ میں متاخرین کا متبع نہیں، مگر اہلحدیث بالمعنی المتعارف نہیں ہوں، ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا دل سے ادب کرتا ہوں اور کسی رائے میں کلیۃً ان سے عدول حق نہیں سمجھتا،

میرا خاندان صوبۂ بہار میں علم ظاہر و باطن کا جامع رہا ہے۔ والد مرحوم ابوالعلائی المشرب تھے، بھائی صاحب مرحوم مجددی تھے اور دونوں صاحبِ حال و نسبت تھے۔ بچپن ان

بزرگوں کے آغوش میں بسر ہوا، ذکر و مراقبہ اُسی سن سے شروع کر دیا گیا، مگر بُرا ہو علمِ باطل کا کہ جس نے مدتوں کے لیے اس راہ سے ہٹا دیا اور خدا جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں اور اب جب مرحلۂ اربعین سے گزر کر ہوش آیا ہے تو ان بزرگوں کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے میں نے یہ کیفیت اس لیے لکھ دی تاکہ جناب میرے مستقبل کی اصلاح میں میرے ماضی سے باخبر رہیں۔

میرے لیے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں کہ مجھ میں استقامت و تثبت اور رغبت الی الطاعت پیدا ہو۔ فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں، کبھی کبھی ذوقِ سجود کی لذت بھی پاتا ہوں۔ امام ربانی مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے سلسلے سے عقیدتِ تامہ رکھتا ہوں، خرافات و طاماتِ صوفیہ کا دل سے منکر ہوں، صالح نہیں لیکن صلاحِ حال کا دل سے خواستگار ہوں، یورپ کے مذہبی و علمی حملوں کے مقابلے میں اسلام کی خدمت کا ولولہ ہے اور اب تک پچیس برس کا زمانہ انہی مشاغل میں گزرا اب آپ سے دعا کا طالب ہمت کا خواستگار اور حصولِ اخلاص اور اصلاحِ قلب کے لیے کسی نسخے کا سائل ہوں۔

رسالہ کشف الدجیٰ پر قلم نے جو یاوری کی ہے، مولوی ظفر احمد صاحب کی خدمت میں ارسال ہے۔

سلیمان ندوی
۲۱ر شعبان ۱۳۴۸ھ[ے]

(۷۸)

حضرت اقدس دام فضلکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

نادم ہوں کہ دیر کے بعد حاضر ہو رہا ہوں، رمضان المبارک سے کچھ دن پہلے والا نامہ مع رسالہ تسہیل قصد السبیل شرف افزا ہوا تھا، رسالہ تو اسی زمانے میں ایک روز میں پڑھ لیا اور اس کے مطالب کو سمجھ لیا، رمضان المبارک کے ایام مبارکہ میں تکلیف دینے سے احتراز کیا اور مولوی ظفر احمد صاحب کو اس کی اطلاع اور رسالے کی رسید بھیج دی۔ شوال میں خط لکھنے کا ارادہ تھا مگر اوائلِ شوال سے آج سے چند روز پیشتر تک سفر میں گزرے اور موقع نہ ملا۔

رسالۂ تسہیل کو پڑھ کر سب سے پہلا اثر جو دل پر ہوا یہ تھا کہ یہ راہ سخت مشکل ہے دوسری چیز یہ معلوم ہوئی کہ ان جزئیاتِ فقہیہ کا جن کا اس میں ذکر ہے میرے لیے تحقیق طلب

[ے] مطابق ۲۲ جنوری ۱۹۳۰ء

تھا، میں نے بات صفائی سے لکھ دی۔ ان اللہ لا یستحی من الحق۔

رمضان المبارک کے عشرۂ آخر میں بعد سحر و نماز صبح میں کچھ دیر کے لیے سوتا تھا، میں نے اس میں دو خواب دیکھے، اپنے کو دیکھا کہ میں مدراس میں ہوں، حضرت والا بھی مع اپنے ہمراہیوں کے ایک مکان میں فروکش ہیں، آپ کے ہاتھ میں بہت بڑی تسبیح ہے آپ کے ایک ہمراہی مولوی ظفر احمد صاحب جو الگ بیٹھے ہیں جن کی وضع قطع، داڑھی کی تراش خراش اہل پنجاب کی سی ہے انھوں نے مجھ سے کچھ اردو ادبیات پر گفتگو کی، مگر آپ کے دوسرے ہمراہی جو ضعیف العمر معلوم ہوئے وہ مصلی بچھائے نہایت خضوع کے ساتھ مصروف نماز ہیں، ان کی نسبت معلوم ہوا کہ یہ آپ کے خادم خاص ہیں۔

اس کے دو دن بعد ۲۳ کو پھر اسی وقت خواب دیکھا کہ میں ریل میں سوار کہیں جا رہا ہوں کہ ایک جگہ گاڑی کھڑی ہو گئی، معلوم ہوا کہ یہ تھانہ بھون ہے، جی میں آئی کہ اتر جاؤں، چناں چہ اتر گیا اور سامان لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا کہ یہاں تو جگہ بہت کم ہے یہاں نہیں ٹھہر سکتے، میں نے عرض کیا کہ اس کی فکر نہ فرمائیے۔ میں نے راستہ میں ایک مسجد دیکھی ہے میں اُس میں ٹھہر جاؤں گا۔

میری حالت میں استقامت نہیں ہے اور اسی کی مجھے فکر رہتی ہے۔ میری حالت یہ ہے۔

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم　　　گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

اس کے لیے دعا فرمائیے۔

کسی مناسب دعا یا ورد کی تلقین فرمائیے۔

مولوی عبدالحی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے دمِ آخر آپ کا ایک رسالہ بھیجا، "آئینہ تربیت"، اور ساتھ دوسرے تیسرے دن وفات کی اطلاع ملی، غفرلہ الاحد

والسّلام

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے انتقال پر حضرت سید صاحب نے　　　معارف میں بہ تقریبِ تعزیت جو مضمون تحریر فرمایا تھا اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اتنے زوردار الفاظ میں اور اس شان دار اسلوب بیان میں اپنے استاد حضرت علامہ شبلی کے سوا انھوں نے کسی اہل علم کا ماتم نہیں کیا۔ سید صاحب کا یہ مضمون "یادِ رفتگاں" سے نقل کیا جاتا ہے ملاحظہ ہو:

مَوتُ العَالِم مَوتُ العَالَم

محفلِ دوشیں کا وہ چراغِ سحر جو کئی سال سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا، بالآخر ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۰ روز جل کر ۱۵ر رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لیے بجھ گیا،

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی   اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یعنی حکیم امّت، مجددِ طریقت، شیخ الکل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرضِ ضعف و اسہال میں کئی ماہ علیل رہ کر ۱۹ اور ۲۰ جولائی کی درمیانی شب کو ۱۰ بجے نماز عشاء کے وقت اس دارِ فانی کو الوداع کہا، اور اپنے لاکھوں معتقدوں اور مریدوں اور مستفیدوں کو غمگین و مہجور چھوڑا، انا للہ وَانا الیہ رَاجعون، اب اس دور کا بالکلیہ خاتمہ ہوگیا، جو حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، مولانا یعقوب صاحب نانوتوی، مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ کی یادگار تھا، اور جس کی ذات میں حضرات چشت اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت سید احمد بریلوی کی نسبتیں یکجا تھیں، جس کا سینہ چشتی ذوق و عشق اور مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی، جس کے قلم نے فقہ و تصوّف کو ایک مدّت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا، اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا اور جس نے اپنی تحریر و تقریر سے حقائق ایمانی، دقائق فقہی، اسرارِ احسانی اور رموزِ حکمتِ ربانی کو برملا فاش کیا تھا اور اسی لیے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا، اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرفِ زمانہ کے لیے یہ خطاب عین حقیقت تھا۔

سوانح:

حضرت کی پیدائش ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو چہار شنبہ کے دن ہوئی، ابتدائی عربی تعلیم تھانہ بھون میں مولانا فتح محمد صاحب تھانوی سے حاصل کی، ۱۲۹۵ھ سے شروع ۱۳۰۱ھ تک مدرسہ دیوبند میں رہ کر مولانا یعقوب صاحب کے حلقہ میں تکمیل کی، فراغت کے بعد ہی ۱۳۰۱ھ میں مدرس ہو کر کانپور آگئے۔ اور چودہ سال یہاں مقیم رہے اور اپنے درس، مواعظ اور فتاویٰ سے

لوگوں کو مستفید کیا۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے سے بہ واسطۂ خط کے غائبانہ بیعت مہاجر الی اللہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے ۱۲۹۹ھ میں ہو چکی تھی، لیکن ۱۳۰۱ھ کے آخر میں ایام حج میں بعد حج حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اخذ فیض فرمایا، اور واپس آکر ۱۳۰۶ھ تک علمی مشاغل، تصنیف و تالیف اور تدریس کے ساتھ ذکر و شغل بھی ضمناً معمول رہا، مگر ۱۳۰۷ھ میں رنگ نے پلٹا کھایا اور یہ رنگ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۳۱۰ھ میں مضطربانہ اور والہانہ حج کا دوبارہ ارادہ کیا اور حضرت حاجی صاحب کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر دوبارہ ایک زمانہ خاص تک رہ کر استفادہ باطنی فرمایا، واپس آکر ۱۳۱۴ھ تک پھر کان پور میں رہے۔ آخر حضرت حاجی صاحب کے مشورے کے مطابق ۱۳۱۵ھ میں کان پور سے ترکِ تعلق فرما کر تھانہ بھون میں متوکلانہ اقامت فرمائی اور اس وقت سے لے کر اخیر وقت تک یعنی اس ۱۳۶۲ھ تک اسی شان سے خانقاہ امدادیہ کی سہ دری میں بیٹھ کر افادہ و افاضہ میں برابر مصروف رہے اور ایک خلق کو اپنی برکات سے بہرہ مند فرمایا، اسی اثنا میں اپنے مواعظ، تصانیف اور ملفوظات سے لاکھوں کو انسان، ہزاروں کو مسلمان، اور سیکڑوں کو متقی کامل بنا دیا اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دعا یا پیشین گوئی پوری ہوئی:

> "بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا، اور آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو از سرِ نو آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے۔"
>
> ۱۲؍ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ

تصانیف:

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف و رسائل کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے، اور کل کی کل تحقیقاتِ علمیہ حقائقِ دقیقہ اور نکاتِ احسانیہ سے لبریز ہیں۔ ان میں تفسیر البیان، شرح مثنوی، فتاویٰ امدادیہ، التعرف الی التصوف، اور بہشتی زیور وغیرہ کتابیں کئی کئی جلدوں میں ہیں، ملفوظات اور مواعظ و خطبات کی تعداد سیکڑوں کی حد تک ہے۔ ان تصانیف میں قرآن پاک کی مشکل آیاتِ کریمہ کی تفسیر، احادیث شریف کی شرح، فقہ کے مشکل مسائل کا جواب،

سلوک و طریقت کے نکتے، اخلاق فضائل و رذائل کی حکیمانہ تحقیق اور ان کے حصول و ازالہ کی تدابیر اور زمانہ حال کے شکوک و شبہات کے جوابات سب کچھ ہیں، تصانیف میں متفرق علوم و مسائل اس کثرت سے ہیں کہ اگر ان سے کسی ایک موضوع کے مباحث کو علاحدہ علاحدہ کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائیں، چناں چہ حضرت کے تربیت یافتوں نے اس، قسم کے بیسیوں مجموعے تیار کیے ہیں۔ سب سے اخیر میں اس قسم کا مجموعہ "بوادر النوادر" کے نام سے ایک ہزار صفحوں میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ خطوط کے جوابات کا جن کے متعلق وفات کے دن تک یہ اہتمام رہا کہ آج کے خط کا جواب کل کے لیے اٹھا نہ رکھا جائے، عظیم الشان دفتر الگ ہے۔

تصنیفات میں بلکہ ہر تحریر میں اہل نظر کو یہ معلوم ہوگا کہ گویا مصنف کے سامنے سارے مسائل و مواد یک جا ہیں اور وہ سب کو اپنی اپنی جگہ احتیاط سے رکھتا جاتا ہے۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ مصنف جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے، اس کو اس میں ایسا غلو ہو جاتا ہے، کہ دوسرے گوشوں سے اُس کو ذہول ہو جاتا ہے۔ حضرت کی تصانیف کی خاص بات یہ ہے کہ قلم ہر ایک کی احتیاط اور رعایت کر کے اور غلو سے بچ کر اس طرح نکلتا ہے کہ جاننے والوں پر حیرت چھا جاتی ہے۔ حضرت کا ترجمہ قرآن پاک تاثیر، سہولت بیان اور وضوح مطالب میں اپنا آپ نظیر ہے۔ بہشتی زیور کہنے کو تو عورتوں کی کتاب ہے، مگر فقہ حنفی کی ضروریات کے لیے انتہائی احتیاط و کاوش کا نتیجہ ہے۔ تفسیر القرآن کو یوں سمجھنا چاہیے کہ روح المعانی اور تفسیر ماسبق کی اردو میں حد درجہ محتاطانہ ترجمان ہے، سلوک و طریقت کی کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔

حضرت کی تجدید طریقت کا بڑا کمال یہ ہے کہ طریقت کو جو ایک زمانہ سے صرف چند رسوم کا مجموعہ ہو کر رہ گئی تھی، زوائد و حواشی سے صاف کر کے قدما اور سلف صالحین کے رنگ پر لے آئے۔

کبھی فرصت سے سُن لینا بڑی ہے داستاں میری

علالتِ طبع :

حضرت کی صحتِ ادھر چند سال سے رو بہ انحطاط تھی، دو دفعہ خاص علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لانا ہوا اور دونوں دفعہ صحت و عافیت کے ساتھ مراجعت ہوئی۔

علالت اصلی یہ تھی کہ معدہ و جگر کا فعل صحیح نہیں رہا تھا۔ علاج سے طبع مبارک اصلاح پذیر ہو جاتی تھی، مگر بالکلیہ ازالہ نہیں ہوتا تھا۔ اس دفعہ دو تین ماہ سے طبیعت پر اضمحلال طاری تھا، چناں چہ علاج کے لیے سہارنپور تشریف لے گئے اور چند روز قیام فرما کر واپس تشریف لے گئے، لیکن طبیعت صاف نہیں ہوئی، وطن میں حکیم سعید صاحب گنگوہی کا علاج شروع ہوا اور ورم جگر و معدہ کا مرض تشخیص ہوا، مگر فائدہ نہ ہوا، اشتہا ساقط تھی، روزانہ اسہال کی تعداد چالیس پچاس تک پہنچ گئی اور ضعف روز بروز بڑھتا گیا، وصال سے قریب بیس روز پہلے حکیم خلیل صاحب سہارنپوری کا علاج شروع ہوا، ضعفِ معدہ اور ضعفِ جگر کی تجویز تھی۔ حکیم صاحب کے علاج سے دستوں میں کمی آ گئی، مگر اشتہا بالکل ہی ساقط تھی اور ضعف میں ترقی ہی ہوتی رہی۔

میری آخری حاضری:

خاکسار جون کے آخر میں اپنے مستقر سے تھانہ بھون اور پھر بھوپال کے ارادے سے روانہ ہوا، لیکن لکھنؤ پہنچ کر دارالعلوم ندوہ کے معاملات نے الجھا لیا۔ لکھنؤ میں ہر روز حضرت کی شدتِ علالت کی اطلاعیں آ رہی تھیں۔ حضرت کے ہزاروں معتقدوں کی طرح خاکسار بھی زیارت کے لیے بے چین تھا۔ حضرت کی طرف سے سخت قدغن تھی کہ باہر لوگوں کو اس شدتِ علالت اور کیفیتِ مزاج کی کوئی اطلاع نہ دی جائے تاکہ مخلصین میں اضطراب نہ پیدا ہو اور وہ سفر کی زحمت نہ اٹھائیں، جو پہنچ جاتے تھے عام طور سے بہ طور تنبیہ ان کو اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اس پر بھی خاکسار خلافِ دستور بے اطلاع ۶ر جولائی کو لکھنؤ سے روانہ ہو گیا، اور ۷ر کی دوپہر کو عین بارش کی حالت میں اسٹیشن سے خانقاہ تک پیادہ پا بھیگتے ہوئے پہنچا۔ دریافت حال سے معلوم ہوا کہ افاقہ کی صورت ہے، جس سے تسکین ہوئی۔ میرا اس طرح خلافِ دستور بے اطلاع اچانک پہنچ جانا حضرت کے لیے تعجب کا موجب ہوا، میری آمد کے خبر دینے والے سے پوچھا: "تم مولوی سلیمان کو پہچانتے بھی ہو یا یونہی کہہ رہے ہو" اس نے اثبات میں جواب دیا تو ارشاد ہوا کہ ان کی عادت بے اطلاع آنے کی نہ تھی۔ حضرت کے عزیز خاص مولانا جمیل احمد صاحب نے عرض کی علالت کی خبر سن کر چلے آئے ہوں گے۔ نماز ظہر کے بعد مجلس میں حاضری ہوئی، ضعف سے بستر پر لیٹے تھے۔ مصافحہ فرمایا۔ خاکسار نے دستِ مبارک کو بوسہ دیا۔ شفقت سے بشاشت ظاہر فرمائی۔ سفر کا حال پوچھا کسی خادم کے ساتھ نہ لینے پر نصیحت فرمائی۔ قیام کے دن پوچھے۔ خاکسار نے بھوپال کے سفر کی ضرورت ظاہر

کی کہ سرکار بھوپال نے اپنی ریاست میں مسلمان عورتوں کے طلاق و تفریق کے مسائل کے طے کرنے کے لیے علما اور اہل قانون کی ایک مجلس مقرر کی ہے، اسی کی شرکت کے لیے مع مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب یہاں سے جانا چاہتا ہوں؛ اس لیے مجلس کی تاریخ کی اطلاع تک یہاں چند روز رہنا چاہتا ہوں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ والیۂ بھوپال پر رحمت فرمائے کہ انھوں نے مسلمان عورتوں کے حال پر رحم کھایا۔ خاکسار نے عرض کی کہ حضرت وہاں اب والیہ نہیں، والی ہیں۔ فرمایا، ٹھیک ہے۔ عرض اس حالت میں بھی کہ ضعف پوری شدت پر تھا، تکلم میں تکلیف تھا، پھر بھی حاضرینِ مجلس پر شفقت فرما کر ملفوظات سے ذرا، تھم تھم کر بہرہ ور فرما رہے تھے، اور لوگوں کے آئے ہوئے خطوط سُن رہے تھے، اور بہ دستور جواب لکھوا رہے تھے، بلکہ بعض بعض خطوط پر خود دستِ مبارک سے بھی لکھ دیتے تھے۔ کبھی جو قوت پاتے اور اس وقت کام کرنے لگتے، یا ملفوظات ارشاد فرمانے لگتے، تو تھوڑی دیر کے لیے حاضرین کو یہ خیال ہونے لگتا کہ حضرت بیمار ہی نہیں، مگر ادھر جوشِ بیان کم ہوا اور اُدھر سر تکیہ پر رکھ دیا، ہمیشہ کی عادت یہ تھی کہ بڑا تکیہ پیٹھ سے لگا کر سر کو بے سہارے اونچا رکھتے تھے۔ یہی حال اس وقت بھی تھا، دیکھنے والوں کو تکلیف معلوم ہوتی اور اس مشورے کو جی چاہتا تھا کہ دُوسرا تکیہ اور رکھ کر اس پر حضرت سر مبارک کو رکھ لیں، چناں چہ میں نے اس سلسلے میں یہ عرض کیا تو ارشاد ہوا نہیں، اس کی حاجت نہیں۔ بعد کو خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولس یوپی جو حضرت کے خلیفۂ خاص، محرمِ خاص بلکہ خادمِ خاص ہیں) نے فرمایا کہ حضرت کی ہمیشہ کی عادت یہی ہے، اس ضعف و اضمحلال کی حالت میں بھی مجلس کا وقار، نظم و ضبط، اور اصول و قواعد کی پابندی بدستور جاری تھی اور اخیر لمحۂ حیات تک اس میں فرق نہیں آیا۔

عصر کے وقت مجلس برخاست ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ کھانے کے الگ انتظام کی ضرورت نہیں۔ چند روز کے مہمانوں کے لیے اس کی ضرورت نہیں، بڑے گھر سے کھانا جائے گا، اور ایک خادمِ خاص کو اس کی ہدایت فرمائی۔ اس ناسزاوار کے لیے تو یہ خیر و برکت کا سامان تھا، یہ بھی ارشاد ہوا کہ جب چاہو اور جس وقت چاہو آ سکتے ہو، کوئی قید نہیں، یہاں سے اُٹھ کر جب خانقاہ پہنچا تو بعد نماز حضرت والا کی طرف سے حضرت کی اخیر تصنیف بوادر النوادر کا ایک نسخہ مولانا جمیل احمد صاحب نے ہدیہ لا کر عنایت فرمایا اور یہ ارشاد سامی پہنچایا کہ میرے مضامین

سے اقتباسات جمع کر کے شائع کرو۔ اس حکم کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا نسخہ سمجھ کر اپنی سعادت کا اظہار کیا۔ دوسرے دن حاضری کے موقع پر حضرت نے اپنی زبانِ مبارک سے خود یہ ارشاد فرمانا چاہا تو خاکسار نے حضرت کی زحمت تکلم کے خیال سے عرض کیا کہ یہ ارشاد مبارک مولانا جمیل احمد صاحب کے ذریعے پہنچ چکا۔ مگر وہاں سے اُٹھنے کے بعد مولانا جمیل صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ حضرت کا مقصود کیا ہے، یعنی اس کتاب بوادر سے اقتباس یا عام کتابوں سے ؟! انھوں نے فرمایا اس کو میں نے اچھی طرح خود بھی نہیں سمجھا، بعد کی حاضری میں موقع پا کر میں نے تفصیل چاہی تو ارشاد ہوا نہیں، عام کتابوں میں جو مضمون مفید نظر آئیں، ان کو یک جا کر لیا کرو۔

آخری حالات:

میری حاضری ۷؍ جولائی سے ۱۱؍ جولائی کی دوپہر تک رہی۔ اشتہاء کا سقوط اور ضعف کا استیلاء اپنی حالت پر رہا۔ دست پانچ، چھ، سات تک آتے رہے۔ مزید یہ کہ ہاتھوں اور پاؤں پر ورم تھا، ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کے ناخنوں میں نیلاہٹ نمودار ہو گئی تھی جو باعثِ تشویش تھی، دو روز کے بعد اس میں کمی آگئی، مگر وفات کے چند روز پیش تر وہ پھر عود کر آئی تھی۔

خدمت اور خاص کر رات کی وقت بہ نوبت جاگ کر خدمت کی سعادت خدام خاص کی قسمت میں آئی، جن میں پہلا درجہ خواجہ صاحب کا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا جمیل احمد صاحب، بندو میاں (ملازم نواب صاحب باغپت) اور مولوی شبلی صاحب جونپوری نے اس خدمت خاص کی سعادت اخیر تک پائی۔ بعد کو مولانا ظفر احمد صاحب بھی ڈھاکہ سے آکر اس میں شامل ہو گئے۔

حاضری کے دوسرے یا تیسرے دن استفسار ہوا کہ کھانا تو مزاج کے موافق ہوتا ہے! عرض کی کہ بالکل مطابق ہے۔ کس تواضع اور کس شفقت اور کس بلاغت سے ارشاد ہوا کہ میں معافی کا خواستگار نہیں مستحق ہوں۔ اس تمنا پر اہل ذوق نے تحسین کی سعادت پائی کہ ضعف و نقاہت کے اس عالم میں بھی دل و دماغ ناقصوں کی تربیت میں مصروف ہیں اور اکرام ضیف کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔

دو تین واقعے ذکر کے قابل ہیں، اسی اثنائے حاضری میں بنگال سے ایک معتقد با اخلاص

کا خط آیا، جس میں لکھا تھا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب نبیؐ کی وفات کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اختیار دیتے ہیں کہ خواہ وہ دنیا میں رہنا پسند کرے یا اللہ تعالیٰ کے یہاں جانا یہ تمہید لکھ کر اس میں تھا کہ میرے اعتقاد میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متبعین خاص کو بھی اس اختیار خاص سے حسبِ استعداد حصہ ملتا ہوگا، اس لیے عرض ہے کہ ہم ناقصوں کی تربیت کے لیے حضرت والا چند روز اور اس دنیا میں قیام منظور فرمائیں" خط کے جواب میں لکھوا دیا "تم اپنے دماغ کا کسی حاذق طبیب سے علاج کراؤ" پھر حاضرین سے خطاب کر کے فرمایا "اوّل تو یہ ثابت نہیں کہ جو انبیا (علیہم السلام) کو ملتا ہے، اس میں اولیا و مشائخ کو بھی حصہ ضرور ہی ملتا ہے" اور اس کے بعد فرمایا "اور اگر ایسا بھی ہو تو انبیا نے کیا کیا؟ (یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب ہی کو حیات دنیا پر ترجیح دی).

ایک دفعہ بعد ظہر خط لکھوا کر فارغ ہو چکے تھے کہ اونگھ آ گئی۔ ہشیار ہوئے تو فرمایا کہ ایسا معلوم ہوا کہ اس تخت پر ایک لفافہ رکھا ہے جس پر عبدالعزیز لکھا ہے۔ خواجہ صاحب نے عرض کی ابھی حضرت نے خطوط لکھوائے ہیں وہی خیال قائم رہا۔ ارشاد ہوا ہاں یہ سچ ہے، مگر عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کی عمر کیا تھی؟ میں نے کہا اسّی بیاسی برس یاد آتا ہے (اب دارالمصنفین آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی عمر شریف اکاسی برس کے قریب یعنی اسّی برس کچھ مہینے ہوئی ہے۔ بہرحال اس سے خواجہ صاحب کی نکتہ شناس نظر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تشابہ حال پر پہنچ گئی،

ہر چند یہ تاکید تھی کہ شدتِ علالت کی اطلاع باہر کسی کو نہ دی جائے، احباب اشارات و تلمیحات اور اصطلاحات میں اپنے متعلقین اور دوستوں کو اطلاع دیتے تھے۔ غرض یہ تھی کہ زائرین ہجوم نہ کریں۔ اس پر بھی دور دور سے معتقدین آ جاتے تھے۔ ایک صاحب نے پشاور سے آنے کی اطلاع کرائی، دوسرے نے گورکھپور سے، کسی نے کسی اور دور مقام سے، مگر ہر ایک سے یہی ارشاد ہوا کہ اجازت نامہ کہاں ہے۔ جب وہ معذوری ظاہر کرتے اور اعترافِ تصور کرتے تو فرماتے تمہاری غلطی کا خمیازہ میں کیوں اٹھاؤں، پھر حاضرین کی طرف خطاب کر کے فرمایا ان کو میں محروم کر کے بھی محروم نہیں کرتا ہوں، ایک سبق دے رہا ہوں، پھر اسی معنی کا خواجہ صاحب کا ایک مصرع پڑھا، پھر ارشاد فرمایا کہ ان کے ناکام واپس جانے کا یہ اثر ہوگا کہ اس کو سن کر دوسرے لوگ آنے سے رک جائیں گے، اور اس سے ان کو فائدہ پہنچے گا۔ غرض یہ

تھی کہ لوگ اس بیکار کی زحمت اور تکلیف سے خود بھی بچیں اور حضرت کو بھی ہجوم سے بچائیں۔

ایک روز بعد مغرب یاد فرمایا اور مشورہ چاہا کہ اشتہا مطلق نہیں اور ضعف بڑھ رہا ہے، گو میں اس کے نتیجے پر راضی ہوں، مگر بہر حال اگر اس کی تدبیر کوئی ضروری ہو تو کرنا چاہیے" اس اثنا میں خیال ظاہر فرمایا کہ لکھنؤ میں ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب (ناظم ندوہ) کو (جو مزاج شناس تھے) لکھا جائے کہ صرف اشتہا پیدا ہونے کے لیے کوئی نسخہ تجویز کریں۔ خاکسار نے عرض کی کہ حضرت چار روز خط کے جانے میں اور چار روز آنے میں لگیں گے، اتنی دیر بہت ہے بہتر رائے ہوئی کہ سہارن پور میں کوئی اچھا ڈاکٹر ہو تو بلایا جائے۔ مگر دوسرے ہی دن مولوی محمد حسن صاحب اور دوسرے احبابِ لکھنؤ کا خط آیا کہ حکیم عبد المجید صاحب لکھنوی جن کے علاج سے پہلے بھی فائدہ ہو چکا تھا، اگر اجازت ہو تو ان کو لے کر حاضر ہوں، چناں چہ اجازت کا خط لکھا گیا۔

طالبین کے خطوط بدستور آ رہے تھے، لوگ حسبِ دستور ہدایا منی آرڈر سے بھیج رہے تھے، مگر شدتِ احتیاط بدستور قائم تھی اور وہ واپس ہو رہے تھے، مگر اخلاص و محبت کے سرمایہ کو بہت خوشی سے قبول فرما لیتے تھے، ایک قریب کے نواب صاحب کی ایک رقم آئی تو قبول فرما کر ارشاد ہوا کہ ان لوگوں کا ممنون ہوں کہ وہ دے کر اُلٹے خود ممنون ہوتے ہیں کہ اس نے (اپنی ذات کی طرف اشارہ) قبول کیا، ایک غریب نے کچھ پیش کیا تو اللہ اکبر اس کو آنکھوں سے لگایا،

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

حضرت گو ضبط، صبر، اور استقامت سے اپنی تکالیف ظاہر نہیں فرماتے تھے، اور نہ آیندہ کے خطرے کو زبان پر لاتے تھے کہ دوسروں کو بے صبری نہ ہو۔ مگر بات بات سے سفر کی آمادگی ظاہر ہوتی تھی۔ گو ان کی زندگی اور طرزِ زندگی جس صفائی، پاکیزگی اور باقاعدگی کی عادی تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ وقتِ اخیر کے لیے کوئی کام اٹھا نہیں رکھا، کہ سالکِ کامل ہر لمحے کو لمحۂ اخیر سمجھتا ہے اور اسی کی تیاری رکھتا ہے، یہی حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، کوئی چیز کرنی باقی نہ تھی، تمام انتظامات، حساب و کتاب اور وصایا سے پوری پوری فراغت تھی۔ عادت شریف تھی کہ آج کا کام کبھی کل پر اٹھا کر نہیں رکھا، گویا ہر وقت آمادۂ سفر تھے۔

خاکسار کو بھوپال کی مجلس کی تاریخ ۹ ر کو تار سے معلوم ہو چکی تھی، ۱۰ ر کو رفیقِ سفر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا بھی مکرمت نامہ آگیا، ۱۱ ر کی صبح کی مجلس کے بعد رخصت کی درخواست پیش کی، باایں ہمہ ضعف و قوت لیٹے ہی لیٹے دونوں ہاتھ رخصت کے لیے بڑھائے۔ حقیر نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور آنکھوں کو ملا۔ آہ! کس بلا کا رخصتانہ تھا، فرمایا "جاؤ خدا کے سپرد کیا" یہ لفظ کانوں سے پہلے نہیں سنے تھے، آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور دیر تک چہرۂ مبارک پر جمی رہیں، کہ یہ جمالِ جہاں آرا شاید پھر دیکھنے کو نہ ملے، سو ایسا ہی ہوا،

بعد کے اخیر حالات:

خاکسار کے جانے کے دو ایک روز کے بعد حکیم عبدالمجید صاحب تشریف لے آئے اور علاج اپنے ہاتھ میں لیا۔ پہلے روز عرق دانہ انار دیا، دوسرے روز ایک بٹیر کی یخنی دلوائی تیسرے روز دو بٹیروں کی، مگر حکیموں کی ہر مسیحائی تدبیر محکمۂ تقدیر سے رد ہوتی رہی، حکیم صاحب کا ایک ہفتہ علاج رہا، مگر حالت میں تغیر نہیں ہوا، میں نے بھوپال سے مولانا جمیل احمد صاحب کو طلب خیریت کا خط لکھا، جس کے جواب میں دوشنبہ کے روز یعنی جس کی آنے والی شب میں وفات ہوئی، یہ تحریر فرمایا،

> "حکیم عبدالمجید صاحب آئے تھے، ہفتہ پورا کر کے کل واپس جا رہے ہیں۔ حکیم مسیح اللہ (حضرت کے خلیفہ حق داد خاں صاحب لکھنوی کے صاحبزادہ) رہیں گے۔ علاج ان ہی دونوں کا ہے۔ افاقہ کی صورت نہیں، دست بہت ہیں، ضعف بے حد ہے، سانس میں تکلیف ہے، بائیں پاؤں میں کل سے سخت درد ہے، ہم سب پریشان ہیں۔ (جمیل احمد، دوشنبہ)

لکھنؤ میں ثقات سے جو حاضر تھے، معلوم ہوا کہ دوشنبہ کے روز دست زیادہ آئے، ظہر کے بعد ضعف زیادہ محسوس ہوا، عصر کے بعد مولانا شبیر علی صاحب کو جو حضرت کے بھتیجے اور تمام امور خانقاہ و مدرسہ کے مہتم و متولی تھے، یاد فرمایا۔ اطلاع دی گئی کہ وہ سہارنپور دوا لینے گئے ہیں۔ محلِ خورد سے فرمایا کہ امانتوں کا صندوقچہ اٹھا لو، (امانتیں وہ رقمیں تھیں جن کو اہل خیر حضرت کو وکیل بنا کر کارِ خیر کے لیے بھیجتے تھے) مختلف تھیلیاں مد وار ہوتی تھیں، ایک تھیلی میں بی بی صاحبہ نے عرض کیا کہ پانچ روپے ہیں۔ فرمایا، چھ ہوں گے، چناں چہ ہاتھ

ڈالا تو ایک روپیہ کا نوٹ اور نکلا۔ ارشاد فرمایا کہ یہ کل رقمیں ان کے مالکوں کو واپس کر دی جائیں۔ یہ اس مسئلہ شرعی پر عمل تھا کہ وکیل یا موکل کی موت کے بعد وکالت ختم ہو جاتی ہے اور ملک، مالک کے تصرف میں واپس جانی چاہیے۔ مولانا ظفر احمد صاحب کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک کاغذ پر یہ بشارت نامہ لکھ کر وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ دیا (خاکسار کو بعد کو مولانا ظفر احمد صاحب کے والا نامہ سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ وفات سے دو دن پہلے کا ہے)

مغرب کے بعد حالت اور زیادہ نازک ہوئی، سانس کی تنگی محسوس تھی، مولانا ظفر احمد صاحب نے ڈھاکہ واپس جا کر لکھا:

> "آپ تھانہ بھون سے بھوپال گئے اور یہاں سخت بھونچال آگیا کہ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ نے دار البقا کی طرف ارتحال فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون،
>
> کادت لھا شم الجبال تزول
>
> یہ ناچیز اخیر وقت تک حاضر خدمت رہا۔ دل پر پتھر رکھ کر بیٹھا رہا قلب اطہر کی طرف متوجہ رہا، تشنگی رفع کرنے کے لیے آب زمزم دیتا رہا۔ یہاں تک کہ آخری سانس میرے سامنے ختم ہوا، یٰسین اور کلمہ کی تلقین کرتا رہا، غسل بھی دیا، نماز بھی پڑھائی۔"

رات کے دس بجے تھے کہ عشاء کی نماز کے لیے خدام قریب کی حوض کی مسجد میں گئے، کہ اسی اثنا میں وہ دم آگیا جس دم کے لیے ہر دم تیاری رہتی تھی، اور ودیعۂ حیات کی آخری سانس اس دنیا میں لے کر واصل بحق ہوئے۔ اللھم انزل علیہ شآبیب رحمتک وارفع درجتہ وارزقنا من برکاتہٖ۔

اس وقت خدام خاص کی کیفیت خیال کے قابل ہے، جو ایک طرف اپنے محبوب کے فراق میں بے قرار تھے اور دوسری طرف مقام صبر و رضا کی تعلیم سے بہرہ ور تھے اور حق تھا کہ حضرت سرور انبیاء سید الرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع میں وہ کہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے محبوب فرزند ابراہیم کی وفات کے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ "اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے غمگین ہیں، لیکن زبان سے ہم وہ ہی کہیں گے جس میں ہمارے پروردگار کی رضامندی ہو" تاکہ محبت اور تسلیم و رضا دونوں کا حق ادا ہو۔

تجہیز و تکفین کے متعلق یہی فیصلہ ہوا کہ صبح کو ہو، صبح کے وقت خبر کے لیے دو آدمی سہارنپور بھیجے گئے، ایک مدرسہ مظاہر العلوم میں جس سے حضرت کو بہت روحانی تعلق تھا، اور دوسرا سہارن پور کے احباب کے پاس۔ اس صبح کی جانیوالی اور آنے والی گاڑیوں میں آدھ ہی گھنٹے کا فصل ہوتا ہے، اس لیے جو لوگ سننے کے ساتھ جس حال میں تھے اسی حال میں چل پڑے، وہ تو پہلی گاڑی سے روانہ ہو سکے، مگر اس کے بعد بھی سیکڑوں آدمی اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ چناں چہ دوسری اسپیشل ٹرین چھوڑی گئی، اور قریب ڈیڑھ ہزار آدمی کے جنازہ کے وقت تک پہنچ سکے۔

حضرت نے ہر چیز کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا، یعنی ایک زمین لے کر اس کو تکیہ یا قبرستان خاص بنا کر وقف کر دیا تھا۔ ایک مختصر سے احاطہ کے اندر ایک زمین گھیر دی گئی تھی، جس میں کچھ درخت بھی لگا دیے گئے تھے، چھوٹی سی مسجد اور ایک مختصر سا سائبان بھی اس میں ہے، اسی میں دوسرے اعزہ اور خدام بھی آسودہ ہیں، اسی کے بیچ میں اس مرحوم کی استراحتِ ابدی کے لیے زمین چنی گئی۔

جنازے کی نماز کے لیے مولانا شبیر علی صاحب نے مولانا ظفر احمد صاحب کو اشارہ کیا، مجھے معلوم ہوا کہ پہلے تو مولانا ظفر احمد صاحب نے تواضع کرنا چاہا مگر انھیں اپنا خواب یاد آیا تو آگے بڑھ گئے، اور نماز جنازہ ادا کی۔ میں نے سنا کہ مولانا ظفر احمد صاحب ڈھاکہ میں تھے، اور حضرت کی شدتِ علالت کی خبریں جا رہی تھیں، اور گھر سے آنے کے لیے شدید تقاضا بھی ہو رہا تھا، تو انھوں نے خواب دیکھا کہ وہ تھانہ بھون پہنچے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ایک نماز پڑھانے والا آگیا۔

یہ واقعات تھانہ بھون میں ۱۹ر اور ۲۰ر جولائی کو پیش آئے۔ مگر باہر والوں کو اطلاع دو دن بعد ملی۔ دہلی میں ۲۱ر کو اور لکھنؤ میں ۲۲ر کو مذہبی حلقوں میں اور عربی مدرسوں میں سناٹا چھا گیا۔

خاکسار اب تک بھوپال میں تھا، عنایت الٰہی دیکھیے کہ عین شب وصال کو خواب دیکھا کہ مولانا شبیر علی صاحب مجھ سے فرما رہے ہیں کہ حضرت مولانا کو پوری صحت ہو گئی۔ صبح اٹھ کر میں نے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے یہ خواب بیان کیا۔ وہ سن کر چپ رہے۔ مفتی صاحب ۲۱ر جولائی کو اور خاکسار ۲۲ر جولائی کو بھوپال سے روانہ ہوئے۔ میں ۲۳ر کی

دوپہر کو لکھنؤ پہنچا، اور ندوہ آیا، حادثے سے بالکل بے خبر تھا۔ مدرسہ پہنچنے کے ساتھ میرے بچّہ سلمان سلمہٗ نے سب سے پہلے خبر دی، اور اتفاق دیکھیے کہ بھوپال سے خط تو میں نے خیر خیریت کے لیے مولانا جمیل احمد کو لکھا تھا، چناں چہ انھوں نے دوشنبے کے روز شدّتِ علالت اور مایوسی کی اطلاع لکھی اور اس کی دوسری طرف بلا توقع مولانا شبیر علی صاحب کے قلم کی عبارت یہ تھی۔

حضرت مخدوم معظم دام ظلکم العالی، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ، بعد تحریر خط ہٰذا ۱۹، ۲۰ ؍جولائی کی درمیانی شب میں حضرت والا کا وصال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون بجز اطلاع کے اور کیا عرض کرسکتا ہوں، کیوں کہ الفاظ اظہار کے لیے نہیں ملتے،

مصیبت زدہ شبیر علی عفی عنہ از تھانہ بھون

۲۴ ؍ کو سہارن پور اور دہلی سے مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارن پور اور مولانا الیاس صاحب کاندھلوی لکھنؤ دار العلوم میں آئے، تو مزید اطلاعات اور تفصیلات معلوم ہوئیں۔ ۲۶ ؍جولائی کا لکھا ہوا مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا غم نامہ ملا،

مکرم محترم دامت معالیہم!

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ امید ہے کہ اب آپ بھوپال سے واپس آگئے ہوں گے، میں نے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا تھانوی کے وصال کی خبر سنی، آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ فوراً یاد آیا کہ جس شب کو مولانا نے دنیا کو چھوڑا، یعنی دوشنبہ کی درمیانی شب، اسی رات کی صبح کو جناب نے بھوپال میں مجھ سے ذکر کیا تھا کہ آپ نے مولوی شبیر علی صاحب کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہہ رہے ہیں حضرت مولانا بالکل صحت یاب ہوگئے۔ آپ کا خواب سچا ہوا۔ مولانا نے دنیاوی تکالیف سے بالکل صحت پائی اور رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً واسکنہ الفردوس الاعلیٰ، ہندوستان ایک حکیم الامت مجدد الملۃ سے محروم ہوگیا"

حضرت کے ایک خلیفہ نے جن کو صدقِ رؤیا کی نعمت ملی ہے، وصال کی دوسری یا تیسری شب کو خواب میں دیکھا کہ حضرت فرما رہے ہیں کہ میرے فیوض اب بھی جاری رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے مقامِ شہداء (فرمایا یا مقامِ شہود) عطا فرمایا۔ حضرت نے اسہال کے مرض سے وفات

فرمائی اور حدیث نبوی ہے والمبطون شہید، (پیٹ کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے)

مجھ سے مولوی محمد حسن صاحب کاکوروی (علیگ) مالک انوار المطابع لکھنؤ نے۔ جو حضرت کے خدام قدیم میں سے ہیں بیان کیا، اور انھوں نے خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری بی، اے (علیگ) سے سنا ان کو چھوٹی پیرانی صاحبہ سے معلوم ہوا (خواجہ صاحب کی اہلیہ بھی ساتھ تھیں) کہ جس وقت روحِ مبارک پرواز کر رہی تھی حضرت کے داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کے بیچ میں ایک نگینہ سا چمکتا معلوم ہوتا تھا، جس کو انھوں نے دیکھا اور دوسری عورتوں نے بھی دیکھا" محرم خاص حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا کہ چوں کہ جو نورِ ہدایت حضرت کے ذریعے پھیلا وہ زیادہ تر ان کی انگلیوں یعنی تصنیفات کے ذریعہ سے پھیلا، اس لیے وہ نور انگلیوں ہی کے درمیان متمثل ہو کر نظر آیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت کے بہت سے محبین کی طرح ایک محب خاص مولانا مسعود علی صاحب ندوی کو اس عقیدت و عظمت کی بنا پر جو اُن کے دل میں تھی حضرت کی مغفرت کے لیے دعا مانگنے میں دلی کشمکش محسوس ہوتی تھی۔ انھوں نے خواب دیکھا کہ وہ خانقاہ تھانہ بھون میں حاضر ہیں کہ دفعۃً حضرت تشریف لے آئے اور ان سے فرمایا کہ میری صحت کے لیے دعا مانگا کرو:

حل این نکتہ ہم از روے نگار آخر شد

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ایک کامل زندگی کو جو کمالِ زہد و ورع، کمالِ اتباعِ شرع، کمالِ اتباعِ سنت کے ساتھ تھی، اس زمانے میں نمونہ کے لیے پیدا کیا، وہ آئی اور ساٹھ برس کے مجاہدہ کا نمونہ دکھا کر واپس گئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وادخلہ اعلیٰ علیین وصلی اللہ تعالیٰ علی النبی الامین وآلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(یادِ رفتگاں)

علامہ امتیاز علی خاں عرشی (رام پور)

۷۹

اعظم گڑھ

محترمی دام لطفۂ! السلام علیکم۔

آپ کا مضمون[1] مارچ میں نہ آسکا۔ شاید اپریل میں آئے۔ پرچہ چھپنے کے بعد آپ کے پاس بھی جائے گا۔ مہربانی فرماکر آپ اپنا پورا نام لکھیے۔

فروری ۲۹ء کے معارف میں جس مضمون سے آپ کو اختلاف ہے کیا اس کے خلاف کچھ واقعاتی دلائل آپ کے پاس ہیں۔ اگر ہوں تو مطلع فرمایئے۔

سیدنا عمر فاروق رضؓ کے مکاتبات و خطبات جمع کیجیے۔ کنز العمال، موطا امام مالک، مسند دارمی تو مطبوعہ ہیں باقی مصنف عبدالرزاق اور مصنّف ابن ابی شیبہ قلمی باقی صحاح و سنن و مسانید تو موجود ہی ہیں۔ علاوہ ازیں طبری اور بلاذری بھی ملاحظہ ہو۔

۲۲، مارچ سنہ ۳۰ء　　　　سید سلیمان

۸۰

دفتر دار المصنّفین اعظم گڑھ

مکرم السّلام علیکم!

دو ہفتوں سے زیادہ ہوا کہ آپ سے کتاب خانے کی دو کتابوں کے متعلق دریافت کیا تھا کہ ان کا موضوع کیا ہے۔ مگر ہنوز جواب سے محروم رہا وہ کتابیں فن ریاضی عربی زیر ع ۶۳ دیکھیے۔ فہرست کتب خانہ جلد اول ع ۴۱۶ عنہ ۶۰ کے بعد اور ع ۵۵۔

اب یہ التماس ہے کہ آیا ہوں کہ فن متفرق میں عنہ ۷ کے ساتھ صفحہ ۸۰ پر رسالہ فی الوجود فارسی کا نام ہے اس رسالے کی چند ابتدائی اور چند آخری سطریں عنایت فرمائیں ممنون ہوں گا۔

---

[1] عرشی صاحب نے عمر خیام کا ایک نادر نسخہ دریافت کیا تھا۔ اس پر مضمون معارف کے شمارہ بابت ماہ اکتوبر تا دسمبر سنہ ۳۰ء۔

پہلا خط کتب خانے کے پتے سے بھیجا تھا اب آپ کے محلے کے پتے سے بھیجتا ہوں۔ شاید یہ فال نیک ثابت ہو۔

۲۰ر جنوری ۱۹۳۳ء سید سلیمان

(۸۱)

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

مکرم وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ!

مکرمت نامہ کا شکریہ، آپ کی امداد نے بے حد فائدہ پہنچایا اور مجھے ایک مغالطے سے محفوظ رکھا گیا اگر میں اپنی کتاب میں آپ کی اس امداد کا شکریہ ادا کروں تو کیا ریاستی پالیٹکس کے خلاف تو نہ ہوگا۔

کیا کتاب خانے میں کوئی قدیم کرہ یا اصطرلاب ہے؟ اگر ہے تو اس پر اس کے صانع کا نام ہے؟ اگر ہے تو نام والی پوری عبارت حرف بحرف مع تاریخ نقل فرما کر بھیج دیجیے۔

تفسیر سفیان پر اگر آپ کچھ لکھ سکتے ہوں تو لکھیے۔ بیاض صائب پر آپ کی تحریر کا انتظار رہا۔ والسلام

۱۲ر فروری ۱۹۳۳ء سید سلیمان

(۸۲)

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

محترم وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ!

میں یہاں نہ تھا اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔ مرقع بڑا دلچسپ ہے کیا تصویروں کی صورت اور لباس سے ہندو مسلم کا فرق نمایاں نہیں ہوتا؟ میں کچھ فیصلہ نہیں کرسکتا۔ میرے علم میں کوئی ایسا واقعہ جس سے اس مرقع کا معما حل ہوسکے، نہیں ہے۔

برادرم حاجی معین الدین صاحب ندوی رامپور میں مہتمم تالیفات ہیں۔ میں اس عہدہ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ نہ انھوں نے خود لکھا وہ ان باتوں میں مست ہیں۔ بارے آپ نے مضمون کو بھیجا ہے۔ اگر آپ اس نئی چیز کی تفصیل بتا سکیں تو مہربانی کہ کیا عہدہ ہے کیا تنخواہ ہے کس کی ماتحتی ہے، کتنے دنوں کی جگہ ہے؟

آپ رامپور آنے کی پُر اصرار دعوت نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ رامپور کے کتب خانہ سے محروم رہ جاتا ہوں۔ والسلام

۲۰ ؍ جون ۳۳ء

سیّد سلیمان

میرا نوٹ متعلق کتب خانہ رامپور آپ کے وزیروں کی نظر سے بھی گزرا؟ یا یہ تیر یوں ہی اچٹ کر رہ گیا۔ سلیمان

(۸۳)

دارالمصنفین اعظم گڑھ

مکرم سلام مسنون!

ایک صفحہ کا مضمون پہنچا۔ عبادت کا مطلب آپ نے صحیح سمجھا عربی طباعت کا آغاز سولھویں صدی سے شروع ہوا ہے۔ ۱۵۹۲ء میں رومہ میں قانون شیخ طبع ہوا تھا۔ پبلک لائبریری کے لیے فہرست کتب مرسل ہے اس کے ساتھ یہی رعایت ممکن ہے کہ قیمت میں تاجرانہ کمیشن ۲۵ فی صد دیا جائے۔ اس کے متعلق مولوی مسعود علی صاحب ندوی مینجر دارالمصنفین کو لکھیے۔

میں شاید ۱۸-۲۰ ؍ اکتوبر کو بجنور ایک دوست کے اصرار پر جا رہا ہوں۔ فرمایئے تو حاضر ہوں "اردو ادب پر نواب خلد آشیاں کے دربار کا اثر" اچھا موضوع ہے مگر شرط یہ ہے کہ طبیعت حاضر ہو۔ والسلام

۷ ؍ اکتوبر ۱۹۳۴ء

سیّد سلیمان

(۸۴)

مکرم السلام علیکم!

عنایت نامہ ملا۔ میں نے علی گڑھ کے پچھلے سفر میں رام پور آنے کی اجازت چاہی تھی آپ کا خط میری روانگی کے بعد آیا۔ اور واپسی پر ملا۔ افسوس ہوا۔ اب دوبارہ عرض ہے کہ ۲۵ ؍ کو پھر علی گڑھ پہنچنا ہے۔ کورٹ کا اجلاس ہے۔ میں ۲۷ ؍ کو یا شاید ۲۸ ؍ ہی کو رام پور آسکتا ہوں۔ مہربانی کر کے اس پتے سے خط کا جواب دیجیے۔ بتوسط مولانا ابوبکر صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

حاجی معین الدین صاحب[1] تو روانہ ہو گئے شہر خود روم و شہر یار خود باشم۔ اب ان کی جگہ پر کیا انتظام ہوا ایک صاحب جو میرے پیش نظر ہیں کیا موقع ہے؟ آپ کا مضمون دسمبر میں جا رہا ہے۔

۱۷؍ نومبر ۳۴ء   سیّد سلیمان

۸۵

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
مکرم السلام علیکم۔

عنایت نامہ ملا۔ نوازش کا شکریہ میرا ارادہ مصمم تھا۔ کہ حاضر ہوں مگر افسوس کہ یہاں اگر بیمار ہو گیا۔ ۴۸ گھنٹے کے فاقہ کے بعد آج کھچڑی ملی ہے اور کوئی وقت مناسب رامپور پہنچنے یا یہاں سے روانہ ہونے کا نہیں ملتا اس لیے بصد افسوس اس وقت سفر رامپور کو ملتوی کرتا ہوں اور آپ سے معذرت کرتا ہوں۔ عرفت ربی بفسخ العزائم یار زندہ صحبت باقی۔

والسّلام

۲۶؍ نومبر ۱۹۳۴ء   سیّد سلیمان

۸۶

دار المصنفین اعظم گڑھ
مکرم السلام علیکم۔

آپ کے مجھ پر طرح طرح کے الزام   ہوں گے۔ اور کم از کم بے اعتنائی اور بے رخی کی تہمت تو مجھ پر قدرۃً قائم ہونی چاہیے گو میرا دامن اس سے بری ہے حاشا۔

آپ کا پنجاب والا خط میرے پنجاب سے واپس آنے کے بعد اعظم گڑھ واپس ہو کر ملا۔ میری نیت ہمیشہ درست لیکن ارادہ ہمیشہ غلط ہوتا ہے اور اس ارادے کی غلطی کے سبب سے ہمیشہ ندامت ہوتی ہے۔ ارادے کی غلطی کے معنی یہ ہیں کہ صحت کی خرابی کے سبب سے اکثر سفروں میں بیمار ہو جاتا ہوں۔ اور واپسی میں فسخ ارادہ کرنا ہوتا ہے کتب خانہ رام پور

---

(۱) مولانا حاجی معین الدین ندوی مصنف خلفائے راشدین و دیگر کتب، دار المصنفین میں رفیق علمی تھے۔ کتب خانہ ندوۃ العلماء کی ترتیب کے لیے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ بعدہ بہار

بقیہ اگلے صفحے پر

کی زیارت کس کو آپ کی طرف نہ کھینچے گی۔ لیکن مجھے یقین آگیا ہے کہ ضمنی سفر کے بجائے جب تک وہاں کے لیے مستقل سفر کی نیت نہ کی جائے گی، شگون ٹھیک نہ ہوگا۔

امید ہے کہ ۳۵ء میں اگر زندہ رہا تو اپنے شوق کی تسکین اور آپ کے حکم کی تعمیل اسی سال کروں گا۔ عرفت ربی بفسخ العزائم کا فقرہ نہیں پڑھتا۔ والسلام

سید سلیمان

۱۹ مئی ۳۵ء

ساغر نظامی

(۸۷)

محترم دام لطفہٗ۔ السلام علیکم

والا نامہ اور صبوحی کا شکریہ۔ صبوحی کے چند جام پیے۔ اس کے اشعار بلند اور قابلِ داد ہیں۔ جن سے آپ کی شاعرانہ بلند پروازی ظاہر ہوتی ہے۔

آپ کا ایک خاص رنگ ہے اور وہ عام شاہراہ سے الگ ہے۔ والسلام

سید سلیمان

۱۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء

گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ

امپیریل لائبریری کلکتہ، خدا بخش لائبریری بانکی پور (پٹنہ)، دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن میں خدمات انجام دیں۔ آخر میں بہار کی مشہور درس گاہ "مدرسہ شمس الہدیٰ (پٹنہ)" کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ ۲۔ مئی ۱۹۴۱ء کو وفات پائی۔ سید سلیمان ندوی نے معارف اعظم گڑھ بابت ماہ مئی ۱۹۴۱ء میں ان کی وفات کا ماتم کیا ہے۔

اثرِ صہبائی

۴۴

صہبائیِ من! شاد باد، زندہ باد

کل آپ کا خط ملا پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ انسانوں کی کمی نہیں، انسانیت کی کمی ہے۔ آپ کے خط سے آپ کے بلند اخلاق، متواضع خو اور متین طبیعت کا اندازہ ہوا۔ آپ میرے الفاظ سے مایوس نہ ہوں۔ ترقی اور کمال ایسے ہی لوگوں کی قسمت ہے۔ آپ کے مشورہ دینے میں کمی کی ہے۔ آپ نے مشورہ لینے میں کمی نہیں کی ہے۔

میرا مقدمہ تیار ہو چکا تھا مگر آپ کے انتظار میں بھیج نہیں رہا تھا۔ اب آپ کا جواب آیا اور آپ کے طرزِ اخلاق سے اطمینان ہوا۔ آپ ان صفحوں کو پڑھیں جہاں کہیں آپ کو اتفاق نہ ہو آپ مجھے اطلاع دیں میں غور کروں گا اور تغیر کر دوں گا۔

اپنے والد ماجد کو میرا سلام کہیے۔ مجھے آپ کے اس رشتہ اور نسبت پدری کی خبر نہ تھی، تو گویا آپ ہمارے مخدوم مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی کے عزیز ہیں کیا یہ میں صحیح سمجھا۔

میں نے اپنی تصویر خود کبھی نہیں بھجوائی لیکن اگر کسی نے لے لی تو میں نے مزاحمت بھی نہیں کی۔ والسلام

سید سلیمان
۱۵ ستمبر ۳۳ء

مولوی احید الدین نظامی

(٨٩)

دفتر دارالمصنفین، اعظم گڑھ

محترم! دام لطفہٗ

عنایت نامہ موصول ہوا "کتابی دنیا" کا ایک نمبر بھی ملا۔ ہمارے ہاں ایجنسیوں کے جو تجربات اب تک ہوئے ہیں۔ وہ سب ناکام ہوئے ہیں اور بہتوں کے ذمے بہت کچھ بقایا رہ گئی۔ اس لیے سب ایجنسیاں توڑ دیں۔

اب بہتر صورت تو یہ ہے کہ آپ نقد خرید کر رکھیں اور اگر اس پر عمل نہ ہو سکتا ہو تو یہ کیجیے کہ نصف قیمت اس وقت ادا کر دیجیے اور نصف بعد وضع کمیشن۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سو دو روپے ضمانت کے طور پر جمع کرا دیں اور پھر اس کے اندازے سے کتابیں طلب فرمائیں۔ حساب ہر ششماہی پر ہوا کرے گا۔

بالفعل کمیشن سیرت پر صہ فیصدی اور دوسری مطبوعات دارالمصنفین پر عہ فیصدی دیا جائے گا۔ اور مصارف پیکنگ و ریل و ڈاک آپ کے ذمے ہوں گے۔

مہربانی فرما کر آئندہ ان امور کے متعلق مولوی مسعود علی صاحب منیجر دارالمصنفین کے نام خط و کتابت فرمائیں۔ والسلام

سید سلیمان۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۳۳ء

براہِ کرم آئندہ خط و کتابت میں اس خط کا حوالہ ضرور دیجیے

بخدمت جناب احید نظامی صاحب
نظامی پریس۔ بدایوں

مولانا غلام رسول مہر (لاہور)

۹۰

خط پر حواشی مولانا غلام رسول مہر کے قلم سے ہیں !

دار المصنفین اعظم گڑھ (یوپی)
مکرم وعلیکم السلام

یاد آوری کا شکریہ، کامیاب سفر پر مبارکباد دیتا ہوں، میرا سفرنامہ کیا وہ تو چلتے پھرتے معلومات کا بیان ہے۔ پہلے سے اس کا خیال بھی نہ تھا۔ تاہم حضرت خواجہ صاحب نظامی کے سفرنامے سے تو زیادہ مکمل صحیح اور پر معلومات ہے۔ آپ کا سفرنامہ بھی یقیناً دلچسپ ہے۔ اور پر معلومات ہونا تو اس کا ظاہر ہے۔ میں نے جس رواروی میں یہ سفر کیا، اس میں اتنا کچھ لکھنا بھی غنیمت ہے۔

''چہل زینہ'' کے متعلق مجھے غلطی ہوئی ہوگی، مغرب کا وقت تھا[لے]۔ میں پوری عبارت بھی پڑھ نہیں سکا ابھی کل پرسوں ''اصلاح'' میں اس کا جو حال نکلا ہے اس میں بھی پیمائش و پیمانہ ہی سے بحث ہے۔ ضرورت ہے کہ پوری عبارت کا محققانہ مطالعہ کیا جائے۔

میرے احبابِ افغانستان کو جب آپ خط لکھیں تو میرا بھی جوابی سلام پہنچا دیں۔

''سیرۃ النبی'' جلد چہارم کی دو جلدیں بذریعہ ریلوے پارسل مرسل ہیں۔ مولوی بشیر صاحب[1] اور ظفر حسن[2] صاحب کو بھجوا دیجیے۔ ظفر حسن صاحب کو یہ بھی لکھیے کہ اس کی طبع دوم چھپ رہی ہے جس میں بعض تبدیلیاں اور اضافے ہیں، وہ ترجمہ بالفعل شروع کریں۔ مگر طبع دوم سے بعد کو ملالیں۔ طبع دوم ان کے پاس بھیجوں گا، ان کے پتے سے مطلع فرمایئے۔ میں نے ان کے شریکِ ترجمہ کے نام حسبِ طلب سیرۃ چہارم قسطنطنیہ بھیجی تھی۔ مگر واپس آگئی اور کسٹم گھر سے دینا پڑا۔ پچھلی دفعہ لاہور ایسا سرسری گیا کہ آپ کے دفتر تک بھی پہنچ نہ سکا، جس کا افسوس ہے۔

امید ہے کہ دریائے کابل کی (جو تنگ چشمان سمرقند و بخارا کی طرح تنگ ہے) زیارت

ے آشوب چشم جاتا رہا ہوگا۔ والسلام

سید سلیمان ندوی

۹ر نومبر ۱۹۳۳ء

۱؎ میں نے سید سلیمان مرحوم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ ان کے سفرنامے میں جو بالاقساط "معارف" میں چھپا تھا "چہل زینہ" (قندھار) کے ذکر میں ایک فروگذاشت ہوئی۔

۲؎ مولانا محمد بشیر شہید رئیس مجاہدین چمرکنڈ۔

۳؎ ظفر حسن صاحب ایبک۔ یہ ان طلبہ میں سے تھے جو فروری ۱۹۱۵ء میں لاہور سے ہجرت کرکے پہلے سرحد آزاد میں پھر افغانستان چلے گئے تھے۔ ظفر حسن صاحب بعد ازاں روس ہوتے ہوئے ترکیہ پہنچ گئے اور حربی کالج کا امتحان پاس کرکے فوج میں معزز عہدے پر مامور ہوئے۔ انھوں نے ترکیہ میں توطن اختیار کرلیا۔ میں ۱۹۳۳ء میں کابل گیا تھا۔ تو وہاں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے مولانا شبلی کی سیرت النبی ﷺ کا ترجمہ ترکی زبان میں کیا تھا۔ چوتھی جلد انھیں نہیں ملی تھی۔ میں نے مولانا سید سلیمان سے منگوا کر انھیں اور مولانا محمد بشیر کو بھجوا دی۔

سید رئیس احمد جعفری

۹۱

عزیزی! سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم، ہاں بے شک رمضان المبارک میں بھی تمہارا ایک خط آیا تھا، اور اب پھر تمہارا مفصل خط ملا، جس منزل میں اب تم ہو، یہ منزل ہر ایک طالب علم کی راہ میں ملتی ہے، اُس وقت تک چوں کہ دنیا کے نشیب و فراز اور کاموں کے عملی تجربوں اور خیالات کی عملی دقتوں سے واقفیت نہیں ہوتی، اس لیے وہ اپنے لیے ہر طرف اپنے کام کے لیے آزاد میدان پاتا ہے اور سب کچھ سوچتا ہے اور سب کو کرنا چاہتا ہے، لیکن جب ناکامیاں ہوتی ہیں، ٹھوکریں کھاتا ہے، تب ہٹ کر ایک راستہ پر چلتا ہے اور دنیا کو دار الخیال نہیں بلکہ دار العمل سمجھتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کام کا خیالی خاکہ ہمیشہ عالم گیر ذہن میں آتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے کہ ہماری ہر چیز آل انڈیا ہوتی ہے، ہم سمندر میں حرکت پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ناممکن ہے اور اسی لیے ہمارا کوئی کام جو آل انڈیا کی صورت میں ہے کامیاب نہیں، اگر کوئی ایک جگہ، ایک مرکز پر کسی ایک کام لے کر بیٹھے اور سب کچھ اس پر نثار کردے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کی حالت جیسی منتشر، پراگندہ اور غیر منظم اس وقت ہے ویسی کبھی بھی نہ تھی، ہم میں کوئی "مسلمان رہنما" نہیں، سب کسی نہ کسی چیز کے بھوکے ہیں۔ ایک ایک روٹی کے لیے آپس میں لڑتے ہیں جو کل کہتے ہیں وہ آج نہیں، اور جو آج کہہ رہے ہیں وہ کل نہیں کہیں گے۔ ذاتی اغراض کو قومیت کا لباس پہنا کر منصۂ شہرت پر جلوہ دیتے ہیں، اور ہم احسنت اور جزاک کا شورِ تحسین بلند کرتے ہیں۔

عزیز من! ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل تمام دنیا کے مسلمانوں سے زیادہ غور کے لائق ہے۔ ہندوستان کا سیاسی مستقبل کچھ بھی ہو مگر بہر حال یہاں اسلامی سلطنت نہ ہوگی نیز یہ بھی مسلّم ہے کہ اکثریت کا قانون اکثریت کو حکمراں طبقہ بنا دیتا ہے، ایسی حالت میں

ہندوستان میں مسلمانوں کی ہر چیز کس مپرسی میں پڑ کر فنا ہو جائے گی، اگر اس کی دیکھ بھال اور حفاظت کا سامان نہ ہو، ہمارے لیے "اسلام" اصلی چیز ہے اسی کے وجود کا نام مسلمانوں کا وجود اور اسی کی ترقی کا نام مسلمانوں کی ترقی ہے، بنا بریں ہماری اصلی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ ہم ہندوستان میں اسلام کو زندہ، باقی اور ترقی دینے کی کوشش کریں، اسی سے اکثریت کا مسئلہ بھی حل ہوگا، یعنی اب ہندوستان کی فتح، محمود غزنوی کی طرح ملکوں، شہروں اور قلعوں کی فتح سے نہ ہوگی، بلکہ اہلِ ہند کے قلوب کی فتح سے ہوگی، یہی اس دور کا اصلی کام ہے۔

نظم امامت و امارت کا میں خود معتقد ہوں، اور اس کو بہت بڑا کام سمجھتا ہوں، مگر یہ چیز کم از کم صوبۂ متحدہ میں جہاں سیکڑوں دیوتا ہیں قائم نہیں ہو سکتی ورنہ ان کے موروثی و آبائی بت خانوں میں خزاں آجائے گی۔

اچھے اخبار کی اشاعت بہت مفید و کار آمد آلۂ کار ہے، بشرطے کہ یہی اصل مقصد قرار نہ پا جائے، مگر اس کے لیے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اور انگریزی داں اسٹاف بھی چاہیے، اس کا کچھ بندوبست ہے؟

میرے ذہن میں آتا ہے کہ ندوہ کے ماتحت یا الگ "دار الارشاد" قائم کروں، جس میں دار المصنّفین کی طرح چند مخلص افراد اپنے چوبیس گھنٹے پورے اخلاص، ایثار اور انہماک کے ساتھ کام کریں، چھوٹے چھوٹے ایسے رسالے لکھیں جو اردو، ہندی، انگریزی میں طبع ہوں، اس کا اپنے مذاق کا ایک تجارتی دار الاشاعت ہو جس میں اس قسم کا تمام سنجیدہ لٹریچر جمع ہو، ماہوار رسالہ ہو، جو انگریزی میں بھی ہو تو کیا کہنا، اسی کے ماتحت یہ تحریک ہو کہ "انجمن شبّان المسلمین" شہر شہر طلبہ قائم کریں جس میں کھیل اور کلب کے دوسرے سامانوں کے ساتھ اسلامی لٹریچر کا کتب خانہ بھی ہو، ہر ہفتہ وہاں ایک اسلامی وعظ ہو، قرآن پاک کا مسلسل درس ہو اور اس طرح نوجوانوں کو نوجوان مسلمان ہندوستانی بنایا جائے۔

میں کوشش کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ کچھ دنوں میں یہ بھی ایک مستقل صیغہ ہو جائے گا، اس تجویز پر تم اور تمہارے ہم خیال عزیز غور کریں، لعل اللہ یشرح لذلک صدورکم۔

یہ جاننے کے لیے کہ قوم تم سے کیا چاہتی ہے، ایک خط بھیجتا ہوں۔ والسلام۔

سید سلیمان

۲۵؍ اپریل ۱۹۳۶ء

نواب سید شمس الحسن صاحب

۹۲

(صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں مرحوم کے انتقال پر ان کے صاحبزادہ مکرم نواب سید شمس الحسن کے نام تعزیت کا خط)

برادرم سلمہ اللہ تعالیٰ! السلام علیکم

ابھی آپ کا تار ملا! تار کیا تھا! بجلی تھی جو دلوں پر گری۔ ہائے ان کا آخری دیدار کتنا کم نصیب ہوا! وہ نہ صرف آپ کے باپ، بلکہ ہم سب کے بزرگ تھے اور میں اسی نظر سے ان کو دیکھتا تھا اُن کا وجود بزرگوں کی نشانی تھی۔ اور ہمارے لیے بڑا سہارا تھے۔ آہ آپ اور برادرم امیر حسن خاں اور آپ کے دوسرے بھائیوں کو کیا لکھوں اور کیوں کر صبر کی تلقین کروں، ان کا سایہ آپ لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت تھی جس سے افسوس کہ آپ لوگ محروم ہو گئے۔ بیگم صاحبہ کی خدمت میں تعزیت کن لفظوں میں پیش کروں زبان و بیان قاصر ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے تعزیت کے لیے میں خود حاضر ہوتا مگر رمضان اور اہلیہ کی علالت کے سبب سے قاصر رہا۔ بہرحال مجھے امید ہے کہ آپ لوگ جب تک میں جیتا ہوں اس رشتہ کو شکست نہ ہونے دیں گے۔

والسلام

سید سلیمان - ۱۹ر نومبر ۱۹۳۶ء

۹۳

برادر عزیز! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ ادارۂ معارف اسلامیہ کا جو اجلاس لکھنؤ میں آپ لوگ کر رہے ہیں، ادارہ کی طرف سے ایک مشاعرہ بھی ترتیب دیا جائے۔ جس میں ممتاز شعرا شریک ہوں۔ میرے خیال میں اس کام کی اہلیت آپ ہی کو ہے۔ آپ اس شعبہ کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیں، غالباً اس تجویز میں کسی کو اختلاف نہ ہوگا۔ کام حسب ذیل ہے۔

۱۔ ۱۶ر یا ۱۷ر یا ۱۸ر مارچ ۱۹۴۲ء کو رات کے وقت ایک مشاعرہ کا انعقاد۔ تاریخ و وقت و مقام متعین کیجیے۔

۲۔ ریڈیو آفس سے دریافت کیجیے کہ کیا وہ "ریلے" کریں گے۔ اور اگر اس کے لیے بجلی کی ضرورت ہو تو وہ ندوہ میں نہیں یونیورسٹی میں ہے تو پھر یونیورسٹی میں انتظام، اور اگر تار لگا کر یہاں انتظام کر سکتے ہیں تو خیر ندوہ ہی میں۔

۳۔ شعرا کا انتخاب: ملحد بالشویک شاعر کو تو بلایئے[1] اتنے نام یاد آتے ہیں، جگر صاحب، روشن صدیقی صاحب، حفیظ جالندھری لاہور، پروفیسر اکبر، منیر ہوشیار پوری گورنمنٹ کالج اور لکھنؤ کے شعرا کو تو آپ جانتے ہیں۔

۴۔ طرح جو پسند ہو۔ یا عنوان کسی نظم کا۔ یا عام

۵۔ کیا ان صاحبوں کی خدمت میں کچھ پیش کرنا بھی ہوگا۔ میرے خیال میں دس پندرہ شاعر کافی ہوں گے۔

امید ہے کہ جواب سے شادکام فرمائیں گے۔ اچھے صاحب اور عزیزی امیر حسن خاں صاحب کو سلام مسنون۔ آپ لوگوں کی کوشش سے اراکین استقبالیہ کچھ بن جاتے۔ بڑا مرحلہ تو روپیہ کا ہے۔ صدارت استقبالیہ کا فیصلہ بھی نہیں ہوا۔ صدرِ اجلاس کے لیے نواب مہدی یار جنگ کا انتخاب ادارہ کی مجلسِ عاملہ نے کیا ہے۔ معلوم نہیں ہوا کہ وہ قبول کریں گے یا نہیں۔ مشاعرہ کی صدارت کے لیے اقبال سہیل صاحب کو آپ پسند کریں گے یا جو نام آپ پسند کریں۔

والسلام

سلیمان۔ یکم جنوری ۱۹۴۲ء

(۹۴)

برادرِ عزیز! دعائے خیر۔

خط ملا۔ گو بدیر۔ اسی لیے اس کے جواب میں، جواب بھی دیر سے دے رہا ہوں: ۱۸ مارچ کو شبِ مشاعرہ کی تاریخ پر تین سو روپیہ کا سامان تو دشوار ہے۔ کوئی راجہ صاحب ابھی تک ہاتھ نہیں آئے۔ کوئی نواب ہی صاحب ہاتھ آجائیں۔

پرسوں شب کو میں نے جناب نواب صاحب مرحوم آپ کے والد کو خواب میں دیکھا۔ تخت پر وہ حسب عادت دو زانو بیٹھے ہیں۔ میں بھی ہوں۔ ناشتہ سے فرصت ہوئی ہے اور میں رخصت ہو رہا ہوں۔ رخصت کے وقت سواری کو پوچھتے ہیں اور میں معذرت کر دیتا

---

[1] اشارہ جوش ملیح آبادی کی طرف ہے۔

ہوں۔ گویا اب بھی اُن کی شفقت میرے حال پر ہے۔

بہرحال تو دس بارہ شعرا کا انتخاب کیجیے اور اتنوں کا کرایہ منظور کیجیے۔ اس میں کچھ کمی ہو جائے گی مگر شعرائے نازک خیال کی نازک دماغی کے بار کا متحمل کون ہوگا؟

اچھے صاحب اور برادرم امیر حسن خان سلام قبول فرمائیں۔ والسلام

سلیمان

۱۹ر مارچ ۱۹۴۲ء

سید الطاف علی بریلوی (علی گڑھ):

(۹۵)

دارالمصنفین اعظم گڑھ

مکرم السلام علیکم۔ آپ کا انگریزی رسالہ[1] ملا۔ ریویو ہوگا۔ مگر آپ کا رسالہ مجھے سفر میں ملا تھا، دیکھنا یہ ہے کہ یہاں ساتھ آیا ہے یا نہیں۔

مجھے اپنے مضمون کا برابر انتظار ہے۔ آپ کے احساسات کی میں نے بڑی قدر کی۔ آپ کا خیال درست ہے۔ مسلمانوں کے فائدے اور خدمت کے لحاظ سے ہمارے پرانے گھروندے بے کار ہو چکے۔ یا وہ اپنا چولا بدلیں یا موت کے گھاٹ اتر جائیں۔

لیکن آپ کی ذاتی وابستگی و محبت کے لحاظ سے میں کبھی آپ کو یہ رائے نہیں دے سکتا کہ آپ اپنی جگہ سے ہٹیں۔ اس وقت تو جو جہاں ہے وہیں پر اس کو قدم جمائے رہنا ہے، آپ ایسا کیوں نہ کریں کہ آپ بحیثیت ملازم جہاں ہیں وہاں بحد ملازمت اپنا کام بطور فرض کرتے رہیں۔ اور ہمارے دارالمصنفین کے لیے وہ مطلوبہ جلد لکھیے۔ جس کی فرمائش میں نے آپ سے کی ہے۔ دارالمصنفین آپ کو بطور معاوضہ نہیں بطور پیش کش ڈھائی سو روپے نذر کرے گی۔ یہ نذر حقیر ہے۔ مگر حالات نے مجبور کر رکھا ہے، ممکن ہے میں اس سے زیادہ کر سکوں، مگر وعدہ نہیں۔ انشاء اللہ علی گڑھ جلد حاضری ہوگی، باتیں ہوں گی۔ والسلام

۲۰ر جون ۱۹۳۶ء

سید سلیمان

---

[1] مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد۔

محمد امین زبیری

۹۶

دفتر دارالمصنفین اعظم گڑھ

مکرم السلام علیکم!

عنایت نامہ کا شکریہ۔ دونوں ٹکڑے مفید تھے، کام آئیں گے۔ مگر آپ نے یہ نہیں لکھا کہ ان دونوں کا ماخذ کیا ہے مہربانی فرما کر ماخذ سے مطلع فرمائیے۔

باقی آپ کی تلمیحات تو میں نہیں سمجھا۔ مولوی عبدالسلام صاحب سمجھیں، یہاں تو معاملہ صاف ہے۔ آج کل مولوی عبدالسلام صاحب پر مراق کا سخت دورہ ہے۔ بیکار سے ہو رہے ہیں۔ کیا آپ نے مکان بدل لیا۔ والسلام

۱۲؍ دسمبر ۱۹۲۸ء　　سید سلیمان

۹۷

مکرم السلام علیکم!

ادھر بہت مصروف تھا جواب نہ دے سکا۔ مجموعۂ خطوطِ سرسید کہاں سے ملے گا۔ مجموعۂ خطوطِ حالی بھی چاہیے۔

میں علی گڑھ گیا تھا آپ کو پوچھا تو معلوم ہوا کہ آپ آج کل مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ دہلی میں ہیں۔ میں آج کل خریدارانِ معارف کی توسیع کی کوشش میں ہوں کیا آپ اس میں حصہ نہ لیں گے۔ والسلام

۲۲؍ جنوری ۱۹۲۹ء　　سید سلیمان

۹۸

مکرم السلام علیکم!

معلوم نہیں آپ کہاں ہیں آپ نے اپنے ایک اطلاع نامہ میں مولوی شبلی صاحب کا وہ عربی قصیدہ نقل کر کے بھیجا ہے جو اکتوبر ۱۸۸۱ء میں مولانا نے سرسید کی مدح میں لکھا تھا آپ براہ مہربانی اکتوبر ۱۸۸۱ء کے انسٹی ٹیوٹ میں دیکھ کر مطلع فرمائیے کہ اکتوبر ۱۸۸۱ء کی تاریخ صحیح ہے۔ ہو سکے تو تاریخ مہینہ کی بھی لکھیے اور انسٹی ٹیوٹ کی جلد اور

نمبر یا تاریخ اشاعت[1]

پھر اس سے مطلع فرمایئے کہ مولانا جنوری ۱۸۸۲ء یا ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ میں پروفیسر مقرر ہوئے۔

جواب جلد عنایت فرمایئے۔ بھوپال میں کیا ہوا۔ والسلام

۱۶/ اکتوبر ۱۹۳۹ء سید سلیمان

(۹۹)

دار العلوم ندوہ۔ لکھنؤ

محب مکرم السلام علیکم!

آپ کے لفافے سے جو خط برآمد ہوا اس کو پڑھ کر مجھے بے حد ہنسی آئی۔ وہ ایک دل جلے کے خط کا جواب تھا۔ جو پورنیہ میں ندوہ کے لیے کوئی جائداد وقف کرنا چاہتا ہے۔ دیکھیے وہ دل جلا آپ کا خط پا کر کیسا چراغ پا ہوتا ہے۔ بہر حال آپ کے خط میں یہ تھا:

(۱) اس عربی قصیدہ کی تمہید لکھ بھیجیے جو اکتوبر ۱۸۸۱ء کے گزٹ میں ہے۔

(۲) آپ کو معلوم ہے کہ سر سید اور مولانا میں اخیر زمانہ میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ اس کے وجوہ کیا ہیں اور اسباب کیا تھے؟

(۳) میں مولانا مرحوم کے خطبات اور تقریریں چھپوانا چاہتا ہوں۔ اس لیے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کانفرنس کی کن کن روداووں میں ان کی چھوٹی بڑی تقریریں ملیں گی۔ ان کا حوالہ اور ہو سکے تو ان رودادوں کے نسخوں کی بہم رسانی یا ان تقریروں کی نقل اس کی اجرت دی جائے گی۔

(۴) کانفرنس کے اجلاس اول میں مولانا نے کن تجویزوں کی تائید یا تحریک فرمائی اور ان پر جو تقریر بھی کی ہو بقید تاریخ و اجلاس بھیج دیجیے۔

(۵) ترقی پنشن پر مبارک باد قبول فرمایئے۔

آج کل ندوہ کا کام اپنے ذمہ لیا ہے اس میں مدد فرمایئے۔ الندوہ کا بھی قصہ ہے۔ ہاں! آپ نے دوسرے خط میں دار المصنفین کی تاریخ کی جو تحریک اس موقع پر کی ہے

---

[1] یہ معلومات حیات شبلیؒ کے لیے مطلوب تھیں جس کی تالیف کا کام اسی زمانے میں شروع ہوا تھا

وہ برمحل ہے۔ انشاء اللہ عمل کی کوشش کی جائے گی۔ والسلام

۲۷ر نومبر ۳۹ء سید سلیمان

۱۰۰

دارالمصنّفین اعظم گڑھ

مجی السّلام علیکم!

ازہر والا مضمون پہنچا۔ یہ ہمارے ہاں نہ تھا۔ آپ ان تقریروں کو بھیج دیجیے۔ میں ان کو درست کرلوں گا۔ "صرف دولت" والی تقریر ہو تو وہ بھی بھیج دیجیے "جمہوریت" والا مضمون بھی بھیج دیجیے[۱]

ایک مہینے کے بعد حیدرآباد، پونا اور بمبئی کے سفر سے واپس آیا ہوں۔ حیدرآباد میں ندوہ کی ماہوار کے اضافہ کے لیے عریضہ پیش کیا ہے۔ اللہ مالک ہے۔

ریویو جو بھیجا ہے وہ شائع ہوگا۔

الندوہ دوبارہ جاری کیا ہے خدا کرے جاری رہے۔ اگر نہ دیکھا ہو تو دفتر الندوہ بادشاہ باغ لکھنؤ سے منگوایئے۔ قیمت وہی عدد وہی حجم۔ مضامین خلافت۔ ہندی۔ قرآن کا انگریزی ترجمہ۔ اوقاف اسلامی۔ اسٹرائک ندوہ موجود ہیں۔ جمہوریت والا مضمون بھیجیے۔ بھیجیے۔ والسلام

۲۷ر فروری ۴۰ء سید سلیمان

۱۰۱

دارالمصنّفین اعظم گڑھ

مکرم السّلام علیکم!

سوانح شبلی اب قریب ختم ہے[۲] آپ نے مولانا کا مضمون جمہوریت جس کو آپ فرماتے تھے، مجھے نہیں بھیجا۔ براہ کرم جلد بھیج دیجیے۔ اور جس اخبار سے لے کر بھیجیے اس کا نام اور تاریخ اشاعت بھی لکھ دیجیے۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

---

[۱] یہ مضمون و تقاریر شبلی ہیں جن کی "حیات شبلی" کی تالیف کے سلسلے میں سید صاحب کو ضرورت تھی۔

[۲] سوانح شبلی سے مراد "حیات شبلیؒ" کا سوانحی حصہ ہے۔ حیات شبلی کی تالیف کا کام ۴۲ء تک جاری رہا۔ ۴۳ء میں شائع ہوئی۔

مولوی عبد السلام بخیر ہیں۔

حیاتِ شبلی میں آپ کا نام بھی آیا ہے۔ والسلام

۹؍ اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء سید سلیمان

(۱۰۲)

دار المصنفین اعظم گڑھ

مکرم السلام علیکم!

آپ کا عنایت نامہ مجھے ملا تھا۔ جس طرح مجھے آپ کی نہیں آپ کو بھی میری خبر نہیں۔ کئی مہینوں سے میں مبتلائے مصائب گوناگوں ہوں۔ ساڑھے چار مہینوں کے بعد ۸؍ ستمبر کو اعظم گڑھ آیا ہوں ایک ماہ ریل و ڈاک کے ہنگاموں میں اس طرح رکا رہا کہ نہ مسافر تھا نہ مقیم۔ گھر جانے کی وجہ ایک لڑکی کے نکاح کی تقریب تھی مہینوں کے جھمیلوں کے بعد بالآخر انجام پائی۔ صاحبزادہ نے امسال بی۔ اے پاس کیا ان کی نوکری کی فکر ہے۔ داماد نے ایم۔ اے ال ال بی کیا اس کی فکر الگ دامن گیر ہے۔ چھوٹی لڑکی کی شادی برادری سے الگ الٰہ آباد میں کی ہے۔ نام سید حسین صاحب ہے۔ وہ بلیا میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ پچھلے نومبر میں یہ شادی ہوئی۔ اس ہنگامۂ بدتمیزی کے زمانے میں ان کی تعیناتی بلیا ہی میں تھی بلوائیوں نے ۱۹؍ اگست کو ان کے بنگلے پر حملہ کیا انھوں نے دو گھنٹہ قبل بنگلہ چھوڑ دیا تھا اور مع بیوی کے ایک غریب مسلمان کے گھر میں پناہ لی۔ لڑکی حاملہ تھی وہیں اس مکان میں اس کو وضع حمل ہوا۔ مجبورانہ بے احتیاطی کے باعث بڑی مشکل سے اس کی جان بچی۔ نوزائیدہ بچی ضائع ہو گئی۔ سارا سامان اسباب بلوائیوں نے لوٹ لیا۔ جس میں زیادہ تر اس کا سامان جہیز تھا۔ ایک کپڑا اور ایک برتن تک نہ چھوڑا ہزاروں کا مال لے گئے۔ میری حالت صحت چند ماہ کے اندر بہت گھٹ گئی ہے اس وقت بھی آشوب چشم میں مبتلا ہوں۔ اب ایک آنکھ اچھی ہے اس سے کام لے رہا ہوں۔ بڑی لڑکی کی نسبت میرے ایک چچا زاد بھائی کے لڑکے سے تھی جو مہینہ مقرر تھا اس میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لڑکے ابو سہیل کی نسبت دوسرے چچا زاد بھائی کی لڑکی سے تھی۔ وہ میسور میں انسپکٹر مدارس تھے۔ دفعتہً تاریخ تقریب سے چند روز پہلے وہ چل بسے اور تقریب رک گئی۔ یہ سب امور پورے سال بھر سوہانِ روح بنے رہے۔ خدا کرے کہ اب بھی میرے سلسلہ مصائب کا خاتمہ ہو اور اللہ تعالیٰ مزید ابتلا میں نہ ڈالے۔

اس کے احسانات کی حد نہیں اور ممکن ہے کہ یہ مصائب بھی اس کی حکمت کے رو سے میرے لیے رحمت ہی کا باعث ہوں ہم اپنے جہل اور غیب کی خبر نہ رکھنے کی وجہ سے اس کو مصیبت خیال کرتے ہیں۔

بہر حال یہ تو ذاتی حالات تھے جن کا مختصر ذکر اس لیے کیا گیا تاکہ معلوم ہو کہ دنیا میں فارغ کوئی نہیں۔

مجھے آپ کی علالت کی خبر مطلق نہیں ہوئی۔ آپ کو مجھ سے یہ بدگمانی ہے کہ علی گڑھ کی فضا سے متاثر ہو کر آپ سے الگ ہو گیا ہوں۔ اختلاف رائے دوسری چیز ہے مگر میں نے بار بار آپ کو یقین دلایا ہے کہ اس اختلاف رائے کا ہماری ذاتی دوستی و محبت پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ ایک مسلمان کے پاس قسم کے سوا یقین دلانے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں، تو میں بہ قسم کہتا ہوں کہ میں آپ سے اپنی دوستی و محبت کے اسی جذبے پر قائم ہوں جس پر علی گڑھ سے پہلے تھا۔ آپ کے وہ احسانات مجھے یاد ہیں جو آپ نے دارالمصنفین پر فرمائے ہیں اور میری شرافت کے لیے یہی کافی ہے کہ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ اس باب میں برائے خدا کبھی شک نہ فرمائیں کہ مجھے اس سے بے حد تکلیف ہوتی ہے آپ کو کیوں یقین نہیں آتا کہ سالہا سال سے مجھے عملی سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں اور سوائے ندوہ اور دارالمصنفین کے میں کوئی دوسرا کام نہیں کرتا۔ علی گڑھ کا تعلق بھی کورٹ کے ہنگامہ تک رہا پھر مجھے کوئی خبر نہیں کہ کیا ہوا اور کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب سے بعض بعض جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ باتیں بھی ہوئیں۔ پارٹی پالیٹکس سے نہ مجھے پہلے کبھی دلچسپی رہی اور نہ اب ہے۔

آپ کو شکایت ہے کہ آپ کی کتاب پر ریویو نہ ہوا۔ آپ کی کتاب لا کر اڈیٹر صاحب کو دے دی تھی پھر نہ آپ نے یاد دلایا اور نہ مجھے یاد آیا کہ میں پوچھتا۔ میں بھی آدمی ہوں، بھولتا بھی ہوں اور بھول بھی سکتا ہوں۔ آپ نے پوچھا تو ہوتا۔

آپ نے مولانا شبلی کے خطوط مانگے تھے وہ خطوط اور کاغذات میں گم تھے اور تلاش کی آلکسی سے پڑے رہے بارے ایک ضرورت سے کاغذات کو الٹ پلٹ رہا تھا تو وہ مل گئے، اب پھر ڈھونڈتا ہوں۔ خدا کرے جلد مل جائیں۔ رمضان کے روزوں کے اندر میں ایک گھنٹہ تک تمام کاغذات الٹے مگر وہ اس وقت نہیں ملے۔ مولوی عبدالسلام صاحب آپ کے دوست گواہ ہیں۔ میں اب بھی کوشش کروں گا انشاءاللہ۔ جب وہ مل جائیں واپس ہوں گے۔

امید ہے کہ آپ میری طرف سے اپنا دل صاف رکھیں گے اور ویسا ہی سمجھتے رہیں گے جیسا پہلے سمجھا کرتے تھے ۔ صفحۂ مہر براں ونشان است کہ بود۔

"حیاتِ شبلیؒ" کے دیباچے میں بھی آپ کی امداد کا ذکر آئے گا۔ والسلام۔

سید سلیمان ۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۴۲ء

(۱۰۳)

محب مکرم زاد لطفکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ نے مسرور کیا مشکور کیا۔ میرے لڑکے کا نام ابو سہیل ہے مگر وہ اپنے کو اے ایچ سہیل یا اے سہیل لکھتے ہیں انھوں نے امسال مسلم یونیورسٹی سے تھرڈ کلاس میں بی اے کیا ہے۔ میں واقعی ان کے لیے بہت پریشان ہوں کہ کیا کیا جائے، سنٹرل ہوم ڈیپارٹمنٹ میں کلرکی کی کوشش کا خیال تھا۔ مگر ذرائع مفقود۔ آنریبل سید عبدالعزیز صاحب سے قدیم ملاقات ہے، ان سے دوسروں کے لیے سفارش کرتا ہوں مگر اپنے لیے شرماتا ہوں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب اگر چاہیں تو وہ سب کچھ کر سکتے ہیں، بشرطیکہ چاہیں۔ آپ کی کوشش واثر سے بہت کچھ امید پڑتی ہے۔ ان کا سبجیکٹ ایف اے تک تو تاریخ اور عربی تھی مگر بی اے میں اردو، تاریخ اسلام اور انگریزی تھی۔ لٹریچر سے ذوق رکھتے ہیں۔ محنتی اور مستعد بہت ہیں۔ ہر کام کو پوری جانفشانی سے کرتے ہیں ریلوے میں اچھی طرح چل سکتے ہیں وہ خود کمپیٹیشن میں بیٹھنا چاہتے ہیں آپ کا خط میں نے ان کو دے دیا اس کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور آپ کی ہمدردی سے متاثر۔ وہ ایک ہفتہ کے لیے پٹنہ گئے ہیں واپس آجائیں تو میں ان کو آپ کے پاس علی گڑھ بھیج دوں گا۔ آپ جو مناسب مشورہ دیں گے، وہ کریں گے۔

میرے داماد اردو میں ایم اے اور ایل ایل بی ہیں دونوں مسلم یونیورسٹی سے سیکنڈ کلاس میں کیا ہے۔ ان کا ارادہ منصفی کا ہے۔ پٹنہ میں جسٹس فضل علی اب چیف ہیں فیہ ہیں ان سے کام لینا پڑے گا۔ سوال یہاں بھی ۔ پیٹ کا ہے۔

بہرحال آپ کی کوششوں سے جو مدد حاصل ہوگی وہ شاید مجھ سے زیادہ کامیاب ہو۔ عزیزی یامین کی کامیابی کا حال پڑھا اور سنا۔ خدا مبارک کرے آمین۔ اس میں عزیز موصوف کی ہوشمندی اور صحیح راہ عمل کو بھی دخل ہے اللہ تعالیٰ آپ کے اور صاحبزادوں کو بھی

کامیاب کرے کہ اس عمر میں آپ کو اطمینان نصیب ہو۔

"حیات شبلیؒ" کے ۲۰۰ صفحے چھپ چکے ہیں ۱۶۰۰ ابھی باقی ہیں۔ میں اب لکھنؤ جارہا ہوں ۲۵/ اکتوبر سے دو ہفتوں تک تھانہ بھون رہوں گا۔ لکھنؤ کا پتا دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ اور تھانہ بھون کا خانقاہ امدادیہ، تھانہ بھون۔ ضلع مظفر نگر۔ عزیزی سہیل کو براہ راست شبلی منزل اعظم گڑھ کے پتے سے لکھ سکتے ہیں۔ والسلام

سید سلیمان
۱۹/ اکتوبر ۱۹۴۲ء

(۱۰۴)

اعظم گڑھ
محبی منشی محمد امین صاحب زبیری سول لائنس علی گڑھ۔
کرم زاد لطفکم، السلام علیکم۔

عنایت نامہ مجھے تھانہ بھون میں ملا تھا۔ عزیزی سہیل کو ایک پھوڑا نکل آیا تھا وہ پٹنہ دانا پور اسپتال میں پڑے تھے ابھی واپس آئے ہیں اور میں بھی پرسوں ہی واپس آیا ہوں۔ عزیزم سلمہ آپ کے پاس علی گڑھ جارہے ہیں۔ اب آپ ہیں اور وہ ہیں ان کو جو مشورہ ان کے لائق دیجیے، وہ انشاء اللہ عمل کریں گے۔ خدا کرے کہ آپ کی کوششیں کامیاب ہوں امید ہے کہ آپ ان کو مطیع و فرماں بردار پائیں گے۔ دسمبر تک یہ قسمت آزمائی کریں گے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

۱۷/ نومبر ۴۲ء سید سلیمان

(۱۰۵)

جناب محبی منشی محمد امین صاحب زبیری زاد لطفہٗ۔ السلام علیکم

آپ کے سر ابھی دو عزیز تو چپکے ہی ہوئے ہیں اب ایک تیسرا ابھی چپکانا چاہتا ہوں علی گڑھ گزٹ ۵/ دسمبر ۴۲ء میں ملفوفہ اشتہار چھپا ہے۔ میرے ایک نوجوان عزیز جو میرے پاس اسی قسم کا کام کرتے ہیں، لیکن یہاں مشاہرہ کم پاتے ہیں۔ اس اشتہار کے مطابق اپنے کو پیش کرتے ہیں۔ درخواست تو انھوں نے حفیظ الرحمان صاحب حفیظ منزل میرس روڈ علی گڑھ کے نام بھیج دی ہے میں ان صاحب سے واقف نہیں اگر آپ کو واقفیت ہو اور ضرور واقفیت ہوگی تو آپ براہ مہربانی کوشش فرما کر تقرر کرادیں۔ بہت ممنون

ہوں گا۔ افسوس کہ قلم تطویل کا عادی نہیں ورنہ زیادہ لکھتا عزیزی سہیل ابھی تک ناکام ہیں۔ شاید ڈاکٹر صاحب نے حسب توقع دلچسپی نہیں لی۔ بہرحال ممنون ہوں کہ اس گرانی میں آپ ان دو ناخواندہ مہمانوں کی میزبانی فرما رہے ہیں۔

کیا ان لوگوں کی کامیابی کی کوئی توقع ہے؟ آپ کی رائے سننی چاہتا ہوں۔ افسوس کہ میں اچھا نہیں، ورنہ علی گڑھ خود آتا۔ گھر میں بھی علالت ہے۔ والسلام

سید سلیمان
۲۲ر دسمبر ۱۹۴۲ء

---

(۱۰۶)

جونپور۔ بذریعہ ڈپٹی سید حسین صاحب
محبت مکرم۔ السلام علیکم!

میں اس وقت ضعفِ معدہ و ضعفِ اعصاب میں مبتلا ہوں۔ یہاں بغرض علاج مقیم ہوں۔ مشاغل دماغی سے کلیۃً احتراز ہے۔

سیرت شبلی ختم ہوگئی ہے اس کا مقدمہ و دیباچہ معارف نومبر میں معہ فہرست چھپ رہا ہے۔

آپ اپنے محفوظات دماغی و تحریری سب سپردِ قلم کر دیجیے۔ بہرحال وہ مفید ہوں گے اور آیندہ کام کرنے والوں کے لیے بطور مسالہ کے کارآمد ہوں گے۔

مسلم یونیورسٹی کے مباحث سے مجھے دور ہی رکھیے اعتراضات کی بجائے ڈپارٹمنٹ کو اپنے مشورے دیں تو زیادہ بہتر اور پھر کوئی صیغہ اپنے مقام پر ہے؛ ذرا عربی و فارسی اور دوسرے صیغوں پر بھی نظر دوڑائیے۔

جی ہاں میاں سہیل سے فرصت ملی میاں سہیل محکمہ نمک میں انسپکٹر ہوکر مظفرپور (بہار) میں ہیں۔

میاں عاصم نے پٹنہ میں وکالت شروع کی۔ والسلام

سید سلیمان
۳۱ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب (حیدرآباد، سندھ)

ان مکاتیب پر حواشی مکتوب الیہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہٗ کے قلم سے ہیں۔

(۱۰۷آ)

مکرم! السلام علیکم

آپ کا خط ملا تھا، مگر مجھے چند سفر درپیش تھے اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔ آپ کا ارادہ اچھا ہے۔ امید ہے کہ آپ کی کوششوں سے ایک نئے شاعر سے ہم روشناس ہوں گے۔ ہمارے ہاں فارسی کا ذخیرہ بہت ہی کم ہے' اس لیے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔

۱۔ حدیقۂ حکیم سنائی کے آخری تاریخی شعر میں پان صد و بست و پنج عموماً پایا جاتا ہے۔ اور بعض میں پان صد و چہل و پنج ہے اب عام روایت کی بنا پر ۵۲۵ھ سنائی کی تاریخ وفات ہے۔ اور بعضوں کے نزدیک جس کی میں نے بھی تائید کی ہے، ۵۴۵ھ تاریخ وفات قرار دی ہے۔ میرا مضمون سنائی کی تاریخ وفات پر معارف میں چھپا ہے۔ اس لیے پانصد و شصت و پنج تو کسی طرح نہیں ہوسکتا دولت شاہ نے ۵۷۶ھ تاریخ وفات بالکل غلط لکھی ہے۔

۲۔ آپ کے سامنے حدیقہ کا مطبوعہ بمبئی نسخہ ہے جو نول کشوری سے بھی زیادہ غلط ہے۔ یہی عبارت نول کشوری اس طرح ہے۔ کتاب کتبہ الی بغداد وارسل الی امیر الاجل برہان الدین جمال الاسلام ابوالحسن علی بن ناصر الغزنوی الملقب بہ بریان گر رحمۃ اللہ علیہ لسبب طعن الطاعن فی ہذا الکتاب۔ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ ابوالحسن علی امراء میں سے تھے، علماء و شعراء میں سے نہ تھے۔ گو حدیقہ کے اشعار سے اُن کا "سالار دین" ہونا ظاہر ہے، "بریان گر" سے ملقب ہونا بھی شرط ہے۔ دولت شاہ نے سید حسن غزنوی کو سنائی کے معاصرین میں شمار کیا ہے (ص۹۸ لندن) اور سید حسن غزنوی نے دولت شاہ کے مطابق ۵۳۵ھ میں وفات پائی ہے (ص۱۰۵)

بغداد میں بر زمانہ خلیفہ راشد باللہ (المقتول ۵۳۲ھ سلطان مسعود بن محمد بن ملک شاہ نے سید حسن غزنوی سے ملاقات کی (دولت شاہ ص۱۰۵) سلطان مسعود بغداد میں ۵۳۰ھ

میں تھا اس بنا پر سنائی کے سید حسن غزنوی کے پاس خط بھیجنے کا وقت زیادہ سے زیادہ ۵۳۰ھ یا ۵۳۲ھ تک ہو سکتا ہے۔ پھر آپ نے ۵۶۵ھ میں حسن غزنوی کا بغداد میں ہونا کس طرح قرین صواب قرار دیا ہے؟

طبقات ناصری (ص۲۳) میں ہے کہ سید حسن غزنوی نے سلطان بہرام کی تخت نشینی پر قصیدہ پڑھا:

منادی بر آمد ز ہفت آسمان
کہ بہرام شاہ است شاہ جہاں

اس تخت نشینی ۵۱۱ھ میں ہوئی ہے۔ پھر وہ اس وقت بھی تھا جب بہرام شاہ نے سلطان سوری کو شکست دی ہے اور قتل کیا ہے۔ (لباب الالباب ج۲ ص۲۷۶)

خزینۃ الاصفیاء (ص۲۴۶) جلد اول میں جس خواجہ ناصر الدین ابو یوسف کا ذکر ہے وہ سید حسن غزنوی کے والد نہیں ہو سکتے۔ خواجہ ابو یوسف چشتی مشہور صوفی ہیں اور ان کے دو لڑکے ہیں مودود چشتی اور ابو الفتح چشتی، دیکھیے خزینۃ الاصفیاء صفحہ مذکور سطر آخر۔

۲۔ شیخ آذری کی جواہر الاسرار ہمارے ہاں نہیں۔

۴۔ ریاض الشعرا کا وہی مطلب ہے جو آپ سمجھے ہیں یعنی صائب نے انتخاب میں اس کو لیا ہے۔

۵۔ محفوظ النساء نام عورتوں کا ہندوستان میں جائز ہے، کیا محفوظ نہیں کر سکتے۔

والسلام
سید سلیمان

۲۷ر دسمبر ۱۹۳۸ء

(۱۰۸)

مکرم! السلام علیکم

عنایت نامہ ملا پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے آپ ہمت نہ ہاریں گے۔ ایک بات عرض کر دوں اکثر کمتر مواد کے لیے لوگ قیاسات

---

[1] راقم الحروف نے سید حسن غزنوی پر کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یہ سنائی غزنوی کے معاصر تھے۔ ان کے ایک ترجیع بند کا یہ شعر ہمارے ملک میں بہت مشہور ہے۔

سلّوا یا قوم بل صلّوا علی الصدر الامین مصطفیٰ ما جاء الا رحمۃ للعالمین

کو دلائی کی جگہ دے دیتے ہیں۔ آپ اس سے احتراز فرمائیے۔ جب تک کوئی بات محقق نہ ہو جائے قبول نہ کیجیے۔ اس زمانے میں آداب والقاب بے معنی کا بڑا کھیل تھا۔ تاج الدین اور عزالدین اور خدا جانے کیا کیا لوگ کہتے تھے، یہ نام نہیں ہیں۔ ان سے دھوکا نہ کھائیے۔

دولت شاہ میں تاریخیں اور واقعات بھی معتبر نہیں۔ ایک دلچسپ تذکرہ ہے اور بس۔ تاریخی حیثیت اس کو بہت کم حاصل ہے۔

میرا مضمون سنائی کی وفات پر معارف مارچ ۱۹۳۳ء میں نکلا تھا، آپ کا خط واپس جاتا ہے۔ والسلام

۲۱ر جنوری ۱۹۳۹ء سید سلیمان

۱۹

مکرمی! السلام علیکم

عنایت نامہ ملا۔ ذوق جیسے باکمال شاعر کے متعلق یہ سوء ظن ہوگا کہ وہ سیہ کے بجائے سیۂ لکھیں[1]، صحیح شعر اس طرح ہوگا:

---

[1] ناگ پور یونیورسٹی کے بعض کالجوں میں برادران وطن نے اپنے لوگوں کو ان کی نااہلی کے باوجود اردو اور فارسی کا استاد مقرر کر دیا تھا۔ ایک کالج میں ایک استاد صرف میٹرک پاس تھے انھوں نے انٹرمیڈیٹ کے سالانہ امتحان (بابت ۱۹۳۹ء) میں ذوق کے قصیدے کے چند اشعار تشریح کے لیے دیئے تھے۔ ایک شعر اس طرح لکھ دیا تھا۔ تراسیۂ بھی ہے یوں ہی داخل حسنات۔ کہ جیسے صحبتِ اصحابِ کہف میں قطمیر، میں نے یونیورسٹی کو لکھا کہ سیۂ کوئی لفظ نہیں، سیہ، چاہیے اور پہلا مصرع اس طرح ہوگا: ترا تو سیہ بھی یوں ہی داخلِ حسنات، وہ استاد نہیں مانے تو پھر میں نے حضرت سید صاحب اور چند دوسرے بزرگوں کے جوابات پیش کیے۔ ایک اور استاد تھے جو کہا کرتے تھے کہ غالب ترابی (تراویح) بہت پڑھا کرتے تھے اور ثبوت میں یہ شعر پیش کرتے تھے۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیانِ غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ایک اور استاد تھے جو مضامینِ رشید کے "لقمہ دینا" (محاورہ) کے عجیب معنی بتاتے تھے۔

ترا تو سیئہ بھی یوں ہی داخلِ حسنات
کہ جیسے صحبتِ اصحابِ کہف میں قطمیر۔

والسلام

۲۵ر جولائی ۱۹۳۹ء
سید سلیمان

(۱۱۰)

مکرم! السلام علیکم

عنایت نامہ کا شکریہ۔ ریواں[1] کے کتب خانہ کی اطلاع کا شکریہ کیا اچھا ہوتا کہ یہ کتب خانہ دارالمصنفین کو مل سکتا۔ کیا آپ اس کی تحریک نہ فرمائیں گے؟ یہاں کے رفقا ان کتابوں سے بہت کچھ فوائد اٹھا سکیں گے۔

مولانا شبلی مرحوم کا تبرک نامہ پہنچا۔ محفوظ رہے گا۔

مولانا رحمان علی صاحب کا تذکرہ علماء بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔

ادیب صابر اور فرید کاتب و فخرالدین خالد ہروی میں سے کسی کا فارسی دیوان یہاں نہیں۔

سوانح شبلی جلد اول ختم ہو رہی ہے

والسلام

۴ر ستمبر ۱۹۴۰ء
سید سلیمان

---

[1] ریاست ریواں میں مولانا رحمٰن علی صاحب مرحوم صاحبِ "تذکرہ علماء ہند" وغیرہ کی وفات کے بعد ان کا کتب خانہ ان کے صاحبزادے مولوی عیاض علی صاحب کی تحویل میں تھا۔ راقم الحروف کو وہ کتب خانہ دیکھنے کا موقع ملا۔ بڑی خستہ حالت میں تھا۔ اسی کے متعلق میں نے حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کو لکھا تھا اور اپنے میزبانِ گرامی اور محترم دوست پروفیسر اختر حسین نظامی صاحب کے ذریعے کوشش بھی کی تھی کہ وہ کتب خانہ دارالمصنفین کو دے دیا جائے تاکہ زیادہ لوگ مستفیض ہو سکیں اور کتابیں محفوظ ہو جائیں۔ وہیں مولانا شبلی کا ایک مکتوب مولانا رحمٰن علی مرحوم کے نام ملا تھا جس کی نقل حضرت سید صاحب کو بھیجی تھی۔ اسی کو آپ نے تبرک نامہ فرمایا ہے۔ مولانا عیاض علی صاحب اور پروفیسر اختر حسین نظامی صاحب کا ذکر اس کے بعد والے مکتوب ۱۱۱ میں آئے گا۔

(۱۱۱)

مکرم! السلام علیکم

عنایت نامہ کے جواب میں تاخیر ہوئی، میں نے حسب ایما سامی مولوی عیاض علی صاحب کی خدمت میں نیاز نامہ آج لکھا ہے۔ دیکھیے کیا نتیجہ ہو۔ آپ اور مولوی اختر حسین صاحب اگر کوشش میں لگے رہیں گے تو کامیابی کی امید ہے۔ حیاتِ شبلی ابھی تک مسودے کی صورت میں ہے مگر الحمد للہ کہ قریب ختم ہے، چالیس برس کے قومی و علمی و تعلیمی و سیاسی احوال و سوانح کا یہ مجموعہ ہے۔

نقد و تبصرہ دوسرے حصے[ع۱] میں ہوگا یہ صرف سوانح و خدمات پر مشتمل ہے۔ آیندہ سال یہ حصہ مطبع میں چلا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

ایک کتاب[ع۲] کا اشتہار بھیج رہا ہوں۔ اگر اس کے دس پانچ نسخے آپ کی تحریک سے فروخت ہو جائیں تو میں ممنون ہوں گا اور آپ ماجور۔ والسلام

سید سلیمان

۲۸ ر رمضان ۱۳۵۹ھ ۳۱ ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

(۱۱۲)

مکرم! السلام علیکم

عنایت نامہ کا شکریہ۔ اور "نقوشِ سلیمانی" کی پذیرائی پر ہدیۂ تشکر[ع۳]، پی ایچ ڈی کے

[ع۱] حضرت سید صاحب کو اُن کی وفات کے بعد راقم الحروف نے خواب میں دیکھا۔ فرمارہے تھے کہ حیاتِ شبلی کا دوسرا حصہ تم لکھ دو۔ راقم الحروف نے پھر اپنے عزیز گرامی پروفیسر سید یحییٰ احمد ہاشمی صاحب (حال صدر شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی) کو اس کام کے لیے آمادہ کیا اور انھوں نے سخت محنت کر کے "مولانا شبلی کا ذہنی ارتقاء" بہت فاضلانہ مقالہ لکھا۔ افسوس کہ وہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

[ع۲] اس کتاب سے مراد حضرت سید صاحب کی کتاب "رحمت عالم" ہے جو ۲۰ ر رجب ۱۳۵۹ھ کو مکمل ہوئی تھی۔

[ع۳] حضرت سید صاحب کی فاضلانہ کتاب پر ایک حقیر سا تبصرہ لکھا تھا۔ اسی کا ذکر ہے پھر سید صاحب نے اس کتاب پر ایک نظر ڈالنے کے لیے اس عاجز کو تحریر فرمایا اور اُن کی عظمت کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ نقوشِ سلیمانی کے دوسرے ایڈیشن میں اس عاجز کا ۴-۵ مقامات پر حوالہ دیا ہے۔

لیے عنوانات تو بہت سے ہیں، مگر ضروری ہے کہ آپ کی مناسبت طبع اور ذوق کے مطابق ہو۔ حسب ذیل چند عنوانات ذہن میں آتے ہیں۔

۱۔ ہندوستان میں فارسی شاعری۔ مسعود سعد سلمان سے شبلی تک۔

۲۔ ہندوستان میں ہندی علوم اور مسلمان۔

۳۔ ہندو شعرائے فارسی۔

۴۔ ہندوستانی تمدن میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر اور مسلمانوں نے ہندوؤں پر کیا اثرات ڈالے۔ آپ کا مضمون[۱] ادارت معارف کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ والسلام

سید سلیمان
۲۵؍ اگست ۱۹۴۱ء

مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی

(۱۱۴)

دار المصنفین۔ اعظم گڑھ
مکرمی السلام علیکم

اعظم گڑھ کی حاضری حج سے کم نہیں[۲] جس کو لوگ آخیر وقت تک ٹالتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس فرض کو اس وقت ادا کرتے ہیں جب اس کے ادا کرنے کی جسمانی طاقت نقطۂ صفر تک پہنچ جاتی ہے۔ دیکھیے ہندوستان کا شانتی نکیتن جو ایک کوردہ میں اسٹیشن سے چار میل دور واقع ہے، مشرق و مغرب کے قافلوں کا مورد بن گیا ہے اور ہم لوگ ابھی چھوٹی لائن اور بڑی لائن کے پھیر میں ہیں۔

روشن مستقبل[۳] پر ریویو ہوگا۔ آخر اور آغاز سال مطبوعات کی بجائے اخبار و رسائل

---

[۱] یہ مضمون ''تاریخ ملک ارسلان غزنوی'' تھا جو معارف (نومبر ۱۹۴۱ء) میں شائع ہوا۔

[۲] مولوی نظامی بدایونی نے دار المصنفین، اعظم گڑھ جانے کا ارادہ ظاہر کیا ہوگا۔

[۳] نظامی بدایونی کے حبیب لبیب مولوی طفیل احمد منگلوری کی مشہور کتاب۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے نمبر لے لیتے ہیں۔ اس لیے تاخیر ہوتی ہے۔ اس کتاب میں ایک دو جگہ میرا نام آیا ہے۔ وہاں سنوں کی غلطیاں ہیں اور بھی کچھ غلطیاں نظر آئی تھیں۔ اپریل میں ریویو نکلے گا۔

آپ اپنے یہاں کی تازہ مطبوعات بھیجتے رہیں تو یہاں سے بھی کچھ تبادلہ کا سلسلہ جاری رہے۔ والسلام

سید سلیمان
۱۱ر مارچ ۱۹۳۹ء

(۱۱۴)

مکرمی السلام علیکم

عنایت نامہ کا شکریہ۔

جس تعلیمی کمیٹی کا ممبر آپ نے مجھے بنایا ہے مجھے اس کی ممبری منظور ہے۔ انشاءاللہ کچھ خدمت ہو سکے گی۔ والسلام

سید سلیمان
۲۵ر اپریل ۱۹۳۹ء

(۱۱۵)

۶۳۲۴ - ۱۶ر مارچ ۱۹۴۰ء

مکرمی!

کارڈ پہنچا۔ غلط نامہ بھیج دیا گیا ہے۔ امید ہے اب موصول ہو گیا ہوگا۔

براہِ کرم اس کی کتابت میں بدرجۂ غایت احتیاط سے کام لیں۔

اس خط کے ساتھ مطبوعات کا اشتہار مرسل ہے۔ اسے سرورق کے دوسرے اور اندرونی صفحے اور آخری ورق کے دونوں جانب شامل کریں۔ اس امر کا لحاظ رکھیں کہ اشتہار صفحات مذکورہ بالا کے اندر آ جائے۔ خط خواہ کتنا ہی باریک ہو، کچھ مضائقہ نہیں۔ اشتہار غلطیوں سے بالکل پاک ہونا چاہیے۔ والسّلام

سید سلیمان

کے سلسلے میں "کتابی دنیا" کے نام سے رسالہ جاری کیا تھا۔ اس کا یہ مقصد بھی تھا کہ اردو مطبوعات کا علمی حلقوں میں تعارف اور ان کا حلقۂ اشاعت وسیع کیا جائے اور نظامی بک ایجنسی سے ہندوستان کے تمام علمی و اشاعتی اداروں کی مطبوعات کی فراہمی کی سہولت پیدا کی جائے۔ اس سلسلے میں دارالمصنفین کو جو خط لکھا گیا تھا اس کا یہ جواب ہے۔

(۱۱۶)

مکرم! السلام علیکم

آپ کی بار بار کی یاد فرمائی کا شکریہ تہِ دل سے ادا کرتا ہوں۔ آپ لوگوں کی بڑی عزت میرے دل میں ہے کہ اِس انہماک سے آپ لوگ بے غرض قومی خدمت ہیں، اور اِس عمر میں انجام دے رہے ہیں۔ آیندہ نہ صرف یہ کہ ان کاموں کا کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا بلکہ اس کا احساس رکھنے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا۔

مجھے اس پر بھی ندامت ہے کہ آپ نے جلسے کی شرکت بلکہ صدارت کی عزت بھی پیش فرمائی، مگر مجھے توفیق سفر نہ ملی۔ اصل وجہ تو یہ ہے کہ آج کل مجھے اختلاج کا دورہ ہے۔ قلب کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ جب یہ صورت ہوتی ہے تو معمولی کام بھی مجھے پہاڑ معلوم ہوتے ہیں اور سفر تو بڑی بات ہے۔ دوسری چیز اس میں یہ شامل ہو گئی تھی کہ انھیں تاریخوں میں ہمارے اور آپ کے دوست ڈاکٹر سید محمود صاحب ہمارے ہاں آ رہے تھے۔ چناں چہ وہ آج کل یہاں تشریف فرما ہیں۔ ان کو چھوڑ کر جانا ممکن نہ تھا۔

بہرحال آپ سے اور جناب مولوی سید طفیل احمد صاحب سے عفو طلب ہوں اور دعاؤں کا خواست گار ہوں۔ والسّلام

سیّد سلیمان۔ ۲۵ر فروری ۱۹۴۱ء

علامہ محمد حسین محوی لکھنوی:

(۱۱۷)

دار المصنفین۔ اعظم گڑھ

محبّ مکرم۔ السلام علیکم۔

مدت کے بعد یاد فرمایا ـــــ مگر بہرحال یاد فرمایا۔ آپ کی غزل "معارف" کے نذر ہو گئی!

آپ کی کتابوں پر ریویو اور ذکر تو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ جہاں تک یاد ہے اس سلسلے کا کوئی فرض میرے سر نہیں۔ "فتوح السلاطین" کے بارے میں تو مدراس یونیورسٹی کے مقابلے

میں شکست ہوئی۔ اس پر ایک طویل ریویو "معارف" میں نکل رہا ہے۔

مولانا بخاری الگ ہو رہے ہیں یا کیے جا رہے ہیں، مجھے بالکل علم نہیں ع

درین ورطہ کشتی فرو شد ہزار

والسلام

سید سلیمان

۲۳ر جولائی ۱۹۳۹ء

مالک رام

(۱۱۸)

دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ

جناب من تسلیم!

آپ کے سب خط ملتے رہے۔ پوسٹل آرڈر بھی ملا تھا۔ بارہا جواب دینے کو جی چاہا، مگر تواترِ سفر اور اس حیلہ سے کہ آپ اتنی دور پہنچ گئے ہیں، جواب میں توقف ہوتا رہا۔ میں بحمد اللہ مع الخیر ہوں، اور آپ کے لیے دائمی خیر!

آپ کا رسالہ بھی بہ حفاظت میرے پاس ہے۔ واپس اس لیے نہیں کرتا کہ مجھے اس پر کچھ لکھنا پڑے گا اور اگر آپ میری تحریر کے بغیر واپس کرنے کو کہیں تو میں ہر وقت واپس کر سکتا ہوں۔ بعض مقامات تصحیح طلب ہیں۔

اب آپ کی عربی گفتگو تو پوری رواں ہو چکی ہو گی۔ ابھی لاہور گیا تھا، آپ کے احباب سے ملاقات ہوئی۔ پرچہ گزشتہ مارچ سے آپ کے نام جاری کر دیا گیا ہے۔ پوسٹل آرڈر میں غلطی تھی۔ اس لیے وہ آپ کے نام ۱۹ر مارچ ۴۰ء کو واپس کر دیا گیا ہے کہ دوبارہ بھیج دیں۔ والسلام

سید سلیمان

۲۳ر اپریل ۱۹۴۰ء

⑪⑨

دار المصنفین اعظم گڑھ

مکرم تسلیم!

آپ کے خط ملتے رہتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ جواب بھی آپ کو ملتا ہے یا نہیں۔ ہندوستان خوش ہے اور انتظار کے دن دیکھ رہا ہے[1]۔

آپ کی کتاب کا مسودہ اب تک میرے پاس رکھا ہوا ہے۔ اس میں چند باتیں تنقید کے قابل ہیں یہاں کسی کا نام بتائیے تو اُس کو یہ امانت سپرد کردوں۔

سید سلیمان

۹ر فروری ؁۴۳ء

⑫⓪

دار المصنّفین اعظم گڑھ

کرم فرمائے من آداب عرض ہے۔

ایک زمانے کے بعد آپ نے یاد فرمایا۔ گزشتہ زمانے میں تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ جو جہاں ہے وہ وہاں ہے بھی یا نہیں۔ خیر یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ اپنی جگہ پر ہیں اور بخیریت ہیں۔

آپ نے میرے خط نہ لکھنے کی شکایت کی ہے۔ صحیح ہے ایک تو بُعد مکانی، پھر میری صحت کی خرابی اور اس پر سستی، جو تقاضائے عمر و طبیعت ہے۔ یہ سب امور اب جمع ہیں۔ اس لیے بجز اس کے کہ احباب معاف فرمائیں اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے۔

آپ کے مضمون میں بعض باتیں تصحیح طلب ہیں۔ مضمون پر نشان بنا دیا گیا ہے۔ اور الگ کاغذ پر ایک نوٹ بھی ہے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اس زمانے کے کسی مدعی اجتہاد اہل قرآن سے مشورے لیے ہیں۔ وہ اُن کے ذاتی افکار ہیں۔ اُن کا تعلق اسلام کے قانون و شریعت سے نہیں۔

آپ کا یہ مضمون آپ کے دوست کے نام بھیجا جا رہا ہے۔

---

[1] مراد یہ ہے کہ تحریک آزادی ٹھیک چل رہی ہے اور کامیابی کا انتظار ہے۔

نگار میں نہیں دیکھتا۔ آپ کا جو مضمون اس میں نکل رہا ہے، وہ بھی نہیں دیکھا۔ اب تو پابندیاں کم ہو رہی ہیں۔ کچھ مصر کے اجتماعی و تمدنی و اخلاقی و تعلیمی احوال و ترقیات سے باخبر کر سکتے ہیں۔ اُس کا مستقبل آپ کی نگاہ میں کیا ہے؟

معارف کے لیے کنٹرولر کو لکھا جائے گا۔ دیکھیے کیا جواب ملے۔ والسلام

سید سلیمان ندوی

۳۰؍دسمبر سنہ ۱۹۴۵ء

(۱۲۱)

دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ

مکرم تحیت و تسلیم!

آپ کا والا نامہ ملا۔ آپ نے معارف کے ساتھ جس محبت اور قدردانی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ مستحق شکریہ ہے۔ ڈاکخانے سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مصر پارسل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے "حیات شبلی" "دبیر افغانستان" بھیجنے سے معذوری ہے۔

دفتر سے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ گزشتہ برسوں کے حسب ذیل پرچے مل سکتے ہیں۔ باقی آؤٹ آف اسٹاک ہیں۔

سنہ ۴۱ء مکمل ۱۲ پرچے ہیں۔

سنہ ۴۲ء ۸ پرچے۔ مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اکتوبر، نومبر، دسمبر

سنہ ۴۳ء ۴ پرچے۔ مارچ، اپریل، نومبر، دسمبر

سنہ ۴۴ء ۸ پرچے۔ اپریل، جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر۔

سنہ ۴۵ء فروری، مارچ، جون، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر۔

لغتہ وارجہ کے متعلق مولانا شبلی صاحب اپنے سفرنامہ میں جو کچھ لکھ چکے ہیں۔ یا میری لغات جدیدہ میں جو کچھ ہے، اُس کو پڑھ کر دیکھیں۔

کہیے آپ نے اتنے دنوں تک مسلمانوں کو تو دیکھا، اسلام کو بھی دیکھا۔ وہ اسلام نہیں، جو بازاروں میں اور شہروں میں ہے۔ وہ اسلام جو کتابوں میں ہے۔ میرے خطبات مدراس کا عربی میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ کیا کسی اچھے عربی پریس میں آپ اُس کے چھپوانے کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ میں اپنے مصر کے پرانے احباب سے بالکل لاعلم ہوں، ورنہ اُن سے کام لے

سکتا تھا۔ یہ خطبات سیرۃ نبوی پر ہیں۔ والسلام

سید سلیمان
۴۲ر مارچ ۱۹۴۶ء

(۱۲۲)

مکرم تسلیم وتحیت!

والانامہ ملا۔ بل مرسل ہے۔ خطبات مدراس ہنوز عربی میں مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ضخامت غالباً ۲۰۰ صفحوں کی ہوگی۔ تقطیع معارف کی۔

بحمد اللہ اچھا ہوں۔ گو کسی کام کے قابل نہیں۔

"خطوط شبلی" معمولی خطوط ہیں۔ حسن وعشق کی داستان کا رنگ اس کو مولوی عبد الحق اور امین زبیری نے دیا ہے۔ نہ مجھے اس سے واقفیت اور نہ وہ میرے علم میں ہے۔ اس لیے میں لکھنے سے قاصر ہوں۔ جو صاحب اس سے واقف ہوں وہ لکھیں چنانچہ امین زبیری نے ابھی تبصرہ بر "حیات شبلی" لکھا ہے اور چھاپا ہے۔ اس میں ان واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، جو سرتاپا ظنِ فاسد ہے والسلام

سید سلیمان
۱۶ر جون ۱۹۴۶ء

سید ابو عاصم وابو خالد

(۱۲۳)

سید صاحب کے چچازاد بھائی سید ابو داؤد کے انتقال (۱۰ر رمضان ۱۳۶ھ)
پر بھتیجوں کے نام تعزیت کا خط

دار المصنفین۔ اعظم گڑھ

عزیزانِ من! دعا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ کل پہلے رشید چچا اور بعد کو سہیل کا تار ملا۔ تار کیا تھا، جانِ خزیں پر بجلی گری۔ تمہارا باپ اور میرا بھائی اس دنیا سے چل بسا۔ وہ بھائی جس نے ہمیشہ مجھ کو اپنا عزیز ترین بھائی سمجھا اور جس نے اخیر وقت مجھ سے سب سے بڑھ کر محبت کی۔ جس کو میری ہر ادا پیاری اور ہر ترقی پیغام خوشی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی موت سے میں اس دنیا میں قوی دل تھا۔ وہ میرا رازداں، میرا ہمضمیر، میرا اجزو دل تھا۔ افسوس کہ میں

اس دنیا میں اکیلا رہ گیا۔

عزیزو! تمہارا یتیمی کا داغ کس سے دیکھا جائے گا۔ آؤ! آج سے ہم تم ایک نیا رشتہ باندھیں۔ تم میرے بیٹے وہی ہو جو سہیل۔ وہ ماں سے محروم تم باپ سے۔ اب تینوں میرے لختِ جگر۔

جانتا ہوں کہ دنیا یوں ہی رہی ہے اور یوں ہی رہے گی۔ آج وہ کل ہماری باری ہے، اس لیے مجھے بھی مسافر ہی سمجھو۔ خدا تم تینوں بھائیوں کو پھلنا پھولنا نصیب کرے۔ آمین

غم نصیب ماں کو میرا اسلام کہو۔ وہ بڑی صابر و شاکر ہیں۔ یہ صبر و شکر ان کی زندگی کے اس سب سے بڑے مرحلے میں بھی ان کی مدد کرے گا۔ غم زدہ شاہدہ کو دعا۔

عزیزو! تم بھی خدا کے بھروسے پر صبر و شکر کی ہمت دکھاؤ کہ تمہاری ماں کی تسلی اور کم سن بہن کی تشفی کا باعث بن سکو۔

آہ! میں کیا لکھوں ۹ اور ۱۰ رمضان کی دونوں راتوں کو جب میں نے ان کی صحت عاجلہ و کاملہ کی بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگی تو دونوں مرتبہ بار بار ان کی بیماری کی شکل ہمارے سامنے آجاتی تھی۔ میں اس خیال کو بہ زور دفع کرتا تھا اور دعا مانگتا تھا اور پھر وہی نقشہ سامنے آجاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ میرے بھائی کو مغفرت سے نوازے اور بخشش سے سرفراز کرے۔

کل صبح ہی سے میرے گھر میں ایسی اُداسی چھائی تھی کہ لڑکیاں تک اور سلمان کی ماں[1] تک کہتی تھیں کہ ایسا کیوں معلوم ہوتا ہے۔ بالآخر ایک بجے دن کو تار آیا اور حقیقت کا پردہ چاک ہوا۔ سب دردمند اور سب کی آنکھیں اشک بار ہیں۔

عزیزو! خدا پر اعتماد رکھو۔ وہی سب کا سہارا ہے۔ اسی سے مدد چاہو۔ انسان فانی، اس کی ہر چیز فانی۔ کل من علیہا فان۔

۱۴ رمضان کو تراویح ختم کر کے ۱۵ رمضان کو دینہ کا قصد ہے۔ ۱۶ کو شاید پہنچوں۔ عزیزو! دعا۔

دردمند، شریکِ غم
سید سلیمان

۱۲ رمضان سنہ ۱۳۶۰ھ[2]

---

[1] یہ سید صاحب کی دوسری بیوی اور سلمان صاحب کی سوتیلی اگرچہ مثل سگی والدہ تھیں۔۔۔ ۱۹۸۹ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

[2] مطابق ۳ اکتوبر ۱۹۴۱ء

مولوی مشیت اللہ قادری

(۱۲۴)

مکتوب الیہ: والدی مولوی مشیت اللہ قادری (پیدایش ۱۸۸۹ء) قصبہ آنولہ ضلع بریلی کے عمائد میں تھے۔ فارسی زبان و ادب اور تاریخ و انساب پر عالمانہ دسترس رکھتے تھے۔ تجارت، و سیاحت مشغلہ رہا۔ مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم سے نہایت مخلصانہ تعلقات تھے۔ بمبئی، دہلی اور اودھ میں قیام رہا۔ علامہ سلیمان ندوی سے مختلف اوقات میں ملاقات ہوئی۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں وارد پاکستان ہوئے۔ دادو (سندھ) میں قیام رہا۔ اور وہیں ۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کو انتقال ہوا۔ (ایوب قادری)

مخدومی دامت الطافکم۔ السلام علیکم!

آپ کا والا نامہ ملا۔ دلی مسرت ہوئی۔ اعظم گڑھ ہی نہیں بلکہ بمبئی اور دہلی کی ملاقاتیں بھی یاد ہیں اور پھر مولانا عبدالماجد قادری[1] مرحوم کی یاد نے تو تڑپا دیا۔ ؏

ایک تیر تھا جو ہائے کلیجہ کے پار تھا

ہمارے یہاں حضرت سمنانیؒ[2] کے مکتوبات کا کوئی نسخہ نہیں ہے علی گڑھ کا نسخہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ ممکن ہے رام پور میں ہو۔ گلستان رحمت[3] ہمارے یہاں موجود ہے۔ "رحمت عالم[4]" کے مطلوبہ نسخے ارسال خدمت ہیں۔ فقط والسلام

سید سلیمان
۲۴ر جنوری ۱۹۴۱ء

---

[1] نامور عالم و مقرر اور تحریک خلافت کے قائد مولانا عبدالماجد قادری بدایونی (ف ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء)

[2] حضرت مخدوم جہانگیر اشرف سمنانیؒ (کچھوچھہ)

[3] حافظ رحمت خان اور دور روہیلہ کی تاریخ

[4] علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرت طیبہ پر مختصر کتاب

سید وحید احمد قیصر ندوی

ان خطوط پر حواشی مرحوم مکتوب الیہ کے قلم سے ہیں۔ جہاں مرتب نے کوئی حاشیہ اضافہ کیا ہے، وہاں صراحت موجود ہے۔

(۱۲۵)

دار المصنفین اعظم گڑھ

۱۰ر فروری ۴۳ء

عزیزم سلمۂ السلام علیکم

آپ کے خیالات معلوم ہوئے، ابھی آپ طالب علم ہیں آپ دو سال تک پورے انہماک سے تعلیم میں معروف رہیں۔ پہلے طلب علم میں کمال پیدا کیجیے تو دنیا خود آپ کے پاؤں چومے گی۔ یہ شعر اکثر پڑھا کیجیے۔

"کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی"

والسلام

سید سلیمان ندوی

(۱۲۶)

دار المصنفین اعظم گڑھ

عزیز مکرم! دعا

السلام علیکم، تمہارا خط ملا۔ خوشی ہوئی کہ تم نے میری فہمایش[1] کو گوش قبول سے سنا اور عمل کا خیال کیا[2]۔ یہی آیندہ کی کامیابی کی راہ ہے، کسی دعوت کی کامیابی کی سب سے پہلی کنجی خود داعی کی مٹھی میں ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جس دعوت کو لے کر کوئی اُٹھے وہ اس پر خود عامل ہو نظری داعی نہ ہو۔ بلکہ عملی داعی ہو۔ آپ کلمہ اور نماز پر خود عامل رہیں اور مختلف اوقات میں مختلف مسجدوں میں جا کر اس پر مختصر اور سادہ تقریریں کریں اور بے تکلف احباب اور ملنے جلنے والوں سے اسی تحریک و دعوت پر گفتگو کرتے رہیں۔ یہ جوش و انہماک

---

[1] حضرۃ الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے داڑھی منڈوانے پر فہمایش فرمائی تھی۔

[2] لیکن وہ آخر تک داڑھی منڈاتے ہی رہے (س۔ ش)۔

خود لوگوں کو متوجہ کرے گا۔ آپ نے قرآن میں بار بار پڑھا ہے وما علی الرسول الا البلاغ اس کا تجربہ کیجیے داعی کا کام دعوت کا پہنچا دینا ہے۔ منوا دینا نہیں ہے۔ خوب سمجھ لیجیے شرط یہ ہے کہ آپ محض اخلاص باللہ اور شفقت بالمسلمین کے جذبہ سے کام کریں اپنی تعریف اور دوسرے خود غرضی کے لیے نہ کریں۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی خدمت کو قبول فرمائیں۔ والسلام

سید سلیمان

۱۴؍ رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۲ھ[ع]

(۱۲۷)

دارالمصنفین اعظم گڑھ

عزیز مکرم! دعائے خیر۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط مورخہ ۱۹؍ شعبان ملا۔ میں سفر میں تھا۔ شکریہ کہ آپ نے یاد کیا اور یاد رکھا۔ انگریزی[لہ] پڑھنے میں بہ حیثیت زبان تو کوئی حرج نہیں مگر تجربہ شاہد ہے کہ اس چکر میں جو پڑا ہے پھر وہ اس سے نکل نہ سکا اور ساتھ ہی اس گرداب میں دین و ایمان کو بھی ڈبو بیٹھا۔ میں تو اس کی رائے کبھی نہ دوں گا آپ کے والد نے جس دن آپ کو عربی تعلیم کے لیے حوالہ کیا تھا تو اُن کا مقصد یہی ہو گا کہ وہ آپ کو دین کی خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ کے نذر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ عربی تعلیم کے بعد کسی بڑی نوکری کی امید تو وہ کر نہیں سکتے تھے اب جب آپ نے بفضلہ تعالیٰ تکمیل کر لی تو اُن کی نیت کیوں بدل گئی کہ اب وہ دیدہ و دانستہ آپ کو باطل کے نذر کرنا چاہتے ہیں اور گزشتہ حسن نیت کے ثواب کو بلکہ عمل کو ضائع کرتے ہیں باقی رہی روزی تو وہ تو ان شاء اللہ تعالیٰ موعود ہے وہ تو ملے گی۔ خواہ کم ہو یا زیادہ۔ حرص دنیا کا تقاضا یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کا طلب گار ہوتا ہے حالاں کہ اگر زیادہ ملنا مقدر نہیں تو سب کچھ کرتے بھی نہیں ملے گا۔ کیا ہزاروں بی اے اور ایم اے ٹھوکریں نہیں کھاتے پھرتے لیکن کوئی مولوی کبھی بیکار محض نہ ملے گا۔ خصوصاً اگر اُس نے کچھ بھی امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ آپ چاہیں تو رمضان بعد آکر یہاں دیکھیں اور میں آپ کو دیکھوں کہ آپ سے کیا کام لیا جا سکتا

[لہ] لکھنؤ میں ۱۹۴۳ء ندوۃ العلماء سے فاضل میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد میں نے وہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اور اب میں کالج میں داخل ہونا چاہتا تھا۔

[ع] مطابق ۱۴؍ ستمبر ۱۹۴۳ء

ہے۔ تاکہ آپ کو اس میں لگایا جائے۔

تعلیم کے بعد ضرورت تربیت کی ہوتی ہے اس کے بغیر آدمی کندۂ ناتراش ہوتا ہے۔ رمضان المبارک میں آپ وہاں لوگوں کو ترجمۂ قرآن کریم سنائیے، آپ کر سکتے ہیں!

والسّلام

سیّد سلیمان۔ ۲۰ر شعبان ۱۳۶۴ھ عہ

۱۶۸

دیسنہ، ضلع پٹنہ

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں تین ماہ سے باہر ہوں۔ اب اعظم گڑھ اور وہاں سے بھوپال جا رہا ہوں۔ آپ جولائی کے اوائل میں خط لکھیں۔ اللہ تعالیٰ کچھ مناسب بندوبست فرما دیں بشرطیکہ آپ مستعد اور تیار اور کسب کمال کے لیے مشکلات پر عبور کا عزم بفضلہٖ تعالیٰ و حوصلہ رکھیں۔

اپنے والد صاحب محترم کو سلام کہہ دیں۔ والسّلام

۱۱ر جون ۱۹۴۶ء
سید سلیمان

۱۶۹

دارالمصنّفین۔ اعظم گڑھ

برادرم مولوی وحید احمد صاحب دام سعدہ! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں یہاں چند روز پہلے آیا ہوں، یہاں کے انتظامات کو دیکھنا تھا۔ آپ اب یکم جولائی تک[2] یہاں ضرور چلے آئیں، میں چند سے ابھی باہر رہوں گا، یہاں کتب خانہ میں بیٹھ کر آپ کو کم از کم چند ماہ صرف مختلف کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتے ہوں گے، میری غیر حاضری میں مولانا عبدالسلام[3] صاحب اور مولوی شاہ معین الدین[4] صاحب آپ کی تعلیم و تربیت کریں گے، اور بذریعہ مکاتیب مجھ سے صلاح و مشورہ چاہیں گے۔ اب آپ

---

[1] جناب سید شاہ رشید احمد صاحب منعمی مدظلہٗ [2] مجھے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالمصنّفین اعظم گڑھ کا رفیق بنا کر بلوا لیا تھا۔ وہاں میں تقسیم تک تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل کرتا رہا [3] مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم مصنّف شعر الہند، اقبال کامل وغیرہ۔ [4] مولوی شاہ معین الدین ندوی ایڈیٹر معارف مصنّف تاریخ اسلام وغیرہ

عہ مطابق ۱۰ر اگست ۱۹۴۵ء۔

عزیمت کے ساتھ آجائیے اور یہاں اگر مولانا مسعود علی؎ صاحب سے ملیے وہ آپ کا سارا انتظام کردیں گے۔ انتظامی نگرانی ان کی رہے گی اور ان کی اطاعت بہرحال میں ضروری ہے، آپ کو سردست للعہ ماہوار وظیفہ ملے گا۔

باقی ہدایات خطوط؎ سے ملتے رہیں گے۔ والسلام

۱۹ جون ۱۹۴۶ء سید سلیمان

۱۳۰

بھوپال

عزیزی ادعائے خیر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کا آنا مبارک۔ خدا کرے کہ آپ کا اور میرا مقصد پورا ہو اور آپ کی آمد دارالمصنفین کے لیے مفید اضافہ ہو۔

ابھی کم ازکم دو سال آپ کو صرف مطالعہ کتب میں بسر کرنا چاہیے۔ ابن خلدون دیکھ لیں۔ پھر شاہ ولی اللہ صاحب اور ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کل کتابیں پڑھ ڈالیں۔ امام رازی کی تفسیر اور ابن جریر طبری کا مطالعہ کیا کریں، اسلوب تحریر کے لیے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا۔ خصوصاً الفاروق، سیرۃ النعمان اور شعرالعجم، الکلام اور علم الکلام بھی پڑھ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے مسائل سے آپ کے عقیدہ کی پختگی میں فرق نہ آئے، ان کتابوں سے معلوم ہوگا کہ علمی مسائل کس طرح آسانی اور ترتیب لفظی کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔

ادب اگر کمزور ہے تو جاحظ کی کتابیں دیکھیں۔

مولانا عبدالسلام صاحب سے سوال کیجیے، کوئی کتاب جیسے فوزالکبیر یا حجۃ اللہ البالغہ یا حماسہ ان سے شروع کرکے عربی عبارت لکھ کر ان کو دکھائیے۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ کا دل مطالعہ میں خوب لگتا ہے۔

مطالعہ کا اوّل اصول یہ ہے کہ عبارت سے صرفاً ونحواً ولغۃً وکلاماً صحیح مطالب

؎ ناظم دارالمصنفین۔ ؎ حضرت سید صاحب مرحوم ریاست بھوپال کے امیر جامعہ اور قاضی القضاۃ کے عہدے پر تشریف لے گئے تھے۔ وہ مجھے برابر خطوط سے ہدایات دیتے رہتے تھے۔

اخذ کریں اور پھر لفظ کو چھوڑ کر اصل مسئلہ کو سمجھیں اگر کوئی لغت آجائے تو مراجعت لغت میں سہل انگاری نہ کریں، ضرور مراجعت کریں اور لفظ کے اصل معنی کو سمجھیں۔

امید ہے کہ مولوی وحیدالرحان[1] صاحب بھی آگئے ہوں گے۔

جماعت کی پابندی اور سحرخیزی کی عادت کریں۔ صبح کی نمازیں خود پہلے اٹھیں، نہ کہ کسی کے اٹھانے کے منتظر رہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت کیا کریں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ فضل فرمائیں۔ اخلاص ہر کامیابی کی اصل ہے۔ والسّلام

۷ شعبان ۱۳۶۵ھ عہ
سیّد سلیمان

(۱۳۱)

دارالمصنّفین۔ اعظم گڑھ

برادرم سلمہ اللہ تعالےٰ،

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ، خط ملا، خوشی ہوئی کہ سلسلۂ مطالعہ ذوق و شوق سے جاری ہے۔ آپ خط میں لکھتے ہیں "یادآوری" کا تہ دل سے ممنون ہوں، یادآوری کا استعمال اُس موقع پر کیا جاتا ہے جب کوئی غیر متوقع طور یاد کرے، میرے آپ کے درمیان یہ رشتہ نہیں، انشا پردازی بڑی یہ ہے کہ کوئی لفظ کس موقع پر لکھا جائے۔

حجۃ اللہ البالغہ سے پہلے شاہ صاحب کی بدور البازغہ دیکھیے، اُس میں بھی بعض ابواب حروف و مقطعات وغیرہ محض ذوقی ہیں، بدور البازغہ حجۃ اللہ البالغہ کا مقدمہ ہے۔ سیرۃ نبوی کی جلدیں ضرور پڑھ لیں، یہ سیکڑوں کتابوں کا خلاصہ ہے اور نہ صرف سیرت ہے بلکہ علم کلام ہے۔

مولوی عبدالسّلام صاحب سے بعد رمضان ملاقات ہوگی مگر آپ کے استاذِ قدیم مولوی[2] ناظم صاحب بھی تو ہیں، ایک مہینہ ان سے فائدہ اٹھائیے۔

واقعہ[3] قتل کی خبر سے تکلیف ہوئی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ والسّلام

۲۴ جولائی ۱۹۴۶ء
سیّد سلیمان

---

[1] میرے ساتھ ہی یہ بھی بحیثیت رفیق دارالمصنّفین کے اعظم گڑھ آئے تھے۔ بچھرایوں ضلع مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ عہ مطابق ۷ جولائی ۱۹۴۶ء [2] مولانا محمد ناظم ندوی پرنسپل جامعہ عباسیہ بہاولپور مغربی پاکستان۔ [3] بندول ضلع اعظم گڑھ کے ایک رئیس محمد احمد مرحوم جو مولانا عبدالسلام ندوی کے رشتہ دار تھے۔ انھیں ان کے بعض زمیندار دشمنوں نے اعظم گڑھ اور بندول کے راستے میں قتل کرادیا جب کہ وہ اعظم گڑھ کچہری سے ایک مقدمہ کی پیروی کے بعد گھر سے بندول جا رہے تھے۔

(۱۳۲)

بھوپال

برادرم مولوی وحید احمد صاحب ندوی ازادکم اللہ تعالیٰ علماً وعلاً۔

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کا خط مورخہ ۵ ر رمضان المبارک مل گیا تھا۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ مطالعہ میں دلچسپی کے ساتھ معروف ہیں اللھم زد فزد آپ اسی طرح معروف رہیں انشاء اللہ تعالےٰ آپ پر راہیں کھلیں گی۔ روزہ کی حدت بعضوں کو زیادہ محسوس ہوتی ہے، لیکن ثواب بھی ونھی النفس عن الھویٰ اور نضو علی المکابرۃ کے اصول پر اسی مرتبہ کے ساتھ ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں، آپ برابر مطالعہ میں معروف رہیں میں چند روز کے لیے انشاء اللہ تعالےٰ آؤں گا اور آپ لوگوں سے ملوں گا۔

میرا آنا وسط شوال میں ہوگا یا ۲۰ شوال تک۔

ابھی تو آپ آئے ہیں، گھر کی لے عید میں کیا رکھا ہے، بہرحال اگر قلب کو اطمینان عزیمت کی عید میں میسر نہ ہو تو چلے جائیے مگر جلد واپس آجائیے۔

عزیز من! علم کا نتیجہ عمل ہے، ظاہر و باطن دونوں میں شریعت کے مطابق انقلاب چاہیے، قصِّ لحیہ ہمارے استاذ مرحوم کو سخت ناپسند تھا، جماعت کی پابندی بھی ضرور ہی اختیار کی جائے، بڑی برکات کی چیز ہے، وقت میں وسعت اور برکت ملتی ہے۔

مولوی وحید الرحمان صاحب کو سلام کہہ دیجیے۔ والسّلام

۲۲ ر رمضان ۱۳۶۵ھ ؏

سیّد سلیمان

(۱۳۳)

بھوپال

عزیزی سلمکم اللہ تعالیٰ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

کسی مضمون کے لیے مواد ملنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی مطالعہ کرتا رہتا ہے، اس میں کسی خاص قسم کی بات جب متعدد پاتا ہے تو اس کو نوٹ کرتا جاتا ہے۔ پھر مزید تلاش سے اس قسم کے واقعات ملتے ہیں تو ایک موضوع پر مضمون تیار ہو

ھ مطابق ۲۱؍ اگست ۱۹۴۶ء

چاہتا ہے۔

میرے وہ شذرات[1] اب شائع نہیں ہوں گے۔ وقت گزر چکا، اب دوسری فضا ہے!

آپ جنوری میں چند روز کے لیے مکان جانا چاہتے ہیں تو ہو آئیں میرا ادھر آنا نہ ہوگا۔

اس فتنہ میں مسلمانوں کے بہادرانہ مقابلہ کے جو محقق واقعات آپ کو اثنائے سفر معلوم ہوں ان کو باحتیاط نوٹ کرکے رکھیے گا میں اس قسم کے واقعات کو جمع کرنا چاہتا ہوں۔ والسلام

۳۰ر ستمبر ۱۹۴۶ء
سید سلیمان

(۱۲۴)

بھوپال

برادرم مولوی وحید احمد صاحب دام توفیقکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کا خط ملا، پڑھ کر خوشی ہوئی، ظاہر و باطن دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، آپ کے احوال وکیفیات کے صلاح سے دل مسرور ہوا۔ اللھم زد فزد۔ میں اپنے دوستوں کے لیے اور دارالمصنفین کے لیے ہمیشہ دعاگو رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول کرے۔

امید ہے کہ آپ کا مطالعہ جاری ہوگا! والسلام

۱۶ر شوال ۱۳۶۵ھ عسہ
دعاگو، سید سلیمان

(۱۲۵)

بھوپال

عزیزی! السلام علیکم ورحمۃ

سیرۃ[2] النبی کا مقابلہ شدہ نسخہ سید اسلم صاحب کے حوالے کردیجیے وہ مجھے بھیج

---

[1] ۱۹۴۶ء میں صوبہ بہار میں جو قتلِ عام ہوا تھا اس کے متعلق حضرۃ الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے معارف کے لیے ایک اداریہ سپردِ قلم کیا تھا اتنا سخت اور اتنا جذباتی اداریہ حضرۃ الاستاذ نے اس سے پہلے کبھی نہیں لکھا تھا۔ بعض وجوہ کی بنا پر حضرت مجید صاحب نے اس اداریے کی اشاعت روک دی۔ یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

عسہ مطابق ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء۔

[2] سیرۃ النبی جلد اول طبع چہارم کے پروف دیکھنے اور اصل ماخذ سے مقابلہ کرنے کی ذمہ داری حضرۃ الاستاذ نے مجھے سونپی تھی۔

دیں گے، رجسٹرڈ۔

الجغرافیہ عند العرب[1] کا ترجمہ مسلسل کیجیے گا اور جب ترجمہ ہو جائے تو میرے پاس بھجوا دیجیے گا۔

صوبہ بہار کے حالات ہوش ربا ہیں، تاہم صبر اور استقامت کا مقام ہے۔ اپنے والد صاحب کو سلام کہہ دیجیے۔

کل انشاء اللہ تعالیٰ چند روز کے لیے دہلی جوبلی[2] میں جاؤں گا۔ ۲۰ تک واپسی ہوگی۔ یہ کارڈ اسلم[3] صاحب کو بھی دکھا دیجیے گا۔ پشت پر ان کو لکھا ہے۔ والسلام

سید سلیمان

(۱۳۶)

اسلم صاحب کے نام:

برادرم! السلام علیکم

آج سہارن پور سے خط آیا، عزیزہ سلمہا کی خیریت معلوم ہوئی بحمد اللہ اب اچھی ہیں۔ کل میں دہلی جا رہا ہوں۔ سہارن پور بھی جاؤں گا اور کچھ عجب نہیں کہ والدہ سلمان بھی ساتھ آسکیں۔ سلمان بھی جائیں گے۔ رجسٹری کا کوئی پتا پوچھنے یہاں نہیں آیا۔ آپ نمبر اور چکوں کے پتے اور تعداد رقم لکھیے۔ ایک بیمہ کتاب مولوی مسعود علی صاحب کے نام مع چک بھیجی ہے، رسید سے مطلع کیجیے۔

عبدالحکیم چچا کے نام سیرت عائشہ جدید کا ایک نسخہ ہدیۃً بھجوا دیجیے۔ استدراک عائشہ علی الصحابہ عربی کے پانچ نسخے مجھے بھجوا دیجیے۔

۱۴ر نومبر ۱۹۴۶ء

سید سلیمان

(۱۳۷)

بھوپال

عزیزی مولوی وحید احمد صاحب وفقکم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

---

[1] حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا عربی مضمون جو عربی رسالہ "الضیا" میں قسط وار چھپتا رہا اس کا ترجمہ میں نے مکمل کر لیا تھا۔ یہ کتاب مکمل صورت میں میرے پاس موجود ہے۔ [2] جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی سلور جوبلی [3] سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے برادر نسبتی۔

آپ کا کارڈ ملا، الجغرافیہ عند العرب[1] کا ترجمہ آپ نے کر لیا اچھا کیا، وہ عربی مضمون ناتمام ہے، محتاجِ تکمیل ہے، ابھی اپنے ہی پاس رہنے دیجیے۔ کیا آپ کو جغرافیہ سے دلچسپی پیدا ہوئی؟

امید ہے کہ آپ کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہوں گے، اب اگر کسی موضوع پر لکھنے کو جی چاہے تو اس کے معلومات فراہم کیجیے اور پھر مجھ سے دریافت کیجیے۔ قرآن پاک کی تلاوت پر مداومت کیجیے، اور معنی پر غور کیجیے اور اس کے حل کرنے میں تفاسیر وغیرہ سے مدد لیجیے۔

اپنے حالات وخیالات سے مطلع کرتے رہیے۔ والسّلام

۱۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء سید سلیمان

۱۳۸

بھوپال

برادرم وفقکم اللہ تعالےٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کا خط ملا۔ آپ اسی طرح اپنے کاموں میں مصروف رہیں۔ جغرافیہ والے مضمون کی اصل اور ترجمہ رجسٹرڈ میرے پاس بھیج دیں، پہلے میں دیکھ لوں۔ عبدالقدوس صاحب ہاشمی کا البلاغ[2] میرے پاس آتا ہے۔

الحمدللہ خیریت ہے۔ والسّلام

سید سلیمان
۶ر مئی ۱۹۴۷ء

---

[1] اس کتاب کا مکمل ترجمہ "عرب اور جغرافیہ" کے نام سے میں نے کر لیا ہے۔ اس کتاب کی ایک نقل نظرثانی کے بعد میں نے حضرۃ الاستاذ کی خدمت میں بھوپال روانہ کی تھی۔ اصل مضمون کتابی شکل میں میرے پاس محفوظ ہے جس پر میں نے ابھی حال ہی میں نظرثانی کی ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہ کتاب لاہور سے شائع ہوگی۔

[2] البلاغ نام کا ہفتہ وار اخبار جناب عبدالقدوس ہاشمی ندوی کی ادارت میں حیدرآباد دکن سے نکل رہا تھا۔ یہ "عرب اور جغرافیہ" والا مضمون اسی اخبار میں قسط وار چھپوانا چاہتا تھا۔

۱۳۹

بھوپال

عزیزم وفقکم اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

کارڈ ملا۔ مضمون جغرافیہ کے دونوں چھپے ملے، آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ڈھائی ماہ سے مرض چشم میں مبتلا ہوں بہ مشکل ضروری کام کرتا ہوں، اب تخفیف وافاقہ ہے، مگر ابھی تک مرض گیا نہیں ہے اس لیے آپ کے ترجمہ کو پورا پڑھا نہیں ہے، جا بجا سے نظر ڈالی تو عبارت کے عدم روانی کا نقص نظر آیا، ترجمہ ایسا چاہیے جس سے انشا پردازی میں فرق نہ آئے، جو سطریں آپ کی سمجھ میں نہیں آتیں اُن کا ترجمہ کر لیا جائے گا[1]

خوشی ہوئی کہ آپ کچھ نہ کچھ کام کر رہے ہیں، زکریا رازی کا حال آپ نے لکھا تھا اور مولوی سعید انصاری کا پہلے ہی دیکھ چکے تھے، بہ ہر حال دونوں میں فرق تو ہوگا، دیکھنا تھا کہ آپ نے کیا لکھا تھا اور کیسا لکھا تھا، ابھی یہ سب مشق کی خاطر آپ کو کرنا پڑے گا۔ اس سے ملول نہ ہو جائیے کہ محنت ضائع گئی، محنت نہیں ضائع گئی کام آئی۔

آج یہاں ۷ /اگست کو انیسواں روزہ ہے، تراویح دروازہ پر مسجد ہے اُسی میں ہوتی ہے چوبیسواں پارہ ہے، دار المصنفین میں حافظ مجیب[2] اللہ صاحب پڑھتے ہوں گے۔

برادرم اسلم کو سلام کے بعد کہہ دیجیے کہ سب موسمی زکام و بخار سے ایک ایک دو دو روز بیمار رہے۔ سید حسین مع اہل و عیال ۲۹ /جولائی کو آئے تھے یہ غسل ان کو بھی دیا گیا اب سب اچھے ہیں، سید حسین مع اہل و عیال آج شام کے ایکسپریس سے سہارن پور واپس جا رہے ہیں۔

ہم لوگ اوائل اکتوبر کے جہاز انگلستان[3] سے جائیں گے ان شاء اللہ۔ رفقاء کو سلام کہہ دیجیے۔

سید سلیمان

۱۹، رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ[4]

---

[1] بعد میں دوبارہ میں نے تمام کمی پوری کر دی تھی۔ [2] رفیق دار المصنفین، مصنف اہل کتاب صحابہ وغیرہ۔ مجھ سے ایک سال پہلے دار المصنفین کے رفیق مقرر کیے گئے تھے۔ [3] بہ ارادۂ حج [4] مطابق ۶ /اگست ۱۹۴۷ء۔

(۱۴۰)

بھوپال

عزیزی! السلام علیکم

مضمون زکریا رازی پہنچا[1]، دیکھا، اس پر ایک مضمون معارف کی ابتدائی جلدیں مولوی سعید انصاری صاحب کا چھپ چکا ہے، آپ اس کو دیکھ لیں۔ اور پھر دیکھیں کہ آپ کا مضمون محض اس کا اعادہ ہے یا اضافہ ہے؛ اگر اعادہ ہے تو بیکار ہے اور اگر اضافہ ہے تو تمہید میں بڑھا دیجیے کہ اس پر مضمون گو معارف کے فلاں نمبر میں چھپ چکا ہے جس کو اتنے سال ہوئے اب اس درمیان میں بعض نئی معلومات سامنے آ گئی ہیں اس لیے نئے سرے سے اب اس پر لکھنے کی ضرورت ہے۔

جغرافیہ کا آخری حصہ ناتمام ہے[2] وہ شاید مطبوعہ نہ ہو قلمی ہو، اس کو بھی مکمل کیجیے۔

والسلام

سید سلیمان

۲ر اکتوبر ۱۹۴۷ء

(۱۴۱)

بھوپال

عزیز مکرم! دام توفیقکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ بے شبہ آپ کے کئی خط آئے اور یہ بھی صحیح ہے کہ میں نے جواب دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں دارالمصنفین کے انتظامی معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتا، جس کے ہاتھ میں کام ہے وہ جس طرح چاہیں چلائیں۔ آپ کے مستقبل کے لیے میری نیک دعائیں ہیں۔ میں اس وقت خود بھی بعض ایسے افکار میں مبتلا ہوں جس کا تعلق مستقبل سے ہے، اس لیے بالفعل کسی مشورے سے قاصر ہوں۔ ہندوستان کی صورت حال نے بےحد مضطرب کر رکھا ہے، دل یہ چھوڑنا چاہتا ہے، اور نہ کوئی دوسرا مرکز ابھی ملے نہیں، گو میں

---

[1] چیچک کے علاج کے موجد مشہور حکیم اور فلسفی زکریا رازی پر میں نے ایک طویل مقالہ لکھا تھا، جو بعد میں شائع ہوا۔ [2] جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مدظلہ کی عنایت سے حضرت الاستاذ کا غیر مطبوعہ مضمون مجھے مل گیا تھا جس کا ترجمہ میں نے مکمل کر دیا تھا۔

ترکِ وطن سے متفق نہیں مگر نہیں جانتا کہ کیا پیش آئے گا۔ والسّلام

سید سلیمان
۱۰ اپریل سنہ ۱۹۴۸ء

(۱۴۲)

بھوپال

برادرم، دعائے خیر۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ!

الحمد للہ تعالیٰ مع الخیر ہوں، آپ کا خط پاکر آپ کی خیریت سن کر خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ حصولِ رزق کے ساتھ علم و دین کی خدمت کی توفیق بخشیں، آپ کو مجھ سے جھجکنے کی کوئی وجہ نہ تھی میں اپنے سب عزیزوں کا خیر خواہ ہوں اور ان کا بھلا چاہتا ہوں[۱]

ہاں دارالمصنفین میں مجھے آپ کی اور آپ کو میری رفاقت حاصل نہ ہو سکی یہ حالات کا اقتضا تھا۔

ڈاکٹر اسحاق[۲] صاحب اور عندلیب[۳] شادانی صاحب کو میرا بھی سلام پہنچا دیجیے۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔

سلمان[۴] سلمہٗ جلالین شریف اور مشکوٰۃ شریف پڑھتے ہیں۔

معلوم نہیں یونیورسٹی میں ظفرالہدیٰ[۵] ہیں یا نہیں، کیا ان سے آپ کی ملاقات نہیں ہوتی؟

والسّلام
سید سلیمان
۱۲ فروری سنہ ۱۹۴۹ء

---

[۱] میں نے یہ خط ڈھاکے سے لکھا تھا [۲] ڈاکٹر محمد اسحٰق ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی انھوں نے دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ العلما لکھنؤ کی لائبریری میں حضرۃ الاستاذ کی زیرِ نگرانی علم حدیث پر ریسرچ کرکے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی تھی۔

[۳] ڈاکٹر عندلیب شادانی صدر شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی [۴] سید سلمان ندوی حضرۃ الاستاذ کے سب سے چھوٹے صاحب زادے انھوں نے پچھلے سال کراچی یونی ورسٹی سے ایم اے پاس کیا ہے [۵] برادرم ظفرالہدیٰ حضرت علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے صاحب زادے حامد نعمانی کے داماد ہیں۔ ان دنوں ڈھاکہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرار ہیں۔

مولانا عبدالرزاق کانپوری

(۱۴۳)

دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

مکرم السلام علیکم

"یاد ایام" کی اصل اور کاپیاں واپس مرسل ہیں۔ میں دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے مولانا شبلی کے حال میں غایت بے تکلفی سے بعض ایسے واقعات نقل کیے ہیں جو احباب کے لیے اور وہ بھی آغاز شباب کے لیے ہوتے ہیں۔ دورِ جوانی اقتدِ جنا کہ تووانی۔ مگر اب جب، وہ اواخر عمر میں ایک مقدس کام کے بانی ہوئے ان کا تذکرہ کرنا اور لکھنا بالکل نامناسب ہے گناہ کا ستر چاہیے نہ کہ تشہیر۔ اس لیے ازراہِ عنایت بلکہ اس دوستی کے واسطے سے جو آپ کو مولانا مرحوم سے تھی، یہ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات پر پردہ ڈالیے تاکہ ان کا نام نیک ضائع نہ ہو اور یوں بھی عیب و گناہ کا برملا اظہار اور فخر مسلمان کے لیے زیبا نہیں۔ آپ کا یہ فرمانا کہ "عطیہ بیگم صاحبہ کی علمی قدردانی نے مولانا کی فارسی شاعری میں نئی روح پھونک دی تھی" بالکل غلط واقعہ ہے۔ غزلوں کا آغاز ۱۹۰۵ء سے ہوا ہے اور خطوط و ملاقات کا سلسلہ ۱۹۰۸ء سے ہے والسلام

سلیمان
۸/۲/۴۳

حضرت سید صاحب نے مولانائے کان پوری کے انتقال پر معارف میں یہ تعزیتی مضمون تحریر فرمایا:

ماتم گسارِ برامکہ کا ماتم

مولوی عبدالرزاق صاحب، کان پوری نے جو البرامکہ کے مصنف کی حیثیت سے مشہور تھے، پچاسی برس کی عمر میں ۱۸ فروری ۱۹۴۸ء کو بہ مقام بھوپال اپنی نواسی کے گھر میں ۲ بجے رات کو یکایک انتقال کیا۔ وہ کچھ دنوں سے بیمار تھے۔ اُن کے داماد اُن کو

علاج کی خاطر دلی لے گئے تھے اور غرض یہ بھی تھی کہ اُن کے بعض پچھلے مسودات وہاں چھپ جائیں، کہ دلی میں ہنگامہ ہوا اور لوگوں میں بھگدڑ مچی۔ مولوی صاحب موصوف کو اُن کے عزیز ہوائی جہاز سے بھوپال لائے، جہاں ایک زمانے سے مختلف خدمتوں کے تعلق سے اُن کا قیام تھا۔

مرحوم سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ دارالعلوم ندوہ کے احاطہ کے اندر اس وقت ہوئی جب علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سبب سے ملک کے اکابر اور مشاہیر لکھنؤ آئے تھے۔ البرامکہ میں کم سنی میں پڑھ چکا تھا، مصنف سے واقف تھا، شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اس زمانے میں دارالعلوم میں قیام فرما تھے۔ مشتاقوں کا اُن کے پاس ہجوم تھا، انہی میں مولوی عبدالرزاق صاحب تھے۔ شاہ صاحب نے اُن کی طرف اشارہ کر کے مذاقاً فرمایا کہ یہ برامکہ صاحب ہیں، اس تعارف سے مجھے خوشی ہوئی۔

اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں جب حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ تعالےٰ حیدرآباد سے قطع تعلق کر کے دارالعلوم میں معتمد ہو کر آئے، تو مرحوم کی آمد و رفت بہ کثرت ہونے لگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرحوم نظام الملک سلجوقی لکھ رہے تھے اور اس سلسلے سے اپنے مسودات مولانا کو دکھانے لاتے تھے اور ان سے مشورے چاہتے تھے۔

مرحوم کی علمی استعداد اسی قدر تھی کہ وہ فارسی اچھی طرح جانتے تھے، اور عربی سے مانوس تھے، اور عبارت سے مطلب سمجھ لیتے تھے۔ البرامکہ لکھتے وقت اس سے بھی کم واقفیت تھی، اس زمانے میں ندوہ کا دفتر کانپور میں تھا اور اسی تعلق سے مولانا سید عبدالحی صاحب ناظم ندوۃ العلماء جو بہت اچھے ادیب تھے، کانپور میں رہتے تھے، اور منشی عبدالرزاق صاحب جیسا کہ وہ اس وقت کہلاتے تھے البرامکہ لکھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کو فطری مذاق بخشا تھا، اور حیاتِ سعدی والمامون وغیرہ سے اردو میں سوانح نگاری کی ایک طرح پڑ چکی تھی، مرحوم عربی تاریخی اور ادبی کتابوں کو لفظ لفظ دیکھتے تھے، اور جہاں برامکہ یا برمکی کا لفظ دیکھتے، نشان لگا دیتے تھے اور بعد کو اس کا مطلب سمجھ کر اس کو اردو میں لکھ دیتے، عربی اشعار کے سارے ترجمے جیسا کہ سنا مولانا سید عبدالحی صاحب کے کیے ہوئے ہیں اور پورا مسودہ حضرۃ الاستاذ کی نظر سے گزارا گیا تھا، اور شاید

اسی جذبے کے تحت مصنف نے بڑے ادب کے ساتھ مولانا کے نام اس کو منسوب کیا تھا، اور یہ شعر لکھا تھا،

مسندِ علم از وجودت منبعِ آداب باد
آستانت قبلۂ جانِ اولی الالباب باد

کانپور میں اس وقت جدید عربی مذاق کا مرکز منشی رحمت اللہ صاحب رعد مالک نامی پریس کانپور کا مطبع تھا، جہاں سے منشی صاحب پہلے ایک مصور رسالہ نکالتے تھے، اور پھر نامی جنتری نکالنے لگے تھے، منشی عبدالرزاق صاحب اُس وقت جیسا کہ یاد آتا ہے کان پور میونسپلٹی میں ملازم تھے، اور وہیں رحمت اللہ رعد اور مولوی عبدالزاق صاحب میں دوستانہ اتحاد پیدا ہوا، منشی رحمت اللہ رعد صاحب کو سرسید کی تعلیمی تحریک سے دلچسپی اور سرسید کے نورتن سے ادبی لگاؤ تھا، اس تعلق سے مولوی عبدالزاق بھی اسی مرکز سے وابستہ ہو گئے، اور تاریخ کی دلچسپی کے سبب سے خاص طور سے مولانا شبلی سے اُن کو زیادہ اُنس ہوا، مولانا نے "سلسلۂ فرماں روایانِ اسلام" کی بنیاد ڈالی تھی، اور المامون لکھ چکے تھے، اور الفاروق کا غلغلہ تھا، اس مناسبت سے مولوی عبدالرزاق صاحب کے ذہن میں "سلسلۂ وزراے اسلام" لکھنے کا خیال آیا اور سب سے پہلے ۱۸۹۶ء میں البرامکہ اور اس کے پندرہ برس بعد ۱۹۱۲ء میں نظام الملک سلجوقی لکھی اور ملک میں بہت مقبول ہوئی۔ البرامکہ خصوصیت سے زیاد مقبول ہوئی۔ اور بہت پڑھی گئی اور کئی دفعہ چھاپی گئی۔ اخیر اڈیشن ابھی چند سال ہوئے، مرحوم نے نظرِ ثانی کے بعد مع جدید اضافوں کے شائع کیا تھا۔ ان دو تصنیفات کے علاوہ انھوں نے مضامین بھی لکھے ہیں۔ مرزا فرصت شیرازی کی کتاب آثارِ عجم سے لے کر ایرانی یادگاروں پر کچھ ان کے مضامین معارف علی گڑھ میں نکلے تھے، زردشت، جاماسپ اور بزرجمہر وغیرہ کے حکایات اور امیروں کے پرانے افسانوں سے بھی اُن کو دلچسپی تھی۔

مرحوم کی پچاسی سال کی عمر کے لحاظ سے ۱۸۶۳ء میں پیدائش ہوئی ہوگی اور ان کے ہوش کا زمانہ سرسید اور اُن کے رفقا کی جدوجہد کا دور تھا۔ وہ علی گڑھ جا کر مولانا شبلی کے یہاں بھی مقیم ہوتے تھے، اور خود مولانا بھی ندوہ کے تعلق سے کان پور آتے جاتے تھے۔ اس لیے اس دور کے اکابر اور مشاہیرِ فن سے اُن کی شناسائی تھی۔ اسی تعلق سے میں

نے اُن سے خواہش کی تھی کہ اپنے زمانے کے دیکھے ہوئے بزرگوں اور ان کی محفلوں کے مشاہدات یک جا کر دیں، چناں چہ اس زمانے میں جب سر راس مسعود بھوپال میں وزیرِ تعلیم ہو کر آئے، انھوں نے اپنے مشاہدات کو قلم بند کیا، اور وہ سلسلہ کبھی مقامی پرچے میں چھپتا رہا۔ بعد کو اُن مطبوعہ اوراق کو میرے پاس بھیجا کہ میں انھیں مطبع معارف سے شائع کروں، مگر یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا، کاغذ کی نایابی سے وہ ہمارے ہاں نہ چھپ سکا اور مؤلف کو واپس کر دیا گیا۔ سنا ہے کہ وہ حیدر آباد دکن سے چھپ کر شائع ہوا۔

نظام الملک کی قدر دانی نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی نے پوری کی۔ ریاست آصفیہ کی طرف سے اُس کے بہت سے نسخے خریدے گئے اور شاید مصنف بھی انعام سے سرفراز ہوئے۔ اسی سلسلے میں حیدر آباد کے ارادے سے وہ بھوپال وارد ہوئے، اور سرکارِ عالیہ نواب سلطان جہان بیگم مرحومہ سے ملے، انھوں نے ازراہ قدردانی اپنی ریاست میں تحصیل داری کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء کا ہوگا۔ جب، کسی ضرورت سے میرا یہاں آنا ہوا تو سابق نواب ولی عہد بہادر کی ڈیوڑھی سے اُن کو وابستہ پایا، اور ان کی فرمایش سے وہ اس زمانے میں اُن کے والد نواب احمد علی خاں کی سوانح عمری اور افغانانِ جلال آباد (ضلع مظفر نگر) کی تاریخ قلم بند کر رہے تھے۔ میں نے مبارکباد دی، کہ کیا عجب آپ بھی کسی زمانے میں یہاں کے نظام الملک بن جائیں۔ مگر ولی عہد بہادر نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ اور سرکار عالیہ نے اُن کو تاریخ اسلام لکھنے پر مقرر فرمایا۔ یہ اس کو ایک مدت تک انجام دیتے رہے، مگر پھر بساط ایسی اُلٹی کہ گوشہ نشین سے ہو گئے۔ اس کے بعد سر راس مسعود نے اپنی وزارتِ تعلیم کے عہد میں جب تالیف و ترجمہ کا ایک سرکاری ادارہ قائم کیا تو مرحوم اُس کے اسٹاف میں داخل ہوئے اور تاریخ بھوپال وغیرہ کی طرح ڈالی۔ مگر سر راس مسعود کا زمانہ جلد ختم ہو گیا اور ۱۹۳۷ء میں انتقال کر گئے، تو یہ ادارہ بھی خوابِ پریشان ہو کر رہ گیا۔

وہ اِدھر ضعفِ عمر کے سبب سے کمزور بھی ہو گئے تھے، تاہم کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ اخیر تصنیفات تاریخ اسلام وغیرہ کے مسودات ان کے وارثوں کے پاس ہیں

اور عجیب نہیں کہ وہ اُن کو شائع کریں۔

مرحوم چوں کہ یوپی سے بھوپال آ گئے تھے، اور وہاں کے علمی و ادبی حلقوں سے الگ ہو گئے تھے، اس لیے لوگ انھیں اُن کی زندگی ہی میں بھول چکے تھے اور انھیں خود بھی یہ خیال تھا کہ لوگ انھیں مردہ سمجھ چکے ہوں گے۔ اس لیے مجھ سے دو دفعہ غالباً یہ خواہش کی کہ میں اُن کی زندگی کی خوش خبری لوگوں کو پہنچا دوں، چناں چہ معارف کے شذرات میں اُن کی یہ تحریریں ہوں گی۔

مولانا شبلی مرحوم کے دوسرے دوستوں کے ساتھ میں جو ادب ملحوظ رکھتا تھا، وہی اُن کے ساتھ رکھتا تھا اور وہ بھی مجھے اپنے عزیزوں میں شمار کرتے تھے۔ آج اس مساوات کے زمانے میں ہمارے نوجوان خوردی و بزرگی کے ان آداب کو شاید نہ سمجھ سکیں۔

۱۸ر فروری ۱۹۳۹ء کی دوپہر کو دفتر دارالقضا میں ٹیلیفون سے مجھے کسی نے مطلع کیا کہ رات مولوی عبدالرزاق صاحب نے انتقال کیا، ۳ بجے نماز جنازہ ہوگی، اور رامن شاہ کے تکیے میں مدفون ہوں گے۔ لیکن افسوس کہ جب قبرستان میں پہنچا تو ان کے احباب اور اعزہ اُن کو دفن کر کے واپس جا چکے تھے، اور اس وقت ان کی قبر کو مزدور پتھر سے گھیر رہے تھے۔ دعائے مغفرت پڑھی اور اُن کے عزیز کے گھر جا کر جہاں انھوں نے وفات پائی تھی فرض تعزیت ادا کیا۔

مرحوم بلند بالا، خوش خلق اور متواضع تھے۔ ہر حال میں وہ اپنے علمی کاموں میں منہمک رہتے تھے۔ اب زمانے کے حالات میں جو انقلاب ہو رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ایسے شائقین و خدمت گزارانِ علم و ادب کی توقع بہت کم کی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(یادِ رفتگاں)

مولانا سعید اشرف ندوی

مکتوب الیہ: مولانا سعید اشرف ندوی، کچھوچھہ (ضلع فیض آباد) کے پیرزادے اور ندوہ کے فارغ التحصیل ہیں، عربی اور ترکی میں ممارست رکھتے ہیں، وارستہ مزاج اور آزاد طبیعت ہیں۔ مختلف اداروں سے وابستہ رہے، چھوٹی موٹی کئی کتابوں کے مؤلف ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی سے تلمذ کا تعلق رکھتے ہیں۔ کراچی میں قیام ہے۔ (ایوب قادری)

(۱۴۴)

برادرِ مکرم!

اسعدکم اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کی دونوں کتابیں جو آپ نے اپنی مہربانی سے مجھے دی تھیں[1] پڑھیں آپ کے اس قلمی جہاد سے دل بہت خوش ہوا۔ آپ لوگوں کی ان مساعی کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ندوہ ناکام رہا۔ زمانہ کی ضرورت جس امر کا تقاضا کر رہی ہے اور جس قسم کی خدمت کی طالب ہے، بحمد اللہ کہ آپ حضرات اس کے انجام دینے کے اہل ہیں۔

اس سلسلے میں مجھے صرف دو باتیں کہنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن پاک کے ترجمہ میں بے احتیاطی کو کام میں نہ لایا جائے، یہ تحریف ہے اور جس کی سزا کا حال معلوم ہے۔ ترجمہ بالکل لفظی کرنا چاہیے۔ پھر آپ اس کی تشریح اپنے ضروری مطلب کے مطابق کر سکتے ہیں۔ یہ کسی طرح درست نہیں کہ ترجمہ میں الفاظ کی رعایت کے بغیر اپنے مطلوب کے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ شدید تحریف ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ پھر کسی دوسری ضرورت کے وقت آپ کو اس آیت کا دوسرا ترجمہ دوسرے ڈھنگ (سے) کرنا پڑے گا۔ اس وقت آپ پر ثابت ہو جائے گا کہ ہم نے اتباع نبوی کا کیا نادانستہ ارتکاب کیا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ جمہورِ اسلام جس مسئلہ اعتقادی و عملی پر متفق ہیں اس کو چھوڑ کر

---

[1] مولوی سعید اشرف صاحب کی مؤلفہ دو کتابیں (۱) مبادی حکومتِ اسلامیہ (مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ ۱۹۴۱ء) اور (۲) نوجوانانِ اسلام کی پہلی انجمن (مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ ۱۹۴۲ء)

تحقیق کی نئی راہ اختیار نہ کی جائے۔ یہ طریق تواتر اور توارث کی بیخ کنی کے مترادف ہے۔ اس گناہ کا مرتکب کبھی میں خود ہو چکا ہوں اور اس کی اعتقادی و عملی سزا بھگت چکا ہوں، اس لیے دل سے چاہتا ہوں کہ اب میرے عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی اس راہ سے نہ نکلے تاکہ وہ اس سزا سے محفوظ رہے جو ان سے پہلوں کو مل چکی۔

اسی طرح ایک اور مسئلہ بھی اس سلسلے میں اظہار کے قابل ہے۔ زمانے کی زبان و بیان و اصلاح کے طور طریق ہر عہد میں یقیناً بدلتے رہتے ہیں۔ اور یہ بالکل واقعہ ہے کہ ہر زمانے کے زندہ اصطلاحات اور طرزِ بیان میں وہ قوت ہوتی ہے کہ دلائل کے بغیر وہ دلوں میں یقین کی راہ پیدا کر دیتے ہیں۔ تاہم ان کے استعمال میں احتیاط درکار ہے، کیوں کہ بسا اوقات طرزِ بیان کا اختلاف حقائق کے تغیر کا سبب ہو جاتا ہے، مولانا ابوالکلام کا ایک فقرہ اس بات میں بہت خوب ہے۔ انھوں نے ایک دفعہ کہا کہ "کبھی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور سید احمد خاں دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں مگر ایک سے ایمان پرورش پاتا ہے اور دوسرے سے کفر۔" اس زمانے کے اکثر لکھنے والے اس نکتے سے تغافل برت رہے ہیں اور اس لیے خوف لگا رہتا ہے کہ ان سے ایمان کی بجائے کفر کو نشوونما کا موقع نہ ملے اگر آپ نے ان نکتوں کی طرف توجہ فرمائی تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے قلمی مساعی میں برکت دے گا اور مسلمانوں کو ان پر نفع بخشے گا۔

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پندِ پیرِ دانا را

والسلام
سید سلیمان
یکم ذی قعدہ ۱۳۶۳ھ[1]

---

[1] مطابق ۱۸؍اکتوبر ۱۹۴۴ء

ڈاکٹر غلام محمد صاحب

حضرت سید صاحب کے مکتوب الیہ کے نام ایک سو ایک مکاتیب ہیں سے چند، بہ طور نمونہ از خروارے پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱۴۵)

اعظم گڑھ

اخی فی اللہ تعالیٰ رزقکم اللہ رزقاً حسناً فی الدنیا والآخرہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فقیر بحمداللہ برکت دعائے بزرگاں علالت کے اس حملہ سے بہ سلامت نکلا، اب ضعف کے آثار ہیں، اب راتوں کی نیند کچھ کچھ آرہی ہے، اب لیٹتا ہوں اور سوتا ہوں، مولانا محمود الغنی صاحب[1] اور دوسرے بزرگوں اور عزیزوں کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔ اب آپ مطمئن رہیں، انشاءاللہ مولیٰ کا کرم ہوگا۔ والسلام

بیچمدان سید سلیمان
۲ر شوال ۶۴ھ[1]

(۱۴۶)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک نہایت قابل اعتراض مضمون پر تنقید کے لیے مولانا محمود الغنی صاحب نے سید صاحب سے فرمایش کی تھی۔ ۲۲ر شوال ۱۳۶۴ھ[2] کے خط کے جواب میں۔

---

[1] حیدرآباد میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ مجاز تھے مکتوب الیہ نے حضرت سید صاحب کی صحت کے لیے مولانا سے دعا کروائی تھی مشہور محدث مولانا احمد علی سہارن پوری کے پوتے تھے ۱۹۵۶ء میں انتقال ہوا

[1] مطابق ۱۰ر ستمبر ۱۹۴۵ء [2] مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۵ء

اعظم گڑھ

اخی فی اللہ تعالیٰ دام توفیقکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

حضرت مولانا ممدوح سے میرا سلام کہہ دیجیے اور عرض کر دیجیے کہ اِس وقت میں اِس قدر ضعیف ہوں کہ کوئی دماغی کام مدت تک نہیں کر سکتا۔

مولوی مودودی صاحب کا جواب مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری ایڈیٹر "اہل حدیث" دے رہے ہیں[1]، میں رسالہ خطبۂ راندیر بھیجتا ہوں، مولانا کی خدمت میں پیش کردیں اور اپنے عفو وعافیت کے لیے اُن سے دُعا کا طالب ہوں۔

ہیچمدان سلیمان

(۱۴۷)

مکتوب الیہ کے اپنی تالیف "قائدِ ملت" حضرت سید صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی، سید صاحب کا مکتوب اس کے جواب میں ہے۔

اعظم گڑھ

برادرِ عزیز القدر ارشدکم اللہ تعالیٰ، السّلام علیکم

اٹھارہ روز کے لیے وطن گیا ہوا تھا، واپسی پر کتاب ملی، جابجا سے پڑھی۔ آپ نے جس جذبہ سے کتاب لکھی ہے، صحیح ہے[2]۔ معارف میں ریویو ہوگا۔

---

[1] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا حدیث، راویانِ حدیث کے اور دیگر کئی مسائل کے بارے میں اس گمراہ کن مضمون کا نہایت مدلل جواب مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری نے لکھا تھا اور اہل حدیث امرتسر میں ۱۴؍ ستمبر سے لے کر ۳۰؍ نومبر ۱۹۴۵ء تک گیارہ قسطوں میں چھپا تھا۔ بعدہ فروری ۱۹۴۶ء میں "خطاب بہ مودودی" کے عنوان سے رسالے کی شکل میں چھاپ دیا گیا۔ میرے پیش نظر بعد کا عکسی ایڈیشن ہے

[2] وہ جذبہ تھا کہ لوگوں نے بہادر یار جنگ مرحوم کو محض ایک قومی لیڈر سمجھا حالاں کہ وہ ایک سچے اور پکے مسلمان اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار اُمتی تھے، ان کی خاموش تبلیغی مساعی جس کی وجہ سے (۲۰) ہزار ہندو مسلمان ہوگئے۔ اُن کی راتوں کی گریہ و زاری، اور اُمتِ محمدیہ سے سچی محبت اور اُس کی بے لوث خدمت گزاری، وہ اوصاف تھے جو عوام کی نگاہ سے مخفی تھے میرا مدعا یہی رہا کہ اُن کی ظاہرہ فتح مندیوں کے پیچھے جو باطنی موثرات کارفرما تھے۔ اُن کو اُجاگر کردوں، بحمداللہ کہ حضرت والا نے اِس جذبہ کی توثیق فرمادی! (غلام محمد)

قلم میں احتیاط معلوم ہوتی ہے، غلو اور عدم اعتدال سے بات غلط بھی ہو جاتی ہے اور تاثیر سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔

دعا ہے کہ آپ کو مزید توفیقاتِ خیر حاصل ہوں۔ والسلام

سید سلیمان ۲۷/ ربیع ۱۳۶۵ھ[1]

عزیزی وحبیبی رزقکم اللہ تعالیٰ عرفاناً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اللہ تعالیٰ آپ کے انتشار کو جمعیت سے بدل دیں۔

خط لکھنے کے لیے مطلب کی ضرورت نہیں، ایک شعر سنیے ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم کو مطلب ہے تمہارے نام سے[2]

الحمد للہ مع الخیر ہوں، تین ہفتوں کے لیے لکھنؤ اور اعظم گڑھ گیا ہوا تھا، اب آیا ہوں، تھانہ بھون بھی گیا تھا، حضرت والاؒ کی مرقدِ پُر انوار پر بھی حاضر ہوا۔ والسلام

ہیچمدان سید سلیمان
۲۶/ ذیقعدہ ۱۳۶۵ھ[3]

۳۸

بھوپال

عزیزی وحبیبی بارک اللہ فیکما وجمع بینکما بالخیر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ دہلی اور سہارن پور کے سفر سے کل واپس آیا، صوبہ بہار

---

[1] ۲۷/ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ مطابق یکم مارچ ۱۹۴۶ء،

[2] غالب کے شعر میں تھوڑا سا تصرف ازراہِ تواضع کیا گیا ہے ورنہ مصرعۂ ثانی یوں ہے:

؏ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(غلام محمد)

[3] مطابق ۲۲/ اکتوبر ۱۹۴۶ء

کے مسلمانوں پر جو اُفتاد پڑی[۱] اُس کا حال آپ کو اخبارات سے معلوم ہوا ہوگا، میرا گاؤں بحمد اللہ محفوظ ہے، مگر ۲۰ گاؤں کے مسلمان پناہ گزیں وہاں جمع ہیں، بھوکے اور ننگے ہیں،[۲] اللہ تعالےٰ رحم فرمائے!

اہلیہ اور بچے سہارن پور سے کل ہی ساتھ آئے!

آپ کے لیے دلی دُعا ہے، خصوصاً اس حالت میں جب کہ آپ ایک نئی زندگی شروع کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ مبارک فرمائیں اور امن و سکون و مودت و سکینت عطا کریں۔ اس زندگی کی خوشی صرف تحمل و برداشت کی راہ سے طے ہوتی ہے، میں بس اس تقریب میں شریک نہ ہو سکا مگر نیک دعاؤں کے لیے قریب و بعد یکساں ہیں[۳]

والسلام

سید سلیمان، ۲۹ ذی حجہ سنہ ۱۳۶۵ھ[۴]

۱۴۹

بھوپال

۲۱ فروری سنہ ۱۹۴۸ء

محبی و مخلصی رفع اللہ درجاتکم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ

۱۔ الحمد للہ بہ عافیت ہوں،

۲۔ ہاں بھائی، حیدر آباد نہ آسکا، بات یہ ہے کہ حیدر آباد "مرکزِ آمال" ہے اُس کے ہر وارد پر "طمع" کا گمان ہوتا ہے اس لیے کسی بہانے کے بغیر جاتے پر دل کو آمادگی نہیں پھر آج کل سفر کی جو صورت سفر ہے وہ بھی مانع ہے اور یہاں کا تعلق بھی۔ یہاں کی رخصت وغیرہ کے قواعد کے سبب مانع بنا۔ جی چاہتا ہے کہ جو رخصت بچائی جاسکے اُس کو سفر حج کے لیے جمع کیا جائے۔

میں کہاں سے بزرگ آیا، یہ حسنِ لیلیٰ نہیں چشمِ مجنوں کا کرشمہ ہے،

۳۔ آپ دونوں کے لیے دِل سے دُعا کرتا ہوں،

والسلام

بہمدان سید سلیمان

---

[۱] صوبہ بہار کا پہلا دردناک ہندو مسلم فساد جس میں مسلمان بُری طرح تباہ ہوئے! (غلام محمد)

[۲] الحمد للہ کہ اُس وقت کے حیدر آباد نے اِن مظلوموں کے ساتھ دردمندی کا پورا پورا لفظی نہیں بلکہ عملی ثبوت دیا تھا۔ (غلام محمد)

[۳] مکتوب الیہ نے اپنی شادی میں شرکت کے لیے درخواست کی تھی۔

[۴] مطابق ۲۴ نومبر ۱۹۴۶ء

⑮⓪

بھوپال

۴ ر شعبان ۱۳۶۷ھ[1]

عزیزی وحبیبی زادکم اللہ تعالیٰ غیرۃ فی الایمان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ جس کو گستاخی سمجھے وہ میرے خیال میں سیاسی بحران ہے، جس ماحول میں آپ، ہیں اس میں اس قسم کے بحرانی جذبات وخیالات کا پیدا ہونا عین مقتضائے طبع ہے، اس لیے آپ کے وساوس کا خیال مجھے ذرا بھی نہیں ہوا، سمجھتا ہوں کہ آپ کی طبیعت زود اثر ہے کبھی سیاسیات کا جوش طبیعت پر غالب آجاتا ہے، موجودہ سیاسیات کا اثر نازک طبائع پر ایسا ہی پڑتا ہے، ان تمام ذہنی شورشوں کا علاج یہ ہے کہ پیش آمدہ امور غیر اختیاری ہیں، پھر ہماری فکر اور غم کا حاصل ؟ — جس امت کی تاریخ میں وفات رسولؐ شہادتِ فاروقؓ وعثمانؓ جنگِ جمل، جنگ صفین، فتنۂ حجاج، فتنۂ یزید اور شہادتِ حسینؓ جیسے واقعات پیدا ہوئے ہوں اس کے ہاتھ سے موجودہ سیاسیات کا ہیجان صبر کا دامن کیوں چھڑا دے اور اللہ تعالیٰ کے حاکم وحکیم بہ یک وقت ہونے کے اعتقاد سے کیوں تغافل ہو؟

اس تفصیل کا منشا یہ ہے کہ ہنگامی جوش وخروش یا سردی و مایوسی سے مومن نہ گرم ہو اور نہ نرم ہو، اپنے کام میں یکساں لگا رہے۔

خطرات کے علاج دو ۲ ہیں، اللہ تعالیٰ کے حکیم اور حاکم ہونے کا استحضار اور دوسرے ہنگامی اور دوامی امور میں فرق کا احساس،

میں بمبئی اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے جلسے میں گیا تھا، اتفاق سے انھیں دنوں جمیعۃ العلماء کا جلسہ بھی تھا اور مولانا مناظر صاحب وغیرہ سے ملاقات ہوئی تھی، میں نے ان کی رفاقت میں کچھ کام بھی کیا،

آپ کے لیے دل سے دعا ہے، والسلام

فقیر ہیمدان سلیمان

---

[1] مطابق ۱۲ ر جون ۱۹۴۸ء

(151)

بھوپال

محبی و عزیزی رفعکم اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، الحمد للہ خیریت ہے،

آپ جس مقام پر ہیں وہ اُس مقام سے جہاں عام مُسلمان آباد ہیں سراسر مختلف ہے۔

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی　　طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را

میں نے سیاسیات کے خارزار سے مدت ہوئی کہ اپنا دامن چھڑا لیا، اب جو کچھ ہے وہ مسلمانوں کی دینی و علمی و تعلیمی خدمات کی بجا آوری کا شوق ہے، ان کے علاوہ دیگر امور سے قطعاً عزلت نشین اور مسلمانوں کی صلاح و فلاح کی دُعا دل سے کرتا ہوں، اس سے زیادہ کیا لکھوں، جذبات کے جوش میں بہنے سے کام نہ چلے گا۔

میں ان تمام نزاعات[1] سے عملاً کنارہ کش ہوں اور دل میں مسلمانوں کی خیر و فلاح کے خیال کے سوا کچھ اور نہیں رکھتا اور اسی کا داعی ہوں اور اپنے اختیار کی حد تک اسی کا ساعی، مجھے سیاسیات کا رہبر نہ سمجھیے اور حضرت رحمۃ اللہ تعالےٰ کے مسلک کو اُس مضمون سے سمجھیے جو مولوی عبدالباری صاحب (ندوی) کا معارف میں شائع ہوا ہے

خدا کرے کہ آپ دین کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر موجودہ شورشوں کی طرف اتنی نہ کریں جو اُدھر سے تغافل ہو جائے۔ دین ثابت و قائم چیز ہے اور سیاست متبدل و متغیر۔

ہنگامی چیزوں کو اہمیت نہ دیں اور امور دوامی میں مصروف رہیں آپ کے لیے صدقِ دل سے دُعا کرتا ہوں،

والسلام

ہیچمدان سلیمان

---

[1] مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات کی طرف اشارہ ہے (غلام محمد)

(۱۵۲)

بھوپال، یکم ذی حجہ ۱۳۶۷ھ
۴؍ اکتوبر ۱۹۴۸ء

عزیز مکرم حیاکم اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کا کارڈ عین حالتِ انتظار میں ملا جس سے آپ کی خیریت معلوم ہوئی، اس وقت آپ میرے پچھلے خطوں کو آپ کے پاس ہوں تو دوبارہ پڑھیں، مکی زندگی سے پہلے مدنی زندگی بمشکل کامیاب ہو سکتی ہے اور پچھلے فرسودہ نظام زندگی کی بنیاد پر تجدید کی دیواریں کھڑی نہیں ہو سکتی ہیں۔

خود مسلمان بننا، دوسرے مسلمانوں کو مسلمان بننے کی دعوت دینا وقت کی اہم پکار ہے، اور اس فرض کو نفرت کے بجائے محبت کے جذبہ سے انجام دینا سب سے اہم ہے، جس کے سامنے آپ دعوت پیش کرتے ہیں اُس پر شفقت اور اُس سے محبت دعوت کا محرک ہو تب ہی وہ کامیاب ہو سکتی ہے، جیسا کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ہے، اور قرآن کریم میں بھی اُس کی شہادت ہے لَا تَحْزَنْ اور لَا يَحْزُنْكَ قولهم اور وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ اور عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ وغیرہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ منشائے دعوت شفقت بر کفار تھی کہ داعی اور مدعو نہ ملیں گے اور ایک کو دوسرے سے دل لگاؤ پیدا نہ ہوگا تو ایک دل سے دوسرے دل کی طرف تاثیر منتقل نہیں ہو سکتی۔

الحمد للہ اچھا ہوں، والسلام   سید سلیمان

(۱۵۳)

بھوپال
۱۸؍ ربیع الاول ۱۳۶۸ھ[1]

محب عزیز حسن اللہ تعالیٰ اخلاقکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ـــ الحمد للہ خیریت ہے،

(۱) حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا اس باب میں ایک قول ہے اس کو نقل ہے

---

[1] مطابق ۱۸؍ جنوری ۱۹۴۹ء

کرتا ہوں۔

"حسد کی ایک تو کیفیت نفسانیہ ہے جس میں انسان معذور ہے، ایک اُس کے مقتضیٰ پر عمل ہے اس میں انسان مازور (گنہگار) ہے، اور ایک مخالفت ہے اُس مقتضیٰ کی، اس میں انسان ماجور ہے ــ یعنی حسد کے غلبہ سے کسی کی مذمت کا تقاضا ہو تو اُس کی مدح کرو، اُس سے اعراض کو دل چاہے تو اُس سے ملو، اُس کی تعظیم کرو، ابتداءً سلام کرو"

غرض نفس کیفیت حسد پر مواخذہ نہیں، اُس کے مقتضیٰ پر عمل کرنے پر مواخذہ ہے حدیث میں ہے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو[1] حسد سے غیبت، عداوت، کذب گوئی، افترا پردازی، بہت سی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ آپ یہ تصور کیا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہیں، اگر مجھے کم اُسے زیادہ ملا تو اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی،

(۲) اس کا علاج اپنی برائیوں پر نظر ہے،

(۳) اس میں کوئی حرج نہیں البتہ انہماک نہ چاہیے،

مکان میں صفائی کے لیے جب جھاڑو دی جاتی ہے تو ہر قسم کا گرد و غبار اور میل کچیل سامنے آتا ہے، اس سے مایوس نہ ہوں،

(۴) بارک اللہ تعالےٰ ، والسلام

سید سلیمان

(۱۵۴)

مکتوب الیہ نے خدمت میں حاضری کے لیے اجازت چاہی تھی۔

بھوپال

۲۱ ؍ فروری ۱۹۴۹ء

عزیز محترم ادام اللہ توفیقکم ! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

چند روز کی دیر بوجہ مشاغل ہوئی، معاف کیجیے۔

---

[1] عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب (غلام محمد)

آپ بہ شوق آسکتے ہیں، مگر جلد آئیں، ایک ہفتہ عشرہ کی نیت کریں، آپ کی اہلیہ عزیزہ کے لیے دل تو یہی چاہتا ہے کہ اجازت دے دوں مگر اس وقت حالات اس کے سازگار نہیں اس لیے وہ ابھی قصد نہ کریں۔ آنے کی تاریخ لکھ دیں۔ والسلام

سید سلیمان

(۱۵۵)

بھوپال

حبیبی الاعز اصلح اللہ احوالکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

کل کا خط بھی آج ہی ساتھ پہنچا۔ آپ کے بخیریت پہنچنے کا انتظار تھا، الحمدللہ خیریت معلوم ہوئی، نسخے پہنچے، یہاں عطاروں سے دریافت کروں گا مگر پہلے یہ تو معلوم ہو کہ مرض کیا ہے؟ اور ان نسخوں میں کیا کیا رعایتیں ہیں؟

الحمدللہ اچھا ہوں۔ زکام ختم ہو چکا، صرف گلے کی کھانسی قدرے ہے، حرارت نہیں ہے، بھوک لگتی ہے، جوشاندہ بعد تیزاب بھی استعمال میں ہے۔

جو کچھ ہوا اور ہوتا ہے وہ سب حق تعالے کا فیض ہے، بندہ مامور ہے، یہ اقتضائے محبت ہے، وہ محبت جس کی تعلیل کی شکایت آپ کو پیدا ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی اہلیہ کو فلاح دارین بخشیں،

والدۂ سلمان دعائے خیر کہتی ہیں، والسلام

فقیر ہیچمدان سید سلیمان[لہ]

(۱۵۶)

بھوپال

۲۰ر مارچ ۱۹۴۹ء

مخلصی وعزیزی وحبیبی رفع اللہ احوالکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ــــ الحمدللہ خیریت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حسنِ خاتمہ نصیب فرمائے،

حکیم صاحب کا والا نامہ ابھی نہیں آیا ہے، آجائے گا اب انہیں زحمت

[لہ] حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کا یہ خط ۱۲ر اور ۲۵ مارچ ۱۹۴۶ء کے درمیانی وقفے میں روانہ کیا گیا تھا

نہ دیں۔

اگر اُن کا والا نامہ آیا تو مناسب جواب عرض کیا جائے گا۔

بزرگوں کا حسن ظن اس بے استحقاق کے ساتھ میرے لیے نعمت بھی ہے اور ابتلا بھی، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔

عزیزہ موصوفہ کے لیے دُعائے خیر ہے، والدۂ سلمان کی طرف سے بھی دعا و سلام۔

فقیر ہیچمدان سلیمان

۱۵۶

بھوپال

صدیق صمیم زادکم اللہ تعالیٰ حبًا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمدللہ تعالیٰ خیریت ہے۔

قبور و مزاراتِ صالحین سے اِستفادۂ فیض گو ممنوع نہیں لیکن ماثور و مسنون بھی نہیں، تاہم یہ استفادہ و استفاضہ بھی مفید و مستفید کی مناسبت پر موقوف ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بحمداللہ تعالیٰ آپ سنت سے اب قریب ہو گئے ہیں، یہ خوشی کا مقام ہے نہ کہ رنج کا۔

تعبیر سنت کی موافقت کی طرف ترغیب و بشارت ہے، یہ اصلاح کی تمثیل ہے، دعا تو بے شبہ ہے مگر لگی ہوئی روزی سے اعراض کے خیال سے ڈر لگتا ہے، اللہ تعالیٰ وہی کریں جس میں آپ کے لیے خیر ہو۔

مباحات میں غلو سے بھی فیوض کم ہو جاتے ہیں!

ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی چاہیے۔

بندہ ہیچمدان سلیمان[1]

۱۵۷

بھوپال

۱۰ راپریل ۱۹۵۰ء

عزیزی و حبیبی دام توفیقکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

---

[1] مکتوب الیہ کے ۲۲ راپریل ۱۹۴۹ء کے عریضے کے جواب حضرت نے یہ مکتوب تحریر فرمایا

کارڈ مورخہ ۲۱ ر مارچ ۵۰ء ملا، آپ کے ذوق و شوق کے شعر پڑھ کر دل متاثر ہوا میں چند روز سے بخار میں مبتلا تھا، اب اچھا ہوں، والدہ سلمان کو بھی بخار آ گیا تھا کل سے اچھی ہیں۔ ابھی تک تعلیمات نے پوری رخصت اور چارج لینے کی کارروائی نہیں کی، اس لیے وطن کی طرف جانے کا موقع نہیں ملتا، اب تو آپ لوگوں سے ملنا بغیر فنائے کامل ممکن ہی نہیں اسی کی کوشش کر رہا ہوں، شمونہ سلمہا[ع] کی خیریت ملی، دعا ہے کہ عامر میاں[ع] کو بھی جلد صحت نصیب ہو۔

اپنی اہلیہ سلمہا و رفقہا کو سلام کہہ دیجیے،

والسلام
سید سلیمان

(۱۵۸)

۲۴ ر جون ۱۹۵۰ء کے خط کے جواب میں حضرت سید صاحب نے یہ مکتوب تحریر فرمایا۔

کراچی

عزیزی و حبیبی رزقکم اللہ تعالیٰ علماً و عرفاناً! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یہ شبہ بالکل صحیح ہے، اسی لیے یہ انوار و تجلیات جن کو عام طور پر انوار و تجلیات کا نام دیا جاتا ہے وہ نفسانی افکار ہیں اور اُن کی مثال ایسی ہے جیسے اِس عملِ نفسیاتی کے ذریعے بعض علمائے نفسیات بیماری کا ازالہ اور صحت کا حصول کرتے ہیں اور اسی نفسیاتی اصول سے صوفیہ امراضِ باطنی کا علاج کرتے ہیں اور حق تعالیٰ سے رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ اب جس طرح پہلے یہ طے کیا جا چکا ہے کہ صحت اچھی چیز ہے اور بیماری بری چیز ہے اور بیماری کو دور اور صحت کا حصول اس تدبیرِ نفسیاتی سے کیا جاتا ہے اور اس میں کامیابی ہوتی ہے اسی طرح مشاہدہ و استحضارِ ربانی کی کیفیت جس کے حصول کا مطلوب ہونا الگ دلیل سے ثابت ہے اُس کے حصول کے لیے یہ نفسیاتی طریق کار اختیار کیا جاتا ہے اور اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ اس طریق میں عموماً جو مشاہدات ہوتے ہیں وہ ذہنی ہی افکار ہوتے ہیں جیسا کہ امام نقشبند (خواجہ بہاؤالدین نقشبند قدس سرہٗ) کا یہ فقرہ

[ع] حضرت سید صاحب مرحوم کی نواسی اور نواسہ ابو عاصم صاحب (ایڈوکیٹ) کے بچے۔
عامر میاں کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔

اس پر دلالت کرتا ہے آنچہ دیدہ شود و دانستہ شود ہمہ غیر خدا است۔

بحمد اللہ کہ یہ حقیقت آپ پر ظاہر ہو گئی، غرض اصلاً یہ مشاہدات و تصورات مطلوب نہیں یہ تو بطور تدبیر ہیں اصل ان کے نتائج ہیں یعنی صحت! والسلام

ہیچمدان سلیمان

(159)

۲؍ستمبر ۱۹۵۰ء کے خط کے جواب میں سید صاحب کا مکتوب گرامی

محبی و مخلصی زادکم اللہ تعالیٰ درجۃً! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مسابقت الی الخیر جس میں غیر کی تحقیر اور اپنی بزرگی کا خیال نہ ہو بہتر ہے، وسابقوا الی مغفرۃ اور وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون،

لیکن بجائے اہل اللہ کی نظر اور شیخ کی نظر میں مقام کے حصول کے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں قبول کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے کہ یہ بھی غیر اللہ ہیں، والسلام

سید سلیمان

(160)

۲۴؍اگست ۱۹۵۳ء کے عریضہ حیدر آباد دکن کے جواب میں مکتوب الیہ کے نام حضرت سید صاحب کا آخری مکتوب۔ مکتوب الیہ اس زمانے میں حیدر آباد (دکن) گئے ہوئے تھے۔

کراچی

محب باختصاص زادکم اللہ تعالیٰ معرفۃً! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے جانے کے بعد میں باقاعدہ بیمار ہو گیا اور ڈاکٹروں کا تختۂ مشق بنا۔ سات روز کے بعد بخار اترا مگر ضعف اتنا ہو گیا کہ بخار اترے ایک مہینا ہو گیا مگر ابھی تک پوری قوت عود نہیں کی۔ مگر بحمد اللہ ترقی ہو رہی ہے۔

آپ کے ساتھ معاملہ حاضر و غائب میں یکساں ہے۔ آپ کے خانگی تفکرات کے باعث ایسا محسوس ہوتا ہو گا کہ توجہ ملتفت نہیں،

میاں تقی آپ کی جانشینی کر رہے ہیں۔ اکثر شام کو آتے ہیں۔

قربانی میں عید فی حصہ پڑا تھا۔ تقی نے سب ادا کر دیے۔ والسلام

الفقیر الی اللہ سید سلیمان

مولانا محمد علی حیدرآبادی

(١٦١)

اخی فی اللہ تعالیٰ ادام توفیقکم:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ کہ اب اچھا ہوں گو بغایت ضعف ہے۔ اسی لیے جیسے بسط کو جی چاہتا ہے اُس بسط سے لکھ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے حسنِ ظن کو میرے لیے اور آپ کے لیے موجبِ خیر و برکت بنائے۔

(۱) بے شک یہ بڑی نعمت ہے[1]۔ اللہ تعالےٰ مجھے آپ کے حسنِ ظن کا اہل بنائیں۔

بیعت کی حقیقت ایک معاہدہ ہے درمیان مفید اور مستفید کے، مفید وعدہ کرتا ہے کہ وہ شفقت اور تعلیم میں حتی الامکان کمی نہ کرے گا اور مستفید اس کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ اطاعت میں حتی الوسع کمی نہ کرے گا۔

بیعت اس راہ کی ضروری چیز نہیں۔

بیعت کے بعد اطاعت فی معروف کی قید ہے یعنی غیر احکام شریعت میں اطاعت ضروری نہیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لیتے وقت فی معروف کی قید لگا دی ہے۔

انشاء اللہ تعالیٰ راہ سلوک میں کوئی ایسی بات درمیان میں نہ آئے گی جو محض احتراماً یا تقلیداً ماننی ضروری ہو۔ بلکہ براہِ نسی جو نص کی دلالت اولا اشارہ سے خالی ہو آپ نہ مانیں، مگر نص

مکتوب الیہ: مولانا محمد علی مرحوم حیدرآبادی، جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) میں حدیث و فقہ کے استاد تھے۔ مرحوم کے نام حضرت اسید صاحب کے سترہ مکتوب یادگار ہیں۔ یہ مکاتیب ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے ماہنامہ بینات، کراچی کے ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ تا ربیع الاول ۱۳۸۴ھ کے چار شماروں میں چھپوا دیے تھے۔ ع مولانا محمد علی کے نام خطوط میں آیاتِ قرآنی بیشتر غلط نقل ہوئی تھیں، انہیں درست کر دیا گیا ہے اور سورتوں اور آیات کے نمبروں کی تخریج کر دی گئی ہے

[1] یعنی اللہ تعالیٰ کا دینِ حق کی راہ کا سمجھا دینا، بے شک ایک بڑی نعمت ہے۔

کے اقسام پر تسلیم و رضا اور عمل بالانشراح ضروری ہے۔

آپ نے اپنی جو حالت لکھی ہے وہ بہت اچھی ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید ترقی عنایت فرمائیں۔

اصل شئے اللہ تعالیٰ کا قلبی تعلق اور اس کے احکام کی اطاعت ہے، باقی سب فروع ہیں اور اس مقام کے حصول کے لیے اسباب اور مُعِدّات۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ[1] کے مواعظ اور تالیفات مطالعہ فرمائیں تو باطن میں ترقی ہوگی۔ والسّلام

ہیچمدان سلیمان
۹ر شوال ۱۳۶۴ھ[2]

(پس تحریر):

بالکل کافی ہے[3]

اس فقیر نے جو کچھ لکھا ہے اُس کو واقعے کے بجائے آپ تفاؤل پر محمول فرمائیں۔[4]

(۱۶۴)

اعظم گڑھ
۲۷۔ صفر ۱۳۶۵ھ[5]

اخی فی اللہ تعالیٰ ادام اللہ توفیقکم!

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ الحمد للہ مع الخیر ہوں، اور داعیِ خیر،

یہ تو حالاتِ مرض ہیں، مگر اب ان کا جو علاج ہے اُن کی طرف متوجہ ہوں، آپ چاہتے ہیں کہ آپ پر عشق کے آثار طاری ہوں لیکن حصولِ عشق کے جو طریق ہیں اُن سے آپ

---

[1] حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف اشارہ ہے۔ آیندہ خطوط میں بھی حضرت یا حضرت والا یا حضور کے الفاظ کا مشار الیہ حضرت تھانویؒ کی ذات گرامی ہے

[2] مطابق ۱۷ر ستمبر ۱۹۴۵ء

[3] دارالمصنفین، اعظم گڑھ کے پتے کی کفایت کے بارے میں دریافت فرمایا تھا

[4] حضرت مکتوب نگار نے پتے میں مکتوب الیہ کے نام کے ساتھ "مولانا" لکھا تھا۔ اس پر مکتوب الیہ نے لکھا تھا کہ یہ بھی مشکل ہے کہ "مولوی" کے معیار پر پورا اتر سکوں، حضرت مکتوب نگار کا یہ جملہ اس کے جواب میں ہے

[5] مطابق ۳۱ر جنوری ۱۹۴۶ء۔

اپنے کو مانوس کرنا نہیں چاہتے۔ یہ بتائیے کہ اگر آپ کو کسی سے طبعی عشق نہ ہو یا کسی نادیدہ سے عشق کرنا ہو تو اس کی کیا صورت ہے؟ صورت یہی ہے کہ اُس کا نام بار بار دہرایا جائے دل سے، زبان سے، خیال سے اور اُس کے کمالاتِ حُسن پر ہر طرح سے غور کیا جائے اور اس سے مادۂ عشق کو ترقی دی جائے۔

اسی کے قریب تدابیر غیر محسوس و غیر مرئی حسن و عشق کے لیے ہیں، پہلے کا نام ذکر اور دوسرے کا نام فکر ہے۔ اللہ کا نام رٹا جائے اور اُس کے کمالات قدرت و عظمت و رحمت و احسان پر غور کیا جائے یہی ذکر و فکر ہے جو صوفیہ کے ہاں مروج ہے اور قرآن پاک میں ان دونوں کی طرف اشارات ہیں۔ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ اور یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا (۳: ۱۹۱) وغیرہ من الآیات۔ تعلیمات تصوف حقیقی حَسْبُنَا کتاب اللّٰہ وسنۃ رسولہٖ الگ نہیں۔ آپ نے اس حیثیت سے ابھی ان مسائل پر شاید غور نہیں فرمایا۔

"اعبد ربك كانك تراه" مطلوب ہے یہ مطلوب کیوں کر حاصل ہو؟ فِیْ صَلٰوتِہِمْ خَاشِعُوْنَ مقصود ہے۔ اس کا حصول کیسے ہو؟ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (۲: ۱۶۵) یہ محبت مراد ہے۔ یہ مراد کیسے ہاتھ آئے؟

بیعت موجب برکات ویسے ہی ہے جیسے ظاہری علوم میں کتابوں کے باوجود استادی و شاگردی کی نسبت۔ اقصر طریق ذکر و فکر اور ہمت و عزیمت ہے ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست

والسلام ہیچمدان سلیمان

(۱۶۳)

اعظم گڑھ

اخی فی اللہ تعالیٰ ادام اللہ توفیقاتکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ بڑی ہی خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فہم دین عنایت فرما کر صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمائی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (۵۷: ۲۱)

یہ وہ آیاتِ پاک ہیں جن کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے وقت آسمان کی

طرف آنکھ اُٹھا کر پڑھا کرتے تھے جیسا کہ صحاح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اس ہیچمدان کو تو آپ کے ذوقِ سلیم سے اُمید ہے کہ حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور مواعظ سے انشاء اللہ جلد فائدہ ہوگا۔

یہ عزم مبارک ہو، مگر جلدی نہ فرمائیں۔ یہ ہیچمدان تو خدمت کے لیے حاضر ہے۔ ضرورت ہے کہ چندے مکاتبت جو ہمارے سلسلے میں قائم مقام فیض و توجہ ہے، جاری رہے۔

ہمارے حضرت کا مذاق عموماً یہ تھا کہ اکثر خواب کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور ٹھیک احادیث کے مطابق اُس کو محض مبشر جانتے تھے جو کوئی مرد مومن اپنے لیے دیکھے یا کسی دوسرے مسلم کے لیے۔

خواب کی تعبیر اپنی سمجھ کے مطابق عرض کرتا ہوں۔ مکان کی حالت ظاہر کی سادگی اور باطن کی معموری ہے۔ سبز لباس اہل جنت کی نشانی ہے، سپید کپڑا سنت کی طرف اشارہ ہے کہ حدیث میں یہ احسن لباس مُردوں کے لیے ہے۔ وفیہ کفنوا موتاکم اور یہ صوفیہ کی اصطلاح میں موتوا قبل تموتوا ہے۔ جس کا دوسرا نام فنا ہے۔ بندہ پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو اُس کی زندگی صرف رضائے الٰہی کی زندگی ہو جاتی ہے، اپنے اختیار سے کچھ نہیں ہوتا۔

طبقات ابن سعد صحابہ کی سیرت و زندگی ہے

ہدایات ذیل عرض ہیں:

۱۔ قصد السبیل حضرت والاؒ ملاحظہ فرمائیں اور عالمِ مشغول کی ہدایات پر عمل فرمائیں۔

۲۔ جس وقت داخلِ سلسلۂ امدادیہ اشرفیہ ہونے کا عزم راسخ ہو یہ سمجھ کر داخل ہوں کہ اب اسی منہاج پر زندگی کے اخیر لمحے تک گزارنا ہے "تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ" (۱۲ : ۱۰۱) اور "فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" (۲ : ۱۳۲) اور "وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ" (۱۵ : ۹۹) کی آیتیں پیش نظر رہیں۔

۳۔ اس عزم کے بعد وضو کریں اور ممکن خضوع و خشوع کے ساتھ دوگانہ ادا کر کے استغفار کریں۔ اور خوب تضرع سے گناہوں کی معافی چاہیں اور اپنی نئی زندگی کے عزم کی

توفیق مانگیں، اور سمجھیں کہ آج سے اللہ تعالیٰ سے اطاعتِ کاملہ کا عہد آپ کر رہے ہیں ۔

۴ ۔ جو فرائض فوت ہوئے ہیں اُن کی قضا کی جائے، جو حقوقِ عباد تلف ہوئے ہوں یا آپ کے ذمے باقی ہوں اُن کو ممکن ہو تو ادا کیجیے یا صاحبِ حق سے معاف کرائیے اگر مر گیا ہو تو اس کے ورثاء سے معاف کرائیں اور اس کے لیے دعائے خیر کریں ۔ غرض تلافیٔ مافات کا تہیہ اور سابقہ ذنوب سے استغفار ضرور ہے ۔ توبہ اس راہ کا پہلا قدم ہے ۔ پھر اصلاح اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا

بھمدان سلیمان ۔ ٦ر ربیع الآخر ۱۳۶۵ھ[1]

(۱۶۴)

دیسنہ ضلع پٹنہ

اخی فی اللہ تعالیٰ ادام اللہ توفیقاتکم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۱) بہتر عمل وہی ہے جو اَدْوَم ہے اگرچہ اقل ہے جو کچھ شروع کیا جائے وہ دوام عملی کو مدِ نظر رکھ اختیار کیا جائے ۔

۲۴ ہزار[2] بقدر انفاس شب و روز حضرات مشائخ نے مقرر فرمایا ہے بے شبہ یہ تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہو گی، آپ تین ہزار روزانہ سے شروع کریں پھر جیسے جیسے طبیعت میں آمادگی پیدا ہو بڑھائیں جہاں تک بڑھ سکے اور جب اس کے اثرات میں رسوخ نمودار ہو گا تو پھر عرض کیا جائے گا ۔

(۲) یہ حال بہت اچھا ہے، اسی پر شکر کیجیے کہ اور ترقی عطا ہو ۔ وَلَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ (۱۴ : ۷) ۔

آپ تعلیم الدین اور تبلیغ دین[4] کا مطالعہ اس نیت سے فرمائیں کہ اس آئینے میں اپنے کو دیکھیں جو اپنے میں خیر یا مطابق عمل پائیں اس پر شکر کریں اور جو کمی پائیں اس کے حصول

---

[1] مطابق ۱۱ر مارچ ۱۹۴۶ء ۔ [2] اسم ذات کا ذکر [3] مکتوب الیہ نے لکھا تھا کہ فرائض اور واجبات اور سنن موکدہ پر عمل "کم" گراں گزرتا ہے ۔ حضرت مکتوب نگار کا یہ جملہ اسی کے جواب میں ہے ۔ [4] دونوں حضرت تھانویؒ کی تالیفات ہیں

اور عمل کی کوشش فرمائیں۔ تبلیغِ دین میں کہیں کہیں زمانے کے لحاظ سے کچھ غلو معلوم ہوگا اس کی اصلاح حسبِ تجویز حضرت والا رحمۃ اللہ پوچھنے پر عرض کی جائے گی۔

(۳) بہت بہتر، اسی طرح قضا کیجیے ورنہ نوافل کی نیت کر لیجیے۔ حدیث شریف میں ہے، کہ جس کی فرض نمازوں میں کمی ہوگی وہ سنن و نوافل سے پوری کی جائے گی۔

جی نہیں فرائض کی قضا میں اخیر دو رکعتوں میں ضمِ سورہ نہیں ہے مثل ادا پڑھنا چاہیے البتہ سنن و نوافل میں ضمِ سورہ بھی ہے۔ پس قضا یا ادائے نفل جیسی نیت ہو اسی طرح پڑھنا چاہیے۔ آپ اندازہ کر کے قضائے فرائض حسابِ قیاسی کر کے صرف نفل کی نیت کر لیا کریں۔

نوافل و سنن میں سب سے اہم چیز تہجد کی رکعات ہیں جن کو بزرگوں نے اقتداءً بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم سنتِ مؤکدہ کا درجہ دیا ہے اور اس کو من شیم الصالحین قرار دیا ہے جیسا کہ احادیث میں ہے۔

(۴) اس تواضع پر دلی مبارک باد[1] جس نے پایا ہے اسی راہ سے پایا ہے۔

(۵) بیعت سے مقصود تعلیم پر باہمی معاہدہ ہے سو تعلیم جاری ہے۔ اپنا رسوخ دیکھ کر ان شاء اللہ تعالیٰ وقت پر اس برکت کے حصول کی خواہش فرمائیں گے تو دریغ نہ ہوگا۔ میرے پاس بجز حضرت والا کی نسبت کے کوئی اور چیز نہیں ہے۔ یہی نسبت ان شاء اللہ تعالیٰ پیش ہوگی۔

والسلام

سید سلیمان ۔ ۷/ج ۲ ۱۳۶۵ھ[2]

(۱۶۵)

بھوپال۔ بذریعہ سکریٹری تعلیمات۔

اخی اللہ تعالیٰ وفقکم اللہ تعالیٰ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مناسبتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ آپ کا مذاق چشتی جوش و خروش کے بجائے سکینت کا طالب ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ ممکن ہے ان بزرگوں

---

[1] مکتوب الیہ نے لکھا تھا کہ آں قبلہ عالم سمجھ کر مخاطبہ نہ فرمائیں

[2] ۷ جمادی الآخر ۱۳۶۵ھ مطابق ۸ مئی ۱۹۴۶ء۔

کے ظاہر طرز تعبیر سے آپ کو توحش ہو۔ مگر معناً توحش کی بات نہیں۔ کوئی ضروری امر اس راہ کا ایسا نہیں جو کتاب و سنت کے خلاف ہو، بلکہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو کتاب و سنت سے مؤیَّد نہ ہو۔

تعلیم الدین کا وہ حصہ جس میں اصطلاحات صوفیانہ ہیں، چھوڑ دیں، بقیہ حصہ تو محض احادیث کا ترجمہ ہے، حاشیہ پر اصل حدیثیں لکھی ہیں، اور تبلیغ دین کی بنیاد بھی احادیث ہیں۔ یہ بہرحال اگر اس میں جی نہ لگتا ہو تو آپ جامع ترمذی کی کتاب الزہد و الرقاق مطالعہ میں رکھیں، اور کتاب الدعوات کو عمل میں رکھیں، اور فکر و مراقبہ کیا کریں، جن کی نسبت آگے عرض کروں گا۔

ذکر ایک نشست میں مؤثر زیادہ ہوتا ہے اگر کئی نشستوں میں ہو تو بھی خیر اور اگر سرے سے اس میں جی نہ لگتا ہو تو فکر اور تسبیح سے کام لیں۔ مقصود یہ ہے کہ کثرت ذکر کی عادت پڑ جائے وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا.... (۳۵:۳۳) اور وَاذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (۳۳:۴۱) اور رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۲۴:۳۷) کے تحت ذکر لسانی و قلبی جاری ہو جائے۔

بے شبہ صحبتِ شیخ کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ پہلے آپ اپنے عزم میں رسوخ پیدا کر لیں پھر اس رسم بیعت کو اختیار کریں تاکہ بعد کو اپنے فعل پر ندامت نہ ہو۔ اگر آپ انتخابِ شیخ میں رسوخ اور عزم کا یہ مرتبہ حاصل کر چکے ہیں تو مضائقہ نہیں۔

فکر و مراقبہ کی صورت یہ ہے کہ باوضو کسی مقرر وقت میں آنکھ بند کر کے ہاتھ باندھ کر کسی اطمینان کے مقام میں بیٹھ کر کسی معنی پر اتنا غور کریں کہ وہ آپ میں رچ جائے اور آپ اس میں رنگ جائیں اور اس کا یقین قلب میں پیوست ہو جائے۔ قرآن پاک میں ہے۔

اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.... (۲۴:۳۵) حدیث میں ہے هُوَ نُوْرٌ اور ہے اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ۔ آپ اس کا مراقبہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کا نور آپ میں اور تمام آسمان و زمین میں پھیلا ہے۔ قلب کی طرف دھیان کریں کہ اس میں اللہ کا نور یا لفظ اللہ بخطِ نورانی لکھا ہے۔

حیدر آباد کا قصد شاید پورا نہ ہو لیے[1] والسلام

ہیچمداں سلیمان۔ ۱۰ر شعبان ۱۳۶۵ھ[2]

(۱۴۶)

بھوپال۔ ۲۰ر شعبان [۱۳۶۵ھ][3]

اخی فی اللہ تعالیٰ! زادکم اللہ تعالیٰ علماً و عملاً۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۱) امید ہے کہ آپ نے ہمت و عزیمت کے ساتھ عمل شروع کر دیا ہوگا۔

(۲) عمل فرما کر کیفیت سے مطلع فرماتے رہیں۔

(۳) بسم اللہ وعلیٰ برکۃ اللہ یہ فقیر ہیچمداں اپنی بے بضاعتی کے باوجود حسبِ استطاعت خدمت کو حاضر ہے۔

آپ اس خط کو پا کر کسی اطمینانِ خاطر کے وقت اچھی طرح وضو کر کے بہ خلوص دوگانہ نفلِ توبہ ادا کریں، اور اس کے بعد استغفر اللہ من کل ذنبٍ واتوب الیہ ستّر دفعہ پڑھ کر درگاہ باری تعالیٰ میں جملہ گناہوں اور تقصیرات سے توبہ کریں، اور اپنی اس عزیمت و توبہ پر قائم رہیں کہ آج سے میری نئی زندگی شروع ہوتی ہے، التائب من الذنب کمن لاذنب لہ، اور اس کے بعد الحمد اور قل ھو اللہ احد الخ ۳ بار اول و آخر درود پاک کے ساتھ بزرگان چشتیہ صابریہ پر علی العموم اور خصوصیت کے ساتھ نام لے کر حضرت حاجی مولانا شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ قدس سرہٗ کو اس کا ثواب بخشیں، اور زبان سے عہد کریں کہ آج سے میں اپنے شیخ کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر صداقت سے بغیر تعلل کے عمل کروں گا، پھر یہ آیت کریمہ پڑھیں۔

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ یدُ اللہ فوق ایدیھم فمن نکث فانما ینکثُ علیٰ نفسہ ومن اوفیٰ بما عاھد علیہُ اللہَ فسیوتیہ اجراً عظیماً (۴۸: ۱۰)

اس کے بعد مجھے اطلاع دیں اور معمولات شروع کریں۔ نوافل، اوّابین و اشراق و تہجد

---

[1] حضرت مکتوب نگار نے حیدر آباد کے سفر کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔

[2] مطابق ۱۰ر جولائی ۱۹۴۶ء۔

[3] مطابق ۲۰ر جولائی ۱۹۴۶ء۔

پر استقامت کریں اور اپنے رذائل پر نظر رکھیں اور ایک ایک کی اصلاح کی کوشش اس طرح کریں کہ پہلے اس کی حقیقت سمجھیں، پھر اس کے ازالہ یا امالہ کی تدبیر دریافت کریں۔

والله یوفقکم ویثبتکم

الفقیر الی اللہ، سلیمان

احد مسترشدین حضرت شاہ مولانا اشرف قدس سرہٗ

(۱۶۷)

بھوپال۔ موتی مسجد
۱۵ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ[1]

اخی فی اللہ تعالیٰ! ادام اللہ تعالیٰ توفیقکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

(۱) یہ میرے لیے موجبِ سعادت ہے کہ آپ کو اس ذرۂ بے مقدار کے ذریعے اس آفتابِ رشد و ہدایت کے ساتھ نسبت حاصل ہوئی ہے[2]

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتابِ تابانیم

میرا یہ احسان نہیں جس کی شکر گزاری کریں یہ طریقِ ادا بھی اصلاح چاہتا ہے شکر اللہ تعالیٰ کا ادا فرمائیں۔ یہ حقیر بھی اور آپ بھی کسی بندے کے شکر کی حاجت نہیں۔

(۲) آپ کو بیعت میں داخل کر لیا گیا۔

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کے بقول یہ بیعت طرفین سے معاہدہ ہے۔ مفید کی طرف سے اس بات کا کہ وہ تعلیم اور شفقت میں اپنے جانتے کمی نہ کرے گا۔ اور مستفید کی طرف سے اس بات کا کہ وہ اتباع میں حسبِ استطاعت کمی نہ کرے گا۔

(۳) ناغہ اگر معذرت کی بنا پر ہو تو خیر معذوری ہے، اور اگر کسل یا غفلت کی بنا پر ہو تو یہ حرمان کا باعث ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شاگرد کے مطالعہ نہ دیکھنے اور سبق نہ یاد کرنے میں کہ عذر معتبر ہے مگر کسل و غفلت حرمانِ تعلیم کا موجب ہے۔ فافہم۔

(۴) بالکل صحیح ہے سی نسبت سے پڑھیں[3] اور ہمیشہ ہدایت والی کتابوں اور رسالوں کو اسی

---

[1] مطابق ۱۲ اگست ۱۹۴۶ء
[2] آفتابِ رشد و ہدایت سے مراد مولانا اشرف علی تھانوی ہیں
[3] حضرت سید صاحب نے ہدایت فرمائی تھی کہ جامع ترمذی کا مطالعہ کریں۔ اس ہدایت کے جواب میں مکتوب الیہ نے لکھا تھا کہ کتاب الزہد کا مطالعہ صرف برکت ہی کی خاطر نہیں بلکہ اصلاح اخلاق [illegible] خاطر کر رہا ہوں

نیت سے پڑھیں، اور اپنے میں کمی پاکر اپنی اصلاح و تکمیل میں مصروف رہیں۔ والسلام

ید محمد سلیمان

⑯⑧

حضرت سید صاحب نے ابتدائی پانچ نمبر جن باتوں کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں ان کا خلاصہ مکتوب الیہ کے الفاظ میں درج کر دیا جاتا ہے۔

(۱) اس تصریح سے کہ "تجھ کو داخلِ بیعت کر لیا گیا" مزید مسرت حاصل ہوئی۔

(۲) بفضلہ تعالیٰ ہدایات پر عمل کر رہا ہوں۔ پوری کوشش اس کی رہتی ہے کہ کسل و غفلت سے کوئی عمل ناغہ نہ ہو۔

(۳) بحمد اللہ تعالیٰ عبادت کے بعد قلب میں شگفتگی اور ترک سے انقباض محسوس ہوتا ہے۔ پھر بھی ناروا باتیں سرزد ہو جاتی ہے، اختیاراً بھی اور اضطراراً بھی۔

(۴) جس گندے ماحول میں ہوں اُس قعر دریا میں رہتے ہوئے دامن بچانا بڑے سخت مجاہد کا کام ہے۔ دُعا فرمایئے کہ قوتِ ایمانی اس درجہ کی نصیب ہو۔

مجھ میں بڑی کمزوری فقدانِ جرأت کی ہے۔ مروتیں کچھ ایسی آڑے آجاتی ہیں کہ بسا اوقات اظہار حق نہیں ہو سکتا اپنی اس کوتاہی پر ندامت ہے۔

(۵) حیدرآباد دکن مدفنِ علم و عمل ہے الامن وقاہ اللہ تعالیٰ من الشرور والفتن یہاں عام طور پر علماء و مشائخین کی جو صحبتیں ہیں ان میں بھی سوائے رسم اذان کے روح اسلام نہیں محسوس ہوتی ۔ ۔ ۔

۱۱ر شوال ۶۵ھ[1] یکشنبہ۔ ۱ بجے

بھوپال۔ موتی مسجد

اخی فی اللہ تعالیٰ! نور اللہ قلبکم وشغاہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۱) آپ کی اس مسرت پر مجھے مسرت ہے۔

(۲) بحمد اللہ تعالیٰ۔ یہ علامات خیر سے ہے زادکم اللہ خیراً۔

(۳) اس کا علاج علی الفور استغفار ہے۔

(۴) بے شبہ یہ مجاہدہ ہے۔ اسی سمندر سے ہو کر ہم کو پار ہونا ہے۔

---

[1] مطابق ۸ر ستمبر ۱۹۴۶ء۔

اظہارِ حق کسی سبب سے نہ ہو سکے تو خیر، مگر اس میں شرکت تو نہ ہو۔ ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی؟ اس ندامت کے تخم ہی سے آیندہ جراتِ حق کا نخل بارآور پیدا ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

(۵) میری عرض بھی سُن لیں۔

غیروں کی حالت کا رونا بیکار ہے۔ ہم کو اپنی ہی حالت پر رونا چاہیے۔ مجھ ہیچمدان کو تو اشخاص کا علم نہیں۔ اپنے علم کے مطابق چند اشخاص سے حسنِ عقیدت رکھتا تھا۔ ایک تو چل بسے مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے احوال کے آدمی تھے[1] دوسرے مولانا سید عبداللہ صاحب مجدّدی کے ساتھ حسنِ ظن ہے۔ حیدرآباد کے مشائخ میں مغتنم ہیں۔ تیسرے آپ کے پاس مولوی محمود الغنی صاحب ہیں جو بڑے متواضع اور حضرت والا رحمۃ اللہ کے صحبت یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں۔ انسان جس نعمت کو ہمیشہ دیکھتا ہے اس کی قدر نہیں کرتا۔

(۶) اس وقت کرنا یہی ہے کہ اپنی تربیت میں آپ لگیے۔ جب دوسروں کے قابل ہو جائیے گا تو دوسروں کے کام کیجیے گا۔

(۷) تبلیغ مختلف نوعیتوں کی ہو سکتی ہے ان میں سے جس نوعیت کی آپ استطاعت رکھتے ہوں، اس کی تبلیغ کریں، اللہ تعالیٰ ثواب دے گا۔

مگر تجربہ یہ ہے کہ جب تک نفسانیت اور انانیت اور خودغرضی اور حبِ جاہ فنا نہیں ہوتی تبلیغ مؤثر نہیں ہوتی۔

(۱) فذکّر ان نفعتِ الذکریٰ (۸۷ : ۹)، (۲) وذکّر ان الذکری تنفع المؤمنین (۵۱ : ۵۵)، (۳) لعلک باخع نفسک الّا یکونوا مؤمنین (۲۶ : ۳)، (۴) لا تحزن علیھم

---

[1] حیدرآباد میں وجودی رنگ کے ایک بڑے صاحب حال و قال بزرگ حضرت مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ تھے۔ شیخ اکبر کے مسلک پر مخلوقات کی توجیہ معلوماتِ الٰہیہ کی تجلیات نمود و ظہور سے بڑے جوش و خروش سے فرماتے، نئے پرانے دونوں طبیعتوں کے اہلِ علم بہت متاثر ہوئے جن میں ہمارے مولانا مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر میر ولی الدین جیسے مشہور و معروف اصحابِ علم و قلم تک داخل ہیں، بلکہ دونوں مشہور مجاز و خلیفہ ہیں۔" (مولانا عبدالباری ندوی، معارف سلیمان نمبر ص ۸۲)

(۱۵ : ۸۸)، (۵) لا یحزنک[۳]

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ تبلیغ اس وقت تک موثر نہیں جب تک اخلاص تام اور شفقت علی الخلق اس کا محرک نہ ہو۔ اور اس کے حصول کی راہ وہی ہے جس پر

[۱، ۲] مکتوب الیہ نے حیدر آباد دکن کے علماء و مشائخ کی ابن الوقتی، دنیا داری اور اخلاقی پستی پر اپنی برہمی کا اظہار کیا تھا۔ حضرت سید صاحب نے بعض بزرگوں کا استثنا فرمایا۔ ان دونوں نمبروں پر ڈاکٹر غلام محمد صاحب کے قلم سے حواشی ملاحظہ ہوں

۱۔ مولانا کی یہ برہمی طبقۂ مشائخین دکن کے حالات کی وجہ سے ہے، جن کی شاہ پرستی کا یہ حال تھا کہ جب آصف سابع نے "تفضیلی مسلک" کی طرف اپنا محض رجحان ظاہر کیا تو انھوں نے بڑھ کر اس پر صاد کر دیا بلکہ ایک شیخنت مآب نے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابل حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر علانیہ سب و شتم کا اظہار کر دیا۔ دوسری طرف اسی طبقہ نے بادشاہ کے تیور دیکھ کر اس مرد حق آگاہ مجاہدِ اسلام (بہادر یار جنگ مرحوم) کے خلاف خفیہ محاذ قائم کر لیا تھا جس کی للکار سے مسلمانان دکن میں حق و باطل کا شعور پیدا ہو چکا تھا اور وہ بیدار ہو چلے تھے، خدا کی شان کہ بہت جلد ان مشائخوں میں خود ہی تفرقہ پڑ گیا اور ایک "جمعیت مشائخین دکن (رجسٹرڈ)" بن گئی اور دوسری بلا رجسٹری چلتی رہی۔ (یہی منظر ہمارے نوزائیدہ ملک میں بھی اب رونما ہو رہا ہے!!)۔ اس شرمناک اور حسرت خیز ماحول سے فاضل مکتوب[ع] نگار کا دل مجروح تھا ورنہ عام طور پر یہ زمانہ علم و عمل کی عین بیداری و افزونی کا تھا۔"

۲۔ "حضرت مولانا مدظلہٗ (صاحب زجاجۃ المصابیح) کا مذکورہ مشائخین دکن سے کبھی دور کا بھی تعلق نہیں رہا اور حضرت ممدوح تو بہادر یار جنگ مرحوم کے خاص دعا گو تھے۔ ادام اللہ فیوضہٗ"

[ع] اسی مکتوب پر مکتوب الیہ کے بارے میں بھی ایک حاشیہ تحریر کیا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں۔

"مولانا محمد علی مرحوم کے مزاج میں تلون و تذبذب اور جذباتیت قریب قریب آخر وقت تک رہی البتہ موت اور قبل موت کا کچھ عرصہ بڑی یکسوئی، رسوخ اور سکینت کا تھا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ"

[۳] یہ جملہ قرآن حکیم کی پانچ سورتوں میں آیا ہے: ۳ : ۱۷۶، ۵ : ۴۱، ۱۰ : ۶۵، ۳۱ : ۲۰، ۳۶ : ۷۶

آپ گامزن ہو رہے ہیں۔

(۸) کر سکتے ہیں[1]

ہیچمدان

سلیمان

(۱۴۹)

بھوپال

اخی وحبیبی فی اللہ تعالیٰ رفع اللہ تعالیٰ احوالکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کی مخلصانہ محبت کا اثر ہے کہ مجھے اس طرح یاد فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس تعلق کو میرے اور پر آپ کے دونوں کے لیے باعثِ خیر و برکت بنائیں۔

خوشی ہوئی کہ اب آپ کے پیشِ نظر اصلاح کی صحیح صورت ہے۔

بے شبہ جہادِ نفس بہت بڑا کام ہے، مگر جنت کا دروازہ اسی جہادِ نفس سے کھلتا ہے۔ (واما من خاف مقامَ ربِّہٖ ونہی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھِی الماوٰی ۷۹: ۴۰، ۴۱) وکما جاء فی الحدیث یکون ھواہ تبعًا لما جئت بہ

اللہ تعالیٰ اپنی توفیق سے اس راہ کو میرے اور آپ کے لیے آسان فرمائیں۔

مجھے اس موقع پر یاد فرمایا اس کا شکریہ۔ اللہ تعالیٰ اس میں خیر و برکت عطا فرمائیں، دلی دعا ہے کہ حق تعالیٰ زوجین میں توافق عنایت فرمائیں، اور باہم مودت اور سکینت کا سامان بہم پہنچائیں۔

والسلام

ہیچمدان سلیمان

۱۱، ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ[2]

---

[1] مکتوب الیہ نے دریافت کیا تھا کہ آیا "بر مفادِ مسلم" گروہ مسلم لیگ سے تعاون کر سکتے ہیں۔ حضرت سید صاحب نے اسی کا جواب یہ دیا۔ مکتوب الیہ کو یہ استفسار شاید اس لیے کرنا پڑا کہ مسلم لیگ بھی مثل کانگریس کے ایک نیشنل جماعت تھی اور اس میں آغاخانی اسماعیلی، قادیانی وغیرہ شامل تھے۔ ویسے تعاون علی البر کا حکم عام ہے اور اس میں "مفادِ مسلم" شامل ہے۔

[2] مطابق ۶، نومبر ۱۹۴۶ء

(۱۷۰)

بھوپال

محبی و مخلصی و صدیقی! دامت توفیقاتکم

السّلام علیکم اللہ ورحمۃ اللہ

(۱) معمولات کی پابندی کی خبر سے خوشی ہوئی زادکم اللہ تعالیٰ حرصاً علی الخیر۔

(۲)[۱] طبعی تنفر موجبِ ثواب نہیں، ارادی تنفر خشیتِ الٰہی سے ہونا چاہیے لیکن رحمت کا امیدوار کر کے ہونا چاہیے نہ کر نہ کر کے۔ اس کو سمجھ لیں۔

(۳) آجکل ہر جگہ یہی صورتِ حال ہے۔ روپیہ رہنے کے باوجود بھی سامانِ راحت میسر نہیں، حدیث میں آیا ہے کہ جو ادا کرنے کی نیت سے قرض لے گا اللہ تعالیٰ اس کی مدد کریں گے مگر اس پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے کہ بے ضرورت باتوں اور کاموں میں تو ہم خرچ نہیں کر رہے ہیں۔ ہمیں خرچ سے پہلے بقول حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ غور کرنا چاہیے کہ اس میں خرچ کرنے کی ضرورت ہم کو ہے بھی یا نہیں؟

(۴) دنیا تو دار المحن ہے، یہاں آرام صرف قناعت اور رضا بالقضا سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ فقرائے الٰہی کو جو آرام ہے وہ امرا کو نہیں۔

(۵) دلی دعا ہے[۲]

(۶) پراگندہ روزی پراگندہ دل۔ سعدیؔ جیسے شیخ کا مقولہ ہے، علاج صرف ترکِ حرص ہے، جیسا کہ دعا میں ہے وقنّعنی بما رزقتنی۔ دوسرا علاج حدیث نبوی انظر الیٰ من ھو اسفلَ منکم ولا تنظر الی من ھو فوقکم وذلک احدر الّا تزدروا نعمۃ اللہ علیکم

والسّلام

ہیچمدان سلیمان[۳]

---

[۱] مکتوب الیہ نے لکھا تھا کہ ثمرے طبعی تنفر ہے۔

[۲] توسیعِ رزق اور سکونِ قلب کے لیے دعا کی درخواست کے جواب میں

[۳] یہ مکتوب مولانا محمد علی کے ۲۶ رمئی ۱۹۷۲ء کے عریضے کے جواب میں ہے

(۱۷۱)

محبی و حبیبی و مخلص! زادکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۱) الحمد للہ کہ آپ مع الخیر رہے۔

(۲) یہ سب محبت کے کرشمے ہیں، قرآن پاک کی آیت اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَہُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا (مریم: ۹۶) کے معنی پر غور فرمائیں۔

(۳) الحمد للہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے کہ اس نعمت میں ترقی ہو۔

(۴) معاشی و سیاسی معاملات کا حل اگر آپ کے ہاتھ میں نہیں تو راضی برضا رہیے اسی میں سکون ہے۔

آمین!

بدل دعا ہے۔

(۵) اللّٰہم انصر امۃ صلی اللہ علیہ والسلم وارحمہم

(۶) دست بدعا رہیے اور انابت الی اللہ سے قوت حاصل کیجیے اور مشکلات پر صبر۔ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ

والسلام

ہیچمدان سلیمان

۱۶ر شوال ۱۳۶۶ھ ۔ یکم ستمبر ۱۹۴۷ء

(۱۷۲)

محب مخلص! انزل اللہ تعالیٰ علیکم السکینۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۱) جو امور انسان کے اختیار میں نہیں، ان میں حصول طمانیت کا نسخہ یہ ہے کہ جو کچھ پیش آئے اس پر اپنی رضا ظاہر کی جائے رضا بالقضا طمانیت کی کیمیا ہے پھر یہ یقین رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتے ہیں اسی میں حکمت و مصلحت ہے گو اس کی حقیقت ہم کو فوراً معلوم نہ ہو۔ دیکھیے ممالک عرب کے ترکی سے علیحدہ ہو جانے پر مسلمانوں کو کتنا غم تھا۔ مگر دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے تیس برسوں میں کیا دکھلایا۔ لا تیئسوا من روح اللہ (۱۲: ۸۷)

میں بحمد اللہ تعالیٰ روزانہ پروردگار سے دعا و التجا میں مصروف ہوں۔

(۲) بے شبہ ہماری دینی پستی اور اخلاقی ناپاکی ایسی ہی ہے مگر پھر بھی ہم کو ایک نسبت رب العالمین اور رحمۃٌ للعالمین سے حاصل ہے کوشش کیجیے کہ ہر مسلمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو، اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہر فرد اپنی طرف متوجہ ہو۔ ہم جماعت کا ماتم کرتے ہیں مگر خود اپنا نہیں۔ آپ اپنے کو درست کیجیے، پہلے آپ اپنے کو بھنور سے نکالیے پھر دوسرے فریق کے نکالنے کی فکر کیجیے۔

(۳) لفظ "ہجرت" کا استعمال غلط ہے[1]، یہ ہجرت نہیں یہ فرار من الزحف ہے جو جہاں ہے وہیں رہے اور غزوۂ احد کے تیراندازوں کی طرح اپنی جگہ نہ چھوڑے وکان الانسان عجولاً (۱۷: ۱۱) حالاں کہ ان یوماً عند ربک کالف سنۃ مما تعدون (۲۲: ۴۷) دعا و استغفار میں معروف رہیے، اپنے لیے اور مسلمانوں کے لیے اللھم اغفر لی وللمسلمین والمسلمات واخذل الکفرۃ والمشرکین۔ والسّلام

ہیچمدان سید سلیمان

۹ محرم ۱۳۶۷ھ - ۲۳ نومبر ۱۹۴۷ء

(۱۷۳)

بھوپال - ۲ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ[2]

حبیبی و محبی رزقکم اللہ تعالیٰ عرفانہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ - الحمد للہ خیریت ہے۔ مکاتبت سے زخم دل تازہ ہوتا رہتا ہے اور اس کے ثمرات و برکات ظاہر ہیں۔ ایک ظاہری عشق کا سرشار کیا خوب کہتا ہے۔

؎ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

---

[1] مکتوب الیہ نے لکھا تھا کہ دل نہیں چاہتا کہ حیدرآباد (دکن) میں بقیہ زندگی گزارے اور ہجرت کے لیے حالات بھی سازگار نہیں حضرت سید صاحب نے یہ جواب تحریر فرمایا۔ اسی پر ہندوستان سے پاکستان کی "ہجرت" کو قیاس کر لینا چاہیے۔ صرف بعض علاقوں سے مسلمانوں کے ترک سکونت کو "مظلومانہ فرار" قرار دیا جا سکتا ہے "ہجرت" کی مقدس اسلامی اصطلاح کو اس ترک سکونت اور فرار کے لیے استعمال کرنا بڑی جسارت کی بات ہے۔

[2] مطابق ۱۳ر فروری ۱۹۴۸ء

مولانا رومیؒ نے مجنوں و لیلیٰ کی حکایت میں کہا ہے ؎

گفت عشق نام لیلیٰ میکنم
خاطرِ خود را تسلی می دہم

بحمد اللہ کہ حالات بدل رہے ہیں اور اب لوگوں کے نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے ؎

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

کل یوم ھو فی شان۔ دیکھیے کہ اگر کسی کی زندگی سے جو کام نہیں نکل رہا تھا وہ کام اس کی موت سے نکالا گیا[1] فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیء ۔۔۔ (۳۷ : ۸۳)

ولا یشرک فی حکمہ احدًا۔ (۱۸ : ۲۶)

---

[1] مولانا محمد علی نے لکھا تھا کہ ۳۰ جنوری (۱۹۴۸ء) سے موجودہ سیاست میں جو انقلاب ہوا ہے اس واقعے سے خطرے کے امکانات میں ایک حد تک کمی ہو گئی ہے۔" مولانا غلام محمد صاحب نے اس پر حاشیہ تحریر کیا کہ "۳۰ جنوری گاندھی جی کی تاریخ مرگ ہے۔ ناتھو رام گوڈسے نامی ایک شخص نے گاندھی جی کو مسلمانوں سے ہمدردی اور مسلمانوں کے قتل عام کی سازشوں کو ہرتال، برت وغیرہ کے ذریعے سبوتاژ کرنے پر مشتعل ہو کر قتل کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ شخص (گاندھی) مسلمانوں کا صرف ہمدرد ہی نہیں چھپا مسلمان ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم نے اپنی خود نوشت میں سروجنی نائیڈو اور گاندھی جی کے مسلمان ہونے کی روایت کا ذکر کیا ہے۔ ان کوششوں کو بھی گاندھی جی کی حمایت حاصل تھی جو مسلمان مغویات کو برآمد کرنے اور انھیں ہندوستان یا پاکستان میں ان کے خاندانوں میں پہنچانے کے لیے کی جا رہی تھیں۔

سید صاحب نے ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ گاندھی جی کو مسلمانوں سے ہمدردی، انھیں قتل سے بچانے اور مسلمان مغویات کو برآمد کرانے کی کوششوں کی نیکی کا اجر ضرور دے گا۔ اور جن مسلمان رہنماؤں کی عاقبت نااندیشانہ سیاست کی بدولت لاکھوں مسلمان مظلومانہ مارے گئے۔ عورتیں بیوہ، بچے یتیم، بوڑھے بے سہارا ہوئے، ہزاروں مسلمان بستیاں اجڑیں، مسجدیں ویران ہوئیں، خدا کے ہاں ان سے مواخذہ ضرور ہو گا۔ اور شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہٗ کے ایک مکاشفے کے مطابق تو ایک بزرگ سیاست دان سے مواخذہ ہو رہا ہے

اللہ تعالیٰ صناع مطلق ہیں۔ ہم افراد اور جماعات اس کے اوزار ہیں۔ صناع اپنے کام میں کسی متعین اوزار کا محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ دین کی بقا اور اسلام کی حیات کا وعدہ فرما چکے ہیں وانا لہ لحافظون۔ سو دین کی بقا اور اسلام کی حیات میں شبہ نہیں۔ شبہ اس میں ہے کہ آیا وہ کام ہم سے لیا جائے گا یا دوسروں سے۔ یستبدل قوما غیرکم کا خطرہ ہے۔ ڈر یہ ہے کہ آیا صناع عالم اپنی صنعت کے لیے ہم سے کام لیتا ہے یا دوسروں سے، محرومی ہماری ہوگی۔ اگر ہم نکمے اوزار ثابت ہوں گے تو ماہر صناع دوسرے اچھے اوزار کو کام میں لائے گا اور ہم محروم کر دیے جائیں گے آپ مسلمانوں کی حفاظت کو نہ سوچیں اسلام کی حفاظت کو سوچیں، لیکن لوگ مسلمانوں کو سوچتے ہیں، اسلام کو نہیں۔

من و تو گر ہلاک شویم چہ باک
غرض اندر میاں سلامت اوست

آپ میری حالت قیام میں تشریف لا سکتے ہیں۔ بحمد اللہ خیریت ہے اور خیریت کا طالب، آپ کے لیے دل سے دعا ہے۔

ہیچمداں سلیمان

(۱۷۴)

محبی العزیز! زادکم اللہ تعالیٰ معرفتہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۱) بحمد اللہ تعالیٰ کہ آپ کو صحت ملی، کنکری کا نکلنا اچھا ہوا[1]۔ اللہ تعالیٰ خیر فرمائیں فقیر بھی دعا کرتا ہے۔

(۲) خوشی ہوئی کہ مداومت فرما رہے ہیں، مداومت اصل ہے اس کے بغیر فائدہ نہیں کما جاء فی الحدیث کعملہ صلی اللہ علیہ وسلم دیمۃ"

(۳) اس فقیر کو یاد کرنا محبت فی اللہ کا ثمرہ ہے زادنا اللہ تعالیٰ حبا فیہ اپنا ایک شعر یاد آیا، لکھتا ہوں۔

---

[1] مکتوب الیہ کے گردے سے پتھری نکلی تھی

ہر سمت نظر آتے ہیں، ہر وقت وہ مجھ کو
دوریِ مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں

بلکہ یہ حال ہو گیا تھا۔

سجدہ طرفِ کعبہ ہے دل تیری طرف ہے
اب قبلہ بھی اے قبلہ نما بھول گیا ہوں

یہ آغاز کے احوال ہیں، اللہ تعالیٰ کمال کی دولت عنایت فرمائیں۔ والسلام

فقیر ہیچمدان سلیمان

۲۰؍ شوال ۱۳۶۷ھ[۱]

(۱۷۵)

سقوطِ حیدر آباد اور اس کے مابعد اثرات سے متاثر ہو کر مولانا نے ایک کارڈ لکھا تھا۔ حضرتِ والاؒ کی طرف سے یہ جوابی کارڈ (غ۔ م)

محبی و مخلصی! رزقکم اللہ السکینۃ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ، جی ہاں رضا بالقضا سے چارہ نہیں لیکن گو چارہ نہ ہو تاہم یہ یقین رکھنا چاہیے کہ گو، ہماری مرضی کے خلاف ہو لیکن ہمارے لیے مصلحت بھی اسی میں ہے جو قضائے الٰہی ہے عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئاً وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون۔ (۲:۲۱۶)

آپ صاحبوں کو وہ میری گفتگو یاد ہوگی جو بمبئی میں کی گئی تھی، ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین آمنوا معہ متی نصر اللہ الا ان نصر اللہ قریب (۲:۲۱۴)۔

صبر کی بڑی اہمیت ہے، صبر نام ہے ناگوار باتوں کے پیش آنے پر بھی حق پر قائم رہنے کا۔ واستعینوا بالصبر والصلوۃ وانھا لکبیرۃ الا علی الخاشعین الذین یظنون انھم ملاقوا ربھم وانھم الیہ راجعون (۲:۴۶) پھر فرمایا: اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون (۲:۱۵۶) ہم اللہ کے ملوک

---

[۱] مطابق ۲۶؍ اگست ۱۹۴۸ء

اور مالک کو اپنے مملوک میں ہر طرح کے تصرفات کا حق حاصل ہے۔ مملوک کو خیر ہو یا شکایت کا حق حاصل نہیں۔

اب آپ کا پنشن کا زمانہ آگیا، اس کے بعد ترک مستقر کا مشورہ دینے کو جی نہیں چاہتا، بے شبہ دین کی حفاظت کے لیے ہجرت ہے، مگر اس زمانے میں مدینہ کہاں ہے اس لیے اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو کم از کم سرِ دست تو اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتا۔

میرا ابھی یہاں قیام مستقل نہیں، ابھی ارادہ متعین نہیں، یہاں کچھ دین کا کام ہو رہا ہے، بہتر یہ ہو کہ فرصت متوقع کے بعد کچھ دنوں کے لیے پہلے یہاں تنہا آجا کر دیکھیں۔

مجھے مولوی مناظر صاحب[1] اور مولوی فضل صاحب[2] کا کوئی خط نہیں آیا، ان کی خیریت سننے کا متمنی ہوں۔

والسلام

فقیر ہیچمدان سید سلیمان

۲۲/ ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ[3]

(۱۷۶)

محبِ عزیز! ادام اللہ توفیقکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۱) ہیچمدان ۲۹/ دسمبر کو بمبئی اور ۸/ جنوری کو بمبئی سے چل کر ۹/ کی صبح بھوپال پہنچا۔ جہاز پر کچھ مزاج ناساز ہو گیا تھا اس لیے ہفتہ عشرہ بمبئی ٹھہرنا پڑا، یہاں اگر بھی ضعف غالب تھا۔ اب بحمد اللہ تعالیٰ مزاج اعتدال پر آگیا ہے اور کام کرنے لگا ہوں۔

عزیزی غلام محمد کے دو خط حرمین میں ملے تھے مگر اس دفعہ میرا یہ حال رہا کہ قلم پکڑنے

---

[1] مولانا مناظر احسن گیلانی مشہور عالم دین، دارالعلوم دیوبند کے فرزند جلیل، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے قابلِ فخر مرید، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) میں شعبۂ اسلامیات کے مشہور استاد، سیرت، تاریخ اسلام، تصوف، تعلیم، اسلامی معاشیات وغیرہ میں متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف ۵ رجون ۱۹۵۶ء کو اپنے وطن بہار میں انتقال فرمایا۔

[2] مولانا فضل اللہ صاحب مؤلف فضل اللہ الصمد شرح الادب المفرد (غ۔م)۔

[3] ۲۶/ اکتوبر ۱۹۲۸ء سید صاحب نے یہ خط بھوپال سے لکھا تھا۔

سے طبیعت مشکرہ ہو گئی اس لیے نہ کوئی خط لکھ سکا نہ کوئی نوٹ ہی تیار کر سکا۔ حالاں کہ بیرونِ ہند سیاحتوں میں اور سفروں میں برابر اس کا اہتمام رہا مگر اس دفعہ تو گویا قلم سے بیزاری ہی غالب رہی۔

(۲) جو بات آپ نے آخر میں لکھی ہے اس کے متعلق اپنا خیال یہ ہے کہ طبائع پر یورپ کا اقتدار اتنا مستولی ہے کہ وہ ایک طرف اسلام بھی چاہتے ہیں دوسری طرف یورپ کے رنگ ڈھنگ اور خیالات کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے۔ یہ حال صرف کسی ایک اسلامی ملک کا نہیں بلکہ سارے اسلامی ملکوں کا یہی حال ہے کہ ان میں وہی قانون، وہی ادا، وہی طرز محبوب ہے جو فرنگی ہے، باقی نام اسلام کا صرف زبانوں تک ہے۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کی خواہشوں کو عین اسلام ثابت کر دیا جائے[1]۔ ضرورت پہلے مطلوب کے مومن بننے کی ہے اس کے بعد دوسرے کام ہیں لوگ الٹی گنگا بہانے کو کہتے ہیں[2]

والسلام ۔ سید سلیمان

۷ ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۹ھ، ۲۷ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

⑰⑦

یہ مکتوب گرامی حضرت سید صاحب نے مکتوب الیہ کے ۲۵ فروری سنہ ۱۹۵۳ء کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا۔ مکتوب الیہ کے نام سید صاحب مرحوم کا یہ آخری مکتوب ہے (ا۔ س۔ ش)۔

محبی و مخلصی! وفقکم اللہ تعالیٰ لما یحبّ و یرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

(۱) جواب میں زحمت کے بجائے مسرت کا موقع ہے۔

---

[1] اس پیشگوئی کی صداقت آج کس قدر کھلی ہوئی نظروں کے سامنے ہے (غ۔ م)۔

[2] یہ لوگ وہ نادان دوست ہیں جو بڑے بے دین اور بدنیت نہیں بلکہ دین دوست ہیں مگر تمام سیاست زدہ "لا الٰہ" کے معنی "لا حاکم" میں منحصر سمجھنے والے اور اسلام کو "تحریک" اور بعثت نبوی کی غایت "قیام حکومت" گرداننے والے۔ (غ۔ م) اس حاشیے میں مولانا غلام محمد صاحب کا اشارہ جماعتِ اسلامی پاکستان کے عقائد، دعاوی اور مساعی کی طرف ہے۔ لیکن وہ کھلا کھلا یا صراحتاً اس کو واضح کرنا نہیں چاہتے

(۲) استقامت و مداومت اصل طریق ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید توفیق بخشیں [۱]

(۳) اللہ تعالیٰ کے فضل سے جو کام آپ نے شروع کیا ہے اس سے خیر کی امید قوی ہے۔ طریق کار کا علم ہوا، مفید ہے اس کو جاری رکھیں اور نفس کی آلائش سے بچائیں سوائے رضائے حق کے کوئی دوسرا مقصد نہ ہوئے [۲]

(۴) اس کو نصب العین بنا کر ہمیشہ پیش نظر رکھیں اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ [۳]

(۵) دل سے دعا ہے۔

سید سلیمان

---

[۱] حضرت کی ہدایات پر مداومت و استقامت کے جواب میں

[۲] مسلمانوں کی اصلاح و تعلیم اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں مساعی کے جواب میں

[۳] مولانا محمد علی مرحوم نے اصلاح و ارشاد کے جو کام شروع کیے تھے اور ان کے جو نتائج سامنے آتے تھے، ان کے بارے میں مولانا غلام محمد صاحب لکھتے ہیں:

"الحمد للہ کہ اس کام میں بڑی برکت رہی، بیسیوں مسلمان، مومن صادق بن گئے۔ سیکڑوں ہزاروں کے عقائد کی اصلاح ہو گئی جو بیت المال قائم کیا گیا اس میں مولانا مرحوم کے انتقال کے وقت ایک لاکھ سے زائد کی رقم تھی اور سیکڑوں بیواؤں، طالب علموں اور ناداروں کی اس سے امداد ہو رہی تھی اور بڑی بات یہ ہے کہ یہ کام اب تک چل رہا ہے"۔ یہ خط ربیع الاول ۱۳۸۴ھ کے بینات کراچی میں چھپا تھا۔ گویا اس وقت (جولائی ۱۹۶۴ء) تک یہ کام جاری تھا

عبد العزیز کمالؔ

(۱۷۸)

امیر جامعہ احمدیہ۔ قاضی ریاست بھوپال
مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

معارف اور صاحب معارف کے ساتھ حسنِ ظن کا شکریہ!

آپ نے جو خیال کیا ہے اس کو ضرور پورا کیجیے۔ معارف میں ان عنوانوں پر کوئی خاص مضمون نہیں نکلا ہے۔ متفرق معلومات خواہ مل جائیں آپ میری کتاب خیام ملاحظہ کیجیے مولانا شبلی کے مقالات میں وہ مضامین پڑھیے جن سے آپ کو تعلق ہے، "تمدن عرب" موسیو لی بان اور "تاریخ عرب" موسیو سیدیو بھی پڑھیں جن کے ترجمے اردو میں ہو چکے ہیں۔ "تاریخ تمدنِ عرب" حصہ سوم مصنفہ جرجی زیدان دیکھیے اس کا ترجمہ بھی اردو میں ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی جلدیں دیکھ کر معلومات فراہم کیجیے، میری کتاب "عربوں کی جہاز رانی" بھی دیکھیں، نیز عربوں کی بحری تصنیفات شائع کردہ فرانس، اور قانون مسعودی بیرونی، کتاب البیرونی و سوانح البیرونی، مضامین مہندسین، اسلام اور معارف، اسلامک کلچر حیدرآباد دکن کی جلدیں۔

ان مضامین میں سے معارف کے لیے آپ اعظم گڑھ سب اڈیٹر معارف کو لکھیے میرا نام نہ لکھیے۔ والسلام

۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ[1]

سید سلیمان

تمکین کاظمی

(۱۷۹)

مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

نوازش نامہ ملا۔ ادبی خدمت کا یہ نیا جوش مبارک ہو۔ باقی میرا حال تو یہ ہے۔

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے
اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

معذرت خواہ ہوں۔ والسلام

بھوپال۔ ۱۲ نومبر ۱۹۴۶ء

سید سلیمان

---

[1] مطابق ۲۵ اگست ۱۹۴۶ء

(۱۸۰)

مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ بخیریت ہوں اور تماشائے روزگار دیکھ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلوں کو دور فرمائیں۔ معلوم نہیں آج کل آپ کے ادبی مشاغل کیا ہیں۔ والسلام

سید سلیمان

بھوپال۔ ۱۲؍ اپریل ۱۹۴۹ء

مفتی محمد ابراہیم فریدی سمستی پوری

مکتوب الیہ: مولانا مفتی محمد ابراہیم، سمستی پور (صوبہ بہار) کے رہنے والے ہیں۔ مدتوں مدرسہ شمس العلوم بدایوں میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے علم و فضل میں علمائے قدیم کا نمونہ ہیں۔ انھوں نے "حیاتِ شبلی" کے بعض تسامحات کی اپنے ایک خط میں نشان دہی کی تھی۔ علامہ سلیمان ندوی نے اس کے جواب میں یہ خط لکھا (ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم)

(۱۸۱)

بھوپال

مکرم و محترم دامت فضائلکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

والا نامہ کا شکریہ، آپ کے معلومات سے مستفید ہوا، امید ہے کہ حیاتِ شبلی کے آیندہ اڈیشن میں اضافہ و تصحیح ہو سکے۔

آمد نامہ[1] کے اتحاد نام سے جو مجھے دھوکا ہوا تھا اس کا علم مجھے اشاعت سے پہلے ہو چکا تھا۔ چناں چہ غلط نامہ میں تصحیح کر دی گئی ہے۔ باقی معلومات بھی میرے لیے بہت نفع بخش اور بصیرت افزا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس زحمت کشی کی جزائے خیر دیں۔

آپ کے خط کے عنوان سے مجھے مزید خوشی ہوئی۔ ایک تو شمس العلوم[2]

---

[1] فارسی کی درسی کتاب (ایوب قادری)

[2] بدایوں کی مشہور اسلامی درس گاہ (ایوب قادری)

بدایوں کا تعلق جس نے مجھے مرحوم حبیب و محب مولانا عبدالماجد بدایونی کی یاد دلادی۔

ع اے گل، بتو خورسندم تو بوئی کسے داری

دوسری خوشی اس سے ہوئی کہ آپ کو بھی خطۂ بہار سے نسبت ہے۔

اے بہار اے مدفن ابرار و اخیارِ زمیں

امید ہے کہ کبھی کبھی آپ اپنے فیضِ رقم سے مستفید فرماتے رہیں گے۔ آپ کا خط معارف میں بھیج رہا ہوں۔ والسلام

سید سلیمان
۵ رشعبان ۱۳۶۷ھ[1]

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

(۱۸۲)

کراچی
مکرم! السلام علیکم

عنایت نامہ کا شکریہ، آپ نے جو دریافت فرمایا ہے اس کے جواب میں حقیقتِ حال عرض کی جا سکتی ہے، مگر چوں کہ اڈیٹر "الہلال" کے جدید ناآشنا و ناشناس مداحین نے اس کو فتنہ زائی کا سامان بنا لیا ہے اور آپ کے علی گڑھ ہی سے ایک فتنہ ابھی اٹھ چکا ہے اس لیے متامل ہوں کہ میری اس تحریر کو بھی فتنے کا نیا سامان نہ بنا لیا جائے۔ لیکن چوں کہ آپ نے متانت اور سنجیدگی سے ایک بات پوچھی ہے اس لیے یہ چند سطریں حوالۂ قلم ہیں۔

اس عہد کے نوجوانوں کو شاید یہ معلوم نہ ہوگا کہ مولانا ابوالکلام اور مولانا شبلی اور ان کے متعلقین کے درمیان محبت اور تعاون کے کیسے تعلقات تھے، جو ہمیشہ قائم رہے نواب صدر یار جنگ سے بھی موصوف کو جو تعلق اور شناسائی حاصل ہوئی وہ بھی اسی آستانے کا فیض تھا۔ اب جو شخص اپنے طرزِ عمل سے اس سے اعراض برتتا ہے وہ حقیقت میں احسان فراموش ہے۔ زندوں کی مدح سے مردوں کا مرثیہ زیادہ مشکل ہے، کیوں کہ مردے سے کسی صلے کی امید نہیں ہو سکتی۔

---

[1] مطابق ۱۲ رجون ۱۹۴۸ء

بہر حال مولانا ابوالکلام نے جب "الہلال" نکالا تو ایک ہی دو اشاعتوں کے بعد اُن کو اپنے لیے مددگار کی ضرورت پیش آئی۔ مولانا شبلی کو انھوں نے لکھا مولانا نے مجھ سے مشورہ پوچھا۔ میں نے ایک "تازہ ندوی" خواجہ عبدالواحد صاحب ندوی کا نام پیش کیا جو انگریزی بھی جانتے تھے۔ چناں چہ وہ بھیجے گئے اور شروع سے آخر تک وہ "الہلال" میں رہے انگریزی و عربی کے تراجم سب "الہلال" میں انھوں نے قلم کیے ہیں۔ خواجہ صاحب اب بھی موجود ہیں اور اب وہ بحمد اللہ ایم اے ہیں اور کانپور میں مشن کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہیں۔ وہ سب حقیقت حال سے واقف ہیں۔

اُس زمانے میں "الہلال" ایک سیاسی بین الاسلامی تحریک سمجھی جاتی تھی اور مجھے حضرت الاستاذ مرحوم کی تربیت و صحبت میں اس سے دلچسپی تھی اس لیے مولانا ابوالکلام کے کہنے سے میں مولانا شبلی صاحب کے پاس سے مولانا ابوالکلام کے پاس "الہلال" چلا آیا۔ اس کا ذکر آپ کو مکاتیب شبلی میں ملے گا۔

بہر حال چار پانچ ماہ اُن کے ساتھ رہا۔ میرے ساتھ میرے دوست اور "الندوہ" اور "البیان" اور "وکیل" کے سابق اڈیٹر مولانا عبداللہ عمادی بھی "الہلال" میں آگئے، وہ بھی چند ماہ رہے، ہم لوگ کوشش کرتے تھے کہ تحریریں ابوالکلام صاحب کے طرزِ تحریر کی اتباع کریں اس لیے "الہلال" میں جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ اسی رنگ میں لکھا جاتا تھا۔ میرے اور عمادی صاحب کے چلے جانے کے بعد مولانا عبدالسلام صاحب ندوی جو اب دار المصنفین کے مشہور مصنف ہیں "الہلال" میں گئے اور آخیر تک رہے۔

اب ظاہر ہے کہ ہم لوگ جو لوگ جو وہاں شریک تحریر و ادارت تھے کچھ نہ کچھ ہر ہفتے لکھا ہی کرتے تھے اور جو لکھا جاتا تھا وہ چھپتا بھی ہوگا، ورنہ بغیر کام کیے کون تنخواہ دے سکتا تھا، لیکن یہ ضرور ہے ہماری تحریروں میں اڈیٹر صاحب کچھ اضافہ اور کچھ کمی کرتے رہتے تھے، اور اس لیے ایسی تحریروں کو نہ ہم اپنی پوری کہہ سکتے ہیں اور نہ اڈیٹر صاحب اپنی کہہ سکتے ہیں۔

اسی درمیان میں مسجد کانپور کے واقعے کے زمانے میں اڈیٹر صاحب کسی مصلحت سے مہینے دو مہینے کے لیے مسوری تشریف لے گئے اُن کی غیر حاضری میں میری اور عمادی صاحب کی تحریریں اُن کے "نوٹ" کے بغیر شائع ہوئیں، ان تحریروں میں "مشہد اکبر"،

"تذکارِ نزولِ قرآن" "قصصِ بنی اسرائیل" وغیرہ مضامین میرے ہیں اور اب اس وقت نہ "الہلال" سامنے ہے اور نہ "مجموعۂ مضامین ابوالکلام"، مگر جہاں تک یاد آتا ہے حریتِ اسلام کے سلسلے میں اسلام کے نظامِ سیاسی کا مضمون میں نے لکھا تھا جو اس سے پہلے "الندوہ" میں "اسلام اور اشتراکیت" کے عنوان سے چھپ چکا تھا۔ اُس کو دوبارہ "الہلال" کے رنگ میں لکھا۔ مولانا نے اس میں انقلابِ فرانس وغیرہ کے مسائل کا اضافہ فرمایا ہے۔ اسی طرح دوسرا مضمون "تاریخ حبش کے چند گمشدہ اوراق" میرا مضمون ہے جو مقریزی کے رسالے کی تلخیص ہے، اس میں بھی مولانا نے کچھ دخل در معقولات کر کے شائع کیا۔ اسی طرح "کشفِ ساق" "اسوۂ نوحی" اور "اسوۂ ابراہیمی" وغیرہ مضامین عمادی صاحب کے ہیں۔ "الحرب فی القرآن یا فی الاسلام" کا مضمون عبدالسلام صاحب کا ہے۔ "انسانیت موت کے دروازے پر" غالباً عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی کا مضمون ہے مگر ناشرین نے ان سب کو ابوالکلام صاحب کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں ابوالکلام کا قصور خاموشی کے سوا کچھ دوسرا نہیں ہے ظاہر ہے کہ وہ اپنی شہرت کے لیے ہمارے قلم کے محتاج نہیں ہیں اور ہم لوگ بھی اُن کے محتاج نہیں، مگر واقعہ ہے۔ والسّلام

سید سلیمان ندوی

۲۸ر جون ۱۹۵۲ء

(۱۹۳)

شمیم صاحب کے والد کے انتقال کے بعد وراثت کی شرعی تقسیم میں کوئی قانونی پیچیدگی سامنے آئی تھی۔ اس سلسلے میں شمیم صاحب نے سید صاحب مرحوم سے رجوع کیا تھا۔ سید صاحب کے جواب سے ان کی الجھن دور ہوئی یا نہیں، معلوم نہیں لیکن سید صاحب نے اس میں حقِ شرعی کی بابت جو نکتہ تحریر فرمایا کہ زمانہ گزرنے سے شرعاً حق باطل نہیں ہو جاتا ان کا دعویٰ ہر وقت کیا جا سکتا ہے، بہت اہم ہے۔ اور اس ایک جملے نے فیصلہ کر دیا کہ ۱۸۵۷ء میں جن لوگوں کو انگریزوں کی اعانت اور ملک کی آزادی کے برخلاف خدمات کے صلے میں جاگیریں دی گئی تھیں وہ ان حریت پرستوں کے شرعی ورثا کو لوٹائی جائیں گی جن سے ان کے جرم حق کوشی اور حریت نوازی کی بنا پر چھینی گئی تھیں۔ اسی طرح پنجاب کے جن جاگیرداروں نے اپنی بیٹیوں

کو وراثت میں ان کے حق شرعی سے کبھی محروم کر دیا تھا، اُن کی اولاد اور دیگر شرعی ورثا ماضی میں کی گئی حق تلفیوں کے تدارک کا مطالبہ کر سکیں گے۔ جمیعت علماے اسلام (پاکستان) اور جمیعت علماے ہند کے انقلابی سوچ رکھنے والے رہنما اسی انداز سے سوچتے ہیں۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کا اندازِ فکر اس سے قطعی مختلف ہے۔ ان کے نزدیک ماضی میں جو کچھ ہو گیا، سو ہو گیا، اب ان زمینداریوں کی حیثیت اسلامی ہے خواہ وہ ملک سے غداری کے صلے میں انگریز نے بخشی ہوں یا اپنی بیٹیوں کو ان کے حق شرعی سے محروم کر کے باقی رکھی گئی ہوں۔

پاکستان میں شریعت کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی اندازِ فکر ہے۔ مسئلے کے اس پہلو پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ بحث کی اس مقام پر گنجایش نہیں۔ حضرت سید صاحب کا خط ملاحظہ فرمایئے: (ا۔س۔ش)

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لاہور نیلا گنبد جامعہ اشرفیہ

مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط ملا۔ قانونِ وراثت شرعی کی جس کمی کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے، اس کا مقصد واضح نہیں فرمایا یعنی آپ کا مقصد یہ ہے کہ اس قانون کے اجرا سے پہلے جو حقوق غصب ہو چکے ہیں ان پر تمادی عارض نہ کی جائے اور پھر سے ان کا فیصلہ عدالتوں سے حسبِ قانون شرعی کرایا جائے، اگر یہ میرا سمجھنا صحیح ہے اور قانون مذکور میں یہ کمی ہے تو بے شبہ ممبران اسمبلی کے ذریعے اس قانون کی درستی کی کوشش کی جائے تاکہ حقداروں کو ان کا حق ملے۔ زمانہ گزرنے سے شرعاً حق باطل نہیں ہوتا ان کا دعویٰ ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔ والسلام

سید سلیمان ندوی

۲۰؍ اکتوبر ۱۹۵۲ء

مولانا عبدالباری ندوی:

مولانا عبدالباری مرحوم نے ندوہ میں حضرت سید صاحب سے پڑھا بھی تھا اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے رشتۂ بیعت و ارادت کے تعلق سے دونوں خواجہ تاش بھی تھے۔ سید صاحب انھیں اپنے بھائی کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ ان کے نام سید صاحب کے بہت قیمتی خطوط ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوئے۔ بعض خطوط کے اقتباسات، مولانا عبدالباری مرحوم نے سید صاحب پر اپنے مضمون مطبوعہ معارف سلیمان نمبر میں پیش کیے ہیں۔ یہاں بہ طورِ تبرک اس مضمون سے دو خط جو بہ ظاہر مکمل نظر آتے ہیں، پیش کیے جاتے ہیں

(۱۸۴)

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ زبیری صاحب نے حضرت، مولانا شبلی نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے اخلاق کا آئینہ ہے۔ میں نے ان کی کتابیں نہ پوری پڑھیں اور نہ ان کے جواب دینے کا کبھی ارادہ کیا۔ آپ اگر جواب لکھنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو روکتا نہیں تاہم میں اپنی طبیعت کی بنا پر زبیری صاحب کو اپنی موت آپ مرجانا زیادہ پسند کرتا ہوں، تاہم اگر آپ اس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہیں تو شام کو عصر و مغرب کے درمیان میرے غریب خانہ پر مل سکتے ہیں جو انڈیا ہائی کمشنر جہانگیر روڈ کے پاس چمن اسٹریٹ میں ہے مکان کا نام ڈار منزل ہے۔ دروازہ پر نام کا بورڈ لگا ہوا ہے۔

والسلام

سید سلیمان

کراچی۔ ۲۲، جولائی ۱۹۵۲ء

(۱۸۵)

برادرِ مکرم!

میری عمر اب ساٹھ سال کے قریب آگئی۔ میں دنیا کو نہ چھوڑوں، دنیا خود مجھے چھوڑ

رہی ہے۔ اب نہ دارالمصنّفین سے زیادہ دلچسپی ہے، نہ ندوہ سے اور نہ علمی مقالات وتصانیف سے۔ چوں کہ میری روزی قلم سے وابستہ ہے اور گھر میں اثاثہ بھی نہیں، اس لیے ناچار پڑا پھرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ ہمت دے کہ ترک تعلق کر سکوں۔ آپ بھی میرے لیے دعا فرمائیں۔

(۱۸۶)

برادرم!

صمیم قلب سے دعا کیجیے کہ دارالمصنّفین کی یہ چھوٹی سی برادری صراط مستقیم کو پاکر اس پر قائم رہے اور ہم لوگوں کی عمر بھر کی محنت ہمارے لیے وبال آخرت بننے کے بجائے باعثِ برکات وخیرات ہو[1]

بیگم سید محمد لیثق دیسنوی

(۱۸۷)

عزیزہ سلمہا اللہ تعالیٰ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مجھے تمھارے اس خط سے بہت خوشی ہوئی۔ میرے والد مرحوم کو تمھارے نانا سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ تمھارے تایا میرے والد سے مرید تھے اور وہ اُن کو شغل اپنے

---

[1] جیسا کہ مضمون اور اس خط کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے، "صراط مستقیم" سے مراد تصوف وطریقت کا وہ راستہ ہے جو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ سے قیام بیعت اور عزم تقلید کے بعد حضرت سید الطائفہ نوراللہ مرقدہ پر واضح ہوا تھا اور عمر بھر کی محنت جس کے وبال آخرت بننے کا خطرہ لاحق ہوگیا تھا، سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تالیف وتدوین اور علمی ودینی خدمت کے مشاغل روز وشب تھے۔

اس صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اور اس پر ثبات کے لیے سید صاحب اپنے رفقائے علمی ودینی اور دارالمصنفین کی "چھوٹی سی برادری" کو خدا ورسول کی باتیں سنانے اور کتاب وسنت کے مطالعے اور اس میں فکر وتدبر کے بجائے "حضرت" کی خانقاہِ طریقت کی باتیں سناتے تھے حضرت کی تصنیفات کی طرف متوجہ فرماتے تھے اور حضرت کی تصنیفات ہی کو باعثِ برکات وخیرات تصور فرماتے تھے

بڑے بھائی کے سمجھتے تھے۔

مرید ہونے کے لیے سب (سے) بڑی چیز یہی ہے کہ عقیدہ ہو کہ اُس کی باتوں اور مشوروں کا اثر ہو۔

بالفعل تم میری بتائی ہو کتابیں پڑھو۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی بہشتی زیور ذرا غور کی نظر سے پڑھو[ے] اور پھر اپنے حالات اور اعمال کا جائزہ لو کہ تم میں کیا کیا کمی ہے اور اس کو کیسے پورا کرو۔

غیر محرم سے پردے کا اپنے اور اپنی لڑکیوں کا خیال رکھو اور سب کو نماز کی تاکید کرو۔

ظہر کی نماز فرض کے بعد دو دو رکعت کر کے چار رکعت پڑھو۔

عصر کے فرض سے پہلے چار رکعت سنت پڑھو۔

مغرب کے بعد چھ رکعت، دو دو رکعات کر کے اوّابین کی نماز پڑھو۔

ہو سکے تو رات کو اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھو۔

عصر اور فجر کی نمازوں کے بعد ۳۳ دفعہ سبحان اللہ، ۳۳ دفعہ الحمد للہ اور ۳۴ دفعہ اللہ اکبر پڑھا کرو۔

تمہارے ذمے اگر قضا نمازیں یا قضا روزے باقی ہوں تو اُن کو ادا کرو۔

اگر زکوٰۃ ادا نہ کی ہو تو ہر سال کا حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرو۔ شادی کے وقت سے زیوروں کی زکوٰۃ کا حساب لگاؤ۔

ہفتے عشرے میں خط لکھ کر مزید باتیں دریافت کرنا اور لکھنا کہ تم نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ والسلام

عزیزی ڈاکٹر صاحب اور تمہارے بچوں کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔

سید سلیمان

[ے] حضرت سید صاحب کے قلم سے پڑھو کے بجائے کرو نکلا تھا

مولوی عبد الرحیم صاحب (حمایت نگر۔ حیدر آباد دکن)

(۱۸۹)

مکتوب الیہ نے مسئلہ "استعداد" کی تفصیل اور مولانا جامی کی ایک رباعی کی شرح دریافت فرمائی تھی۔

- مکرم و محترم ادام اللہ تعالیٰ فیوضکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ بخیریت ہوں۔

شوق مطالعہ کے ساتھ انشاء اللہ شوقِ عمل میں بھی کمی نہیں ہوتی ہوگی کہ اصل مقصود یہی ہے وھو ولیکم بما کنتم تعملون[1] یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت و قربت و ولایت صحتِ عقائد کے بعد عمل سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ مسائل اصل میں علمِ کلام کے ہیں، حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہی تحقیق ہے، مگر حضرات صوفیہ نے ان مسائل میں اپنا خیال بھی ظاہر فرمایا ہے۔ بہر حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اتباع میں اس فقیر ہیچمداں کو ان مسائل سے ازراہِ تصوف کوئی دلچسپی نہیں۔

حضرت والا (مولانا تھانویؒ) کے ارشاد کے معنی میرے خیال میں یہ ہیں:

"استعداد" دو معنی میں بولا جاتا ہے، ایک بمعنی قابلیت اور دوئم بمعنی امکان ذاتی۔ اوّل معنی کی بناء پر استعداد مجعول ہے اور ثانی معنی کی بناء پر استعداد غیر مجعول ہے۔ یعنی استعداد بمعنی اول مجعول ہے کیوں کہ وہ وجودی چیز ہے اور استعداد بمعنی دوئم غیر مجعول ہے کیوں کہ وہ عدمی ہے اور عدمی غیر مجعول ہوتا ہے اور اس کے غیر مجعول ہوتے میں کوئی قباحت نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ افاضۂ نورِ ہدایت کے قبول کی یہ صلاحیت بندوں میں اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اور دی ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے جبر کے الزام کے رفع کے لیے بعض صاحبوں نے یہ راہ اختیار کی ہے کہ بندوں میں اچھے اور برے اور سعید و شقی ہونے کا بذاتہ امکان ہے اور امکان

---

[1] حضرت سید صاحب مرحوم نے اس مقام پر "وھو ولیکم بما کنتم تعملون" الفاظ درج فرمائے ہیں۔ اس پر الفاظ قرآن کا شبہ نہ ہونا چاہیے۔ قرآن کی آیت انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون (مائدۃ: ۵۵) ہے۔

ذاتی غیر مجعول ہوتا ہے اور قدیم، اس لیے اچھے اور بُرے ہونے اور سعید و شقی ہونے کا بندوں کے طبائع میں امکان اللہ تعالیٰ کے جعل سے نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ امکانِ ذاتی قدیم کے مقتضیٰ کے خلاف کر سکتا ہے اور نہ بدل سکتا ہے کیوں کہ قدیم تبدیلی سے پاک ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ پر جبر کا الزام نہیں آتا۔ حضرت مولاناؒ اس تاویل یا نظریے کو اس لیے نہیں مانتے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا مجبور ہونا لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امکان ذاتی قدیم کے خلاف کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔

مولانا جامیؒ کی رباعیات کی شرح مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایک رسالہ میں کی ہے وہ مجھے نہیں ملا، میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔

بندۂ ہیچمدان

سید سلیمان

شیخ وحید احمد بدایونی

(۱۸۹)

"مکتوب الیہ: شیخ وحید احمد، بدایوں کی نواحی بستی شیخوپور کے فریدی فاروقی خاندان کے معزز رکن تھے ان کی تعلیم علی گڑھ اور لندن میں ہوئی، تحریکِ خلافت میں عملی حصّہ لیا۔ وہ آزادیٔ ہند کے بعد یو۔ پی گورنمنٹ میں پارلیمنٹری سکریٹری (۱۹۴۷ء ۱۹۵۲ء) رہے، انھوں نے ۱۹۱۹ء میں ایک علمی و ادبی رسالہ "تعقیب" نکالا۔ تصوّف اور تاریخ پر ان کی قابلِ قدر تصانیف ہیں۔ ۱۱/ جنوری ۱۹۷۷ء کو وحید احمد کا انتقال ہوا۔"

(ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم)

مکرم السّلام علیکم

سفر نامہ ابنِ بطوطہ کے جس ترجمہ کی نسبت آپ نے دریافت کیا ہے۔ میں بھی اس کا طالب ہوں۔ کئی تاجروں کو لکھا، ولایت میں شعیب قریشی اور عبد الرحمان صدیقی نے مجھ سے مانگا تھا۔ ہمارے ہاں کتب خانہ میں نہیں اور نہ کسی کتب فروش کی فہرست میں،

نظر آتا ہے[1]

"نقیب" کے لیے آپ مجھ سے مضمون کی فرمائش کرتے ہیں۔ اے کاش! میں اس لائق ہوتا، نقیب کا جو نقطۂ خیال میں سمجھتا ہوں اس کے مطابق آپ یقین کیجیے کہ ایک سطر لکھنے سے بھی عاجز ہوں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں اس صنفِ ادبیات کی تحقیر کرتا ہوں بلکہ میں دل سے اس کا قدر داں ہوں اور "نقیب" کو ہر مہینے دل چسپی سے پڑھتا ہوں۔ نصیحت کا تلخ گھونٹ بآسانی انسان کے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ جب تک شوخی و ظرافت کی شکر میں اس کو ملفوف نہ کر لیجیے۔ مگر اس میں بعض لوگ اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ متانت اور سنجیدگی کا ذائقہ اس میں باقی نہیں رہتا لیکن "نقیب" نے جس اسلوب ادب کا تتبع کیا ہے وہ اعلیٰ سنجیدہ شوخی اور بہترین مہذب و متین ظرافت کی مثال ہے۔ اس کی ہنسی زیرِ لب مسکراہٹ سے آگے نہیں بڑھتی اور بیباک لاابالیوں کے قہقہہ کی آواز نہیں بن جاتی، اہل دل اس کو سمجھ کر متبسم ہو جاتے ہیں اور ناشناس اس کو نہ سمجھ کر مکدر نہیں ہونے پاتے۔

ہماری زبان میں یہ صنفِ کلام ابھی ناپید ہے، نظم میں لیجیے تو سوداؔ اور فغاںؔ کے مصحفیؔ و جراءتؔ کے ہزلیات ہیں۔ اور نثر جدید میں پنچ[2] کی جلدیں، مگر یہ زمین اصلاح و مرمت طلب ہے۔ سعدیؔ سے بڑھ کر ہمارے بوڑھے ادیبوں میں کون ہوگا لیکن پند نامۂ سعدیؔ[3] کے ساتھ ساتھ مطائباتِ سعدیؔ کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔

اردو میں جدید طرز پر لکھنؤ اور پٹنہ کے بعض انشا پردازوں نے داغ بیل ڈالی مگر وقت کی محفل نے ان کو داد دے دے کر تہذیب و متانت کی حد سے آگے بڑھا دیا۔ گو میں اندازِ عبارت میں ہیزم خشک ہوں کہ میرے اسلوبِ بیان کے لب پر کبھی مسکراہٹ ہی طاری نہیں ہوتی۔ لیکن یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی اہم سے اہم اور سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع نہیں جس پر "نقیب" کے طرزِ انشا کا قلم آسانی اور کامیابی کے ساتھ رواں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے بدایوں کے مصنف[4] "تجاہلِ عامیانہ" کو دار المصنفین کی طرح ایک "دار التجاہلین" قائم کرنا چاہیے ورنہ ڈر ہے کہ ان کے بعد یہ طرز ناپید نہ ہو جائے۔ سید محفوظ علی صاحب

---

[1] مترجم محمد حسین ہجر [2] اودھ پنچ لکھنؤ۔
[3] کریما [4] سید محفوظ علی بدایونی

جوش[1] صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب تین عناصر سے کوئی دنیا بنی ہے جو آج بنے گی پہلے تو چار عناصر تھے اور اب ستر بہتر ہیں۔ آپ اپنی دنیا کے لیے ان دونوں کے بیچ میں تو عناصر کی تعداد پیدا کیجیے۔

اسی کے ساتھ ہی میں یہ بھی صاف کہتا ہوں کہ آپ کے رسالے میں کبھی کبھی خشک سائنس اور بے نمک فلسفہ و عقلیات کے مسائل بھی زیر بحث آتے ہیں۔ میرے خیال میں "خشک و تر" اور "رطب و یابس" یکجا نہ جمع ہونے پائیں۔ ایسے مضامین دفتر معارف[2] میں بھیج دیا کیجیے جہاں "زاہدان تردامن و خشک خصال" رہتے ہیں۔ دعاگو

سید سلیمان

---

[1] سلطان حیدر جوش [2] معارف اعظم گڑھ۔

تذکرہ
مکتوب الیہم

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور کے مکتوب الیہم کے مختصر سوانحی اشارات

مؤلفہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

اثر صہبائی
احیدالدین نظامی، مولوی
اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
الطاف علی بریلوی، سید
تمکین کاظمی
حبیب الرحمن خاں شروانی، نواب صدر یار جنگ
حفیظ جالندھری
حیا، صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا
رئیس احمد جعفری، سید
ساغر نظامی
ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر
عبدالباری ندوی، مولانا
عبدالرزاق کان پوری، مولانا
عبدالعزیز میمن، مولانا علامہ
عبداللہ، ڈاکٹر سید
عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر
عبداللہ قریشی
عبدالوحید، خواجہ
عرشی، امتیاز علی خاں
علی حسن خاں، نواب
غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر
مالک رام
محمد ابراہیم، مولانا
محمد امین زبیری، مولوی
محمد عرفان، مولانا ابوالمعارف
محوی صدیقی لکھنوی
مہر، مولانا غلام رسول
نصیر الدین ہاشمی
نظامی بدایونی
وحید قیصر ندوی
ہمایوں مرزا

اثر صہبائی:

پورا نام خواجہ عبدالسمیع پال اور تخلص اثر صہبائی تھا۔ والد کا اسم گرامی خواجہ احمد پال تھا۔ پال کشمیری راجپوتوں کی ایک ذات ہے۔ اثر صہبائی ۲۷ دسمبر ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ کے امریکن مشن ہائی اسکول اور اسلامیہ ہائی اسکول میں حاصل کی اور یہیں سے ۱۹۱۸ء میں میٹرک پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۲ء میں بی اے پاس کیا، فلسفے میں آنرز کیا بعد ازاں گورنمنٹ لا کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۲۹ء میں فلسفے میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

مختلف مشاغل میں معروف رہنے کے بعد ۱۹۴۶ء میں جموں میں پبلک اسکیوٹر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد جموں کشمیر ہائی کورٹ میں اسسٹنٹ ایڈوکیٹ مقرر ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد سیالکوٹ لوٹ آئے اور سیالکوٹ میں پریکٹس شروع کی۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں اسسٹنٹ کسٹوڈین مقرر کیے گئے لیکن جون میں انھیں پبلک پراسیکیوٹر بنا دیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں اصغر حسین لودھیانوی نے "تذکرہ شعرائے اردو" شائع کیا تھا تو اس وقت وہ اسی عہدے پر فائز تھے۔

شاعری کا شوق گیارہ برس کی عمر میں پیدا ہو گیا تھا۔ تعلیم میں ترقی کے ساتھ مشق سخن جاری رہی اور عمدہ کہنے لگے۔ ان کے کلام کے مجموعوں میں جام صہبائی (رباعیات) خمستان (منتخب غزلیں اور نظمیں) جام طہور، راحت کدہ، روح صہبائی، جام رفعت وغیرہ چھپ چکے ہیں۔ اثر نے شعر کے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نظیر لودھیانوی نے لکھا ہے کہ ان کا ذوق سخن سلجھا ہوا، کلام کیف و سرور سے مملو اور زبان شگفتہ و اسلوب دل نشیں ہے۔

احیدالدین نظامی، مولوی:

مولوی احیدالدین نظامی۔ نامور باپ کے نامور بیٹے تھے۔ ان کے والد مولوی نظام الدین حسین نظامی اردو کے نامور ادیب صحافی اور کل ہند سطح کے قومی تعلیمی خدمت گزار تھے۔ ۱۸۹۴ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی درسی کتابیں پڑھنے کے بعد اسکول میں داخل کیے گئے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۹ء

میں لندن کے سٹی اینڈ گلڈ انسٹی ٹیوٹ سے لیتھوگرافی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

۱۹۲۰ء میں آرٹس اینڈ کرافٹس گورنمنٹ اسکول، لکھنؤ سے فائن آرٹ لیتھوگرافی اور پریس کے دفتری امور کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۴ء میں اسی اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے صوبہ متحدہ کی حکومت نے فن طباعت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا۔ جہاں انھوں نے لندن کاونٹی کونسل اسکول آف فوٹو انگریونگ اینڈ لیتھوگرافی میں فوٹو لیتھوگرافی فوٹو انگریونگ اور ہاف ٹون بلاک سازی کا کام عملی طور پر سیکھا۔ اس کے علاوہ انگلستان میں اس وقت کے مشہور ماہر فن طباعت مسٹر گڈ مین کے کارخانے میں رہ کر اس فن میں مزید مہارت بہم پہنچائی اور سند اعترافِ فن حاصل کی۔ لیکن اس فن میں ان کی مہارت کا سب سے بڑا اعتراف جو کئی اسناد پر بھاری تھا، یہ تھا کہ انھیں لندن کی مشہور "رائل سوسائٹی آف آرٹس" نے اپنا فیلو منتخب کر لیا۔

۱۹۲۵ء میں وہ لندن سے واپس ملک تشریف لائے تو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انھیں یونی ورسٹی پریس، علی گڑھ کا منیجر مقرر کیا۔ تقریباً ایک سال انھوں نے اس خدمت کو بہ حسن و خوبی انجام دیا۔ لیکن ان کے والد ماجد حضرت نظامی کے ذہن میں ان کا مستقبل کسی ملازمت سے وابستہ نہ تھا۔ انھوں نے نظامی پریس بدایوں کی ترقی کا ایک جامع منصوبہ بنایا اور پریس کے تمام کام قانونی طور پر ان کے ذمے کر دیے۔ اور خود پریس کے ہر قسم کے کام سے آزاد ہو گئے۔ اب ان کے سامنے ذوالقرنین کی ترقی، تصنیف و تالیف، تعلیم کا فروغ و اشاعت، اور ملک و قوم کی اصلاح و تعمیر اور قومی، ملی خدمات کے کام تھے۔

مولوی احید الدین کی مہارت فن، محنت اور توجہ سے تھوڑے ہی عرصے میں نظامی پریس ہندوستان کے اعلیٰ درجے کے پریسوں میں شمار کیا جانے لگا۔ انھوں نے لیتھو کی برقی مشینوں کے ذریعے نہ صرف اردو بلکہ انگریزی اور ہندی ٹائپ کی چھپائی کا اعلیٰ انتظام کیا۔

مولوی احید الدین صرف پریس اور طباعت کے کاموں ہی کے ماہر نہ تھے وہ اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق اور تصنیف و تالیف کا سلیقہ بھی رکھتے تھے۔ متعدد رسائل کی ادارت سے ان کا تعلق رہا اور [illegible] علمی و فنی تصانیف ان کی یادگار ہیں۔

مولانا طفیل احمد منگلوری کا ماہنامہ "سود مند" جو علی گڑھ سے شائع ہوتا تھا، بدایوں سے شائع ہونے لگا اور مولوی احید الدین اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ "زمیندار اور کسان" کے نام سے ایک ماہنامہ مولوی فصیح الدین فرشوری کی ہیڈیٹری میں بدایوں ہی سے شائع ہوتا تھا، وہ بھی مولوی احید الدین نظامی کی اسسٹنٹ ایڈیٹری میں نکلنا شروع ہوا۔ ایک ماہنامہ "شمیم ہند" کے نام سے شیخ عبدالروف تاجرِ عطر قنوج سے نکالتے تھے۔ یہ رسالہ فن عطر سازی اور خوشبویات میں پورے ملک میں اپنی نوعیت کا شاید واحد رسالہ تھا۔ مولوی احید الدین کو اس کا بھی اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ ہفت روزہ اخبار ذوالقرنین بدایوں جو ان کے والد ماجد کی ادارت میں سنہ ۱۹۰۳ء سے جاری تھا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی "ہندوستان چھوڑ دو" تجویز و تحریک کی حمایت کے جرم میں ضلعی حکام نے بند کر دیا اور پریس میں تالا لگا دیا اور مولوی نظامی مرحوم اپنے خیالات بدلنے اور تحریک کی حمایت ترک کرنے پر تیار نہ ہوئے تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ خاندان کی معیشت کے انتظام اور ہندوستان کے مختلف اداروں کے لاکھوں روپے کے پھنسے ہوئے کام کو نکالنے اور انھیں نقصان سے بچانے کے لیے ہفت روزہ ذوالقرنین بدایوں کی ادارت مولوی احید الدین کے نام منتقل کر دی جائے۔ مولوی احید الدین کے مدیر ہونے کے بعد اگرچہ ذوالقرنین نے اپنی حریت نوازی کی روش نہیں بدلی۔ لیکن انھوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ذوالقرنین کو اس کی تمام سابقہ روایات کے ساتھ آخر دم تک جاری رکھا۔

ان کی علمی و فنی تصانیف میں لیتھوگرافی اور رہنمائے لیتھوگرافی کے نام سے دو تصانیف یادگار ہیں۔ لیتھوگرافی اردو میں فن طباعت پر پہلی جامع کتاب تھی۔ ایک کتاب "ہندوستان میں فنِ مصوری" کے نام سے ہے۔ انھوں نے ایک کتاب بچوں کے لیے "حالاتِ انبیا" کے نام سے تحریر کی تھی۔ ذوالقرنین اور بعض دوسرے رسائل میں ان کے قلم سے متعدد مضامین بھی یادگار ہیں۔

مولوی احید الدین میں اپنے والد کا حق جانشینی ادا کرنے کی پوری قابلیت تھی، اور اس کے لیے انھوں نے بہترین کوشش بھی کی۔ قومی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ایثار وقت و مال میں بھی اپنے باپ کی روایت کو جاری رکھا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کورٹ، یوپی مسلم وقف بورڈ حج کمیٹی اور بدایوں ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر مقرر کیے گئے۔

حافظ صدیق اسلامیہ انٹر کالج بدایوں کے اور پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس یوپی کے سکریٹری رہے دیگر قومی سماجی خدمت کے کاموں میں حصہ لے کر اپنے عظیم باپ کی روایت کو زندہ رکھا۔

مولوی احید الدین نظامی نے ۷؍ فروری ۱۹۷۹ء کو بدایوں میں انتقال فرمایا اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، مولانا

مولانا اکبر شاہ خاں ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء میں قصبہ نجیب آباد، ضلع بجنور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ والد مرحوم کا نام نادر شاہ خاں تھا۔ پٹھانوں کے یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اکبر شاہ خاں کے بزرگ فنونِ سپہ گری میں شہرت رکھتے تھے لیکن ان کی شہرت کا باعث فنون علم و ادب ہوئے۔ وہ ایک عالم فاضل شخص تھے اور مورخِ اسلام کے لقب سے مشہور ہوئے۔

۱۹۰۶ء میں مولوی نور الدین کے زیر اثر آ گئے تھے اور قادیانی مذہب اختیار کر لیا تھا اور قادیان کو وطن بنا لیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں علم کے ساتھ فہم سلیم بھی عطا فرمایا تھا، اس مذہب کی حقیقت جلد ہی ان پر کھل گئی اور چند ہی سال کے اندر اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب کو دوبارہ ایمان کی روشنی سے منور کر دیا۔ وہ قادیانیت سے تائب ہو گئے اور قادیان کی سکونت ترک کر کے اپنے وطن مالوف نجیب آباد لوٹ گئے۔

۱۹۱۶ء میں نجیب آباد سے ماہنامہ عبرت نکالا۔ ۱۹۱۹ء میں اسے بند کر کے لاہور چلے گئے۔ جہاں وہ کئی سال تک دیال سنگھ کالج اور لوکل کیمبرج کالج میں فارسی کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا ظفر علی خاں خلافت تحریک اور ترک موالات کے سلسلے میں گرفتار ہو گئے تو کچھ مدت تک ہفت روزہ زمیندار کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اسی سال وہ نجیب آباد چلے آئے اور عبرت کو دوبارہ جاری کیا۔

۱۹۲۳ء میں شدھی اور سنگٹھن کا فتنہ برپا ہوا اور آگرہ کے علاقے میں ملکانہ راجپوتوں کے ارتداد کی خبر آئی تو مسلمان تڑپ اٹھے۔ اس موقع پر مولانا اکبر شاہ خاں نے بھی جمعیت علمائے ہند کے ایک تبلیغی وفد کے ساتھ اس علاقے کا دورہ کیا اور آریہ سماجیوں سے زبردست

مقابلہ کیا اور راجپوتوں میں تبلیغ و اصلاح کر کے اسلامی خدمت انجام دی۔

مولانا اکبر شاہ خاں ایک بلند پایہ مصنف اور مورخ تھے۔ تاریخ اسلام کئی جلدوں میں، مقدمۂ تاریخ ہند، نظام سلطنت اسلامی سپاہیانہ زندگی، مذہب اور تلوار معیار العلماء، قولِ حق، آئینہ حقیقت نما ان کی تصانیف ہیں۔ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ آخر میں شاعری سے شغف جاتا رہا تھا اور تاریخِ اسلام میں ان کا انہماک بہت بڑھ گیا تھا۔

۷/مئی ۱۹۳۸ء میں نجیب آباد میں ان کا انتقال ہو گیا۔

الطاف علی بریلوی، سید

سید الطاف علی بریلوی کے خاندان اور وطن مالوف کا اظہار ان کے نام سے ہوتا ہے میٹرک کے سرٹیفکیٹ کی رو سے ۱۰/جولائی ۱۹۰۵ء سید صاحب کی تاریخ پیدائش ہے لیکن بہ قول ان کے صحیح سال پیدائش ۱۹۰۷ء ہے۔ والد مرحوم کا اسم گرامی سید اسحاق علی اور جد ماجد کا اسم سامی سید اصغر علی تھا۔

سید صاحب نے ۱۹۲۵ء میں ایڈورڈ میموریل اسکول بریلی سے میٹرک پاس کیا اور ۱۹۲۹ء میں علی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

ابتداءً وہ مختلف سماجی، تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔ یکم جون ۱۹۳۵ء سے ان کی زندگی کا ایک خاص دور شروع ہوا جب انھوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر علی گڑھ میں کام شروع کیا۔ ۱۹۴۱ء میں انھوں نے ایک ادارہ "مجلس مصنفین" کے نام سے قائم کیا اور مصنف کے نام سے ایک سہ ماہی مجلے کا اجرا کیا۔ مصنف کے

ذریعے علمی، ادبی، تاریخی، تعلیمی خدمات انجام دیں۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ مجلس کی جانب سے کئی عمدہ کتابیں شائع ہوئیں۔

جون ۱۹۵۰ء میں سید صاحب ڈھاکہ کے راستے مغربی پاکستان آ گئے اور سندھ کے بعض مقامات میں کچھ عرصہ قیام کر کے کراچی آ گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

اس نئی زندگی کے دور میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور سرسید گرلز کالج کا قیام ادراِلعلم کا اجرا ان کے کارنامے ہیں۔ کانفرنس اور ادرالعلم کے ذریعے انھوں نے علمی، ادبی، تاریخی

تعلیمی میدانوں میں تصنیف و تالیف کی ایک مستقل تحریک پیدا کردی اور کالج کے ذریعے تعلیم کے فروغ میں انھوں نے اہم حصہ لیا۔ ۱۹۷۲ء میں کالج کو گورنمنٹ نے اپنی تحویل میں لے لیا تو سید صاحب یک سو ہوکر کانفرنس اور العلم کی ترقی میں لگ گئے۔

سید صاحب نے کانفرنس کی طرف سے علمی، ادبی، تاریخی، تعلیمی موضوعات پر بہت اہم تصانیف اور تراجم شائع کیے۔ وہ خود بھی صاحبِ قلم تھے۔ انھوں نے چھوٹی بڑی تقریباً دو درجن کتابیں لکھیں جن کے موضوعات تعلیم، تاریخ، سوانح، تحریکات تک پھیلے ہوئے ہیں۔

سید صاحب نہایت شریف، بیدار مغز اور جہاں دیدہ شخص تھے۔ وہ ہمیشہ مقصد سامنے رکھ کر اور منزل کو متعین کرکے سفر شروع کرتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔

۲۴ر ستمبر ۱۹۸۶ء کو کراچی میں انھوں نے انتقال کیا اور سخی حسن کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

تمکین کاظمی:

سید مصباح الدین نام، ابوالرضا کنیت اور تمکین تخلص تھا۔ دکن کے مشہور شاعر اور عالم ابوالعلیٰ سید منتخب الدین تجلی کے بیٹے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر اپنی والدہ سے پائی پھر حیدرآباد کے متعدد تعلیمی اداروں میں تحصیل علم کی۔ ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

محکمہ کوتوالی، کروڑگیری، مال میں کام کیا پھر دفتر دیوانی و مالی و ملکی وغیرہ میں خدمات انجام دیں۔ ایک مدت تک رہبرِ دکن، صبحِ دکن، رعیت، نظام گزٹ وغیرہ کی ادارت سے وابستہ رہے۔

ادبی ذوق ورثے میں ملا تھا، ذاتی شوق نے مہیز لگائی، وہ اپنے وقت کے عمدہ شاعر بھی تھے اور ادیب و مصنف بھی۔ غنچۂ تبسم، تذکرۂ ریختی، مقدمہ فریاد داغ، کے علاوہ مومن، داغ وغیرہ پر تصانیف، آسکر وائلڈ کے دو ڈراموں کے ترجمے، وغیرہ متعدد کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

حیدرآباد دکن میں انتقال ہوا۔

حبیب الرحمن خاں شروانی، نواب صدر یار جنگ:

حبیب الرحمن خاں شروانی ۵ جنوری ۱۸۶۷ء کو بھیکم پور (ضلع علی گڑھ۔ یوپی) میں پیدا ہوئے۔ والد مرحوم کا اسم گرامی محمد تقی خاں شروانی (ف ۱۹۰۵ء) تھا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ نویں صدی ہجری کے شروع میں ہندوستان آئے تھے۔

نواب صاحب مرحوم کے والد گرامی ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور دین دار بزرگ تھے۔ لیکن نواب صاحب مرحوم کی تعلیم و تربیت ان کے چچا محمد عبدالشکور خاں شروانی (ف ۱۹۰۷ء) کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ عبدالشکور خاں مرحوم عربی کے عالم، امورِ ریاست کے ماہر اور مذہب کے بہت پابند تھے۔

نواب صاحب مرحوم نے ملک کے اکابر علما و فضلا سے عربی، فارسی اور علوم دینیہ کی تحصیل کی تھی اور بہ قدرِ ضرورت انگریزی زبان کی استعداد بھی بہم پہنچائی تھی۔

نواب صاحب کے علم و فضل اور علمی و ادبی ذوق کا شہرہ پھیلا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد نے شعبۂ دینیات کی صدارت کی پیش کش کی جسے انھوں نے قبول فرمالیا۔ جون ۱۹۱۸ء میں وہ حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے اور امورِ مذہبی کے صدر الصدور کی حیثیت سے خدمات انجام دینی شروع کیں۔ ۱۹۱۹ء میں جامعۂ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو پہلے شیخ الجامعہ کا اعزاز انھیں حاصل ہوا۔ حیدرآباد میں نواب صاحب نے تقریباً بارہ برس تک عظیم الشان مذہبی، تعلیمی، علمی خدمات انجام دیں۔ اپریل ۱۹۳۰ء میں وہ سبک دوش ہوئے۔ ریاست نے ان کے علمی مقام اور حسنِ خدمات کے اعتراف میں انھیں "صدر یار جنگ" کے خطاب سے نوازا تھا۔

حضرت نواب صاحب علم و فضل کی بے شمار صلاحیتوں کے حامل، ذہن و فکر کے محاسن سے آراستہ، اعلیٰ دماغی اور بلند نظری کے صفات سے متصف اور اخلاق و سیرت کے محامد کا مجموعہ تھے۔ اس کے ساتھ ان میں ایک اعلیٰ مدبر اور منتظم کے اوصاف بھی موجود تھے۔

نواب صاحب مرحوم ایک بلند پایہ مصنف اور اردو فارسی کے اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے۔ اردو میں امیر مینائی سے اور فارسی میں آغا سنجر ایرانی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ تخلص حسرت تھا۔ کاروانِ حسرت اور بوستانِ حسرت کے نام سے ان کے اردو

اور فارسی کلام کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ تصانیف سیرۃ الصدیق رضہ تذکرہ با برو حالات حزیں، علمائے سلف وغیرہ یادگار ہیں۔

حضرت نواب صاحب علیہ الرحمہ نے ۱۱ر اگست ۱۹۵۰ء کو علی گڑھ میں انتقال فرمایا۔ ان کی موت فرد واحد کی موت نہ تھی بلکہ آپ کی وفات سے امارت کے بہترین اوصاف، علم و اخلاق کے فضائل اور تہذیب اور مشرقی روایات کے ایک پورے عہد کا خاتمہ ہو گیا۔

حفیظ جالندھری:

حفیظ الدین نام اور حفیظ تخلص تھا۔ جنوری ۱۹۰۰ء میں مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مسجد کے مکتب میں حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے جالندھر کے ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ تعلیم کا سلسلہ ہائی اسکول سے آگے نہیں بڑھ سکا البتہ شاعری میں انھوں نے کمال حاصل کیا۔ شاعری میں انھیں مولانا گرامی سے تلمذ حاصل تھا۔ ہلکی پھلکی نظمیں اور گیت لکھنے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ ان کی شہرت شاہنامۂ اسلام سے ہوئی۔ شاہنامہ چار جلدوں میں تاریخ اسلام کے ابتدائی ایام کے اہم واقعات کی منظوم تاریخ ہے۔ ان کی شہرت کا دوسرا سبب پاکستان کے قومی ترانے کی تخلیق بنا۔

مخزن لاہور کا دور ثانی دہلی سے شروع ہوا تو اس کے ایڈیٹر حفیظ جالندھری تھے۔ انگریزی حکومت نے انھیں "خان صاحب" اور "خان بہادر" کا خطاب دیا۔ قوم نے انھیں ابوالاثر کے خطاب سے نوازا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں بھرتی کے محکمے میں ڈائرکٹر رہے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد حکومت نے دیہی امداد کے محکمے کا ڈائرکٹر بنا دیا تھا۔ اس محکمے کے ختم ہو جانے کے بعد محکمہ قومی تعمیر نو کے مشیر مقرر کر دیے گئے اور جب تک یہ محکمہ قائم رہا وہ مشیر رہے۔ لیکن یہ حکومت کی جانب سے ان کی محض سرپرستی تھی۔ حکومت پاکستان نے ان کا ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

۲۱ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

حیا، صغرا بیگم ہمایوں مرزا:

صغرا بیگم نام اور حیا تخلص تھا۔ دکن کی مشہور ادیبہ، خطیبہ، شاعرہ اور قومی خدمت گذار تھیں۔ والد گرامی کا نام ڈاکٹر صفدر علی مرزا تھا اور مشہور قانون داں ہمایوں مرزا سے رشتۂ زوجیت میں منسلک تھیں۔

۱۸۸۴ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی اور صرف گھر پر۔ شاعری کا شوق تھا اور حضرت جلیل سے مشورۂ سخن کرتی تھیں۔ ان کی ایک غزل پر علامہ اقبال نے بھی اصلاح دی تھی۔ لیکن ان کی زیادہ توجہ نثر کی طرف تھی۔ ۱۹۱۵ء میں "النساء" کے نام سے ایک ماہنامہ حیدرآباد دکن سے جاری کیا تھا جو ایک مدت تک جاری رہا تھا۔ کچھ مدت تک ماہنامہ زیب النساء، لاہور کی ادارت بھی فرمائی تھی۔

۱۹۴۴ء میں جب نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے "حیدرآباد کی نسوانی دنیا" تالیف کی تھی تو انھوں نے لکھا تھا "کئی سال سے رسالہ زیب النساء آپ کی ایڈیٹری میں لاہور سے شائع ہوتا ہے۔" ان کی چودہ پندرہ کتابیں تو ۱۹۴۴ء تک شائع ہو چکی تھیں۔ تصنیف و تالیف و اشاعت کا سلسلہ بعد تک جاری رہا۔ ان میں ان کے ملک اور بیرون ملک کے متعدد سفر نامے، ناول، مختصر افسانے اور سوانحی و اصلاحی کتابیں شامل ہیں۔ اصلاحی، معاشرتی مضامین کا مجموعہ "مقالات صغریٰ" کے نام سے یادگار ہے۔

قومی کاموں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ اپنے والد ماجد کی یاد میں مدرسہ صفدریہ قائم کیا، جس میں لڑکیوں کو عام تعلیم کے علاوہ صنعت و حرفت اور گھریلو دست کاری کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مدرسے کے اخراجات کے لیے اپنی جائیداد کا ایک حصہ وقف کر دیا تھا۔ وہ نہایت کشادہ دست اور مخیر خاتون تھیں۔ ان کا شمار حیدرآباد کی ممتاز خواتین میں ہوتا تھا۔

تمکین عابدی نے "سخنورانِ دکن" میں، مولانا امداد صابری نے "تاریخِ صحافتِ اردو جلد پنجم" میں، سید محی الدین قادری زورؔ نے "داستانِ ادبِ حیدرآباد" میں ان کی ادبی، علمی، صحافتی خدمات کا تذکرہ کیا ہے۔ سب سے زیادہ مفصل اور مستند تذکرہ نصیر الدین ہاشمی نے "حیدرآباد کی نسوانی دنیا" میں کیا ہے۔ تمکین عابدی اور امداد صابری نے ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔

۱۹۵۹ء میں حیدرآباد دکن میں انتقال ہوا۔

رئیس احمد جعفری سید:

اردو کے مایہ ناز ادیب، صحافی، مصنف، سید رئیس احمد جعفری سیتاپور (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ لیکن ان کی پیدائش ۱۹۱۲ء میں لکھیم پور (یوپی) میں ہوئی۔ ان کی والدہ اثیا بیگم ریاض خیرآبادی کے حقیقی بھائی نیاز احمد کی بیٹی تھیں۔ جعفری صاحب کے والد سید ناظر حسین کا انتقال جعفری صاحب کے بچپن میں ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کی پرورش اور تعلیم کا ابتدائی زمانہ خیرآباد میں حضرت ریاض کی سرپرستی میں گزرا۔

جعفری صاحب کی مزید تعلیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ہوئی۔ لکھنے کا شوق تعلیمی زندگی ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ "حیات محمد علی" ان کی پہلی تصنیف ہے، جس نے انھیں علمی و ادبی دنیا میں روشناس کرایا۔ ۱۹۳۴ء میں "خلافت" بمبئی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مولانا شوکت علی کے انتقال کے بعد روزنامہ "ہندوستان" بمبئی سے جاری کیا۔ پھر انقلاب بمبئی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ لیگی ذہن کے صحافی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء کے شروع میں پاکستان آ گئے۔

اولاً کراچی سے روزنامہ "خورشید" نکالا۔ لیکن جذباتی تنقیدی صحافت کا دور گزر چکا تھا۔ ضرورت تعمیری ذہن کی تھی اور جعفری صاحب کے لیے تعمیری ذہن بنانا ممکن نہ تھا۔ خورشید بند ہو گیا۔ ماہنامہ ریاض جاری کیا۔ علمی رسالہ تھا لیکن معاشرتی زندگی میں ابھی تک ٹھہراؤ نہ پیدا ہوا تھا اور جعفری صاحب کے پاس جن بزرگوں کے نام اور جن کی عقیدت کا سرمایہ تھا، اس کا خریدار بازار میں عنقا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے بمبئی میں تحریک پاکستان کا معرکہ سر کیا تھا یہاں ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا۔ نفسانفسی اور آپا دھاپی کا منظر تھا۔ حالات نے انھیں مایوس کیا، اب ملازمت کی ٹھانی اور لاہور چلے گئے۔ زمیندار نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہر دو فریق اپنے مفاد میں ایک دوسرے کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ جعفری صاحب الکان زمیندار سے اور وہ ان سے مایوس ہوئے۔ جعفری صاحب نے ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور میں ملازمت کر لی، زمیندار نے دوسرا ایڈیٹر تلاش کر لیا۔ ثقافت اسلامیہ میں جعفری صاحب ماہنامہ "ثقافت" کے ایڈیٹر تھے۔ ثقافت کا نام بدل کر المعارف کیا گیا۔ جعفری صاحب کے

جذبۂ صادق میں شک نہیں لیکن وہ علمی شخصیت نہ تھے ایک اچھے ادیب اور صحافی ہونے میں شبہ نہیں وہ المعارف کو معارف اعظم گڑھ کا مثیل نہ بنا سکے اور المعارف ایک دوسرے درجے کے ادبی ماہنامے سے بلند کبھی نہ ہو سکا۔

ملازمت کے ساتھ جعفری صاحب نے لاہور کے کئی پبلشرز کے لیے معاوضے پر ترجمہ اور تالیف کے کام کیے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ مولانا محمد علی کے نام پر اکیڈمی قائم کی۔ اس سے کئی عمدہ کام اشاعت پذیر ہوئے لیکن اکیڈمی چل نہ سکی۔

جعفری صاحب ایک بہت کامیاب اہل قلم تھے۔ انھوں نے علمی ادبی موضوعات پر کتابیں لکھیں، ناول اور افسانے تخلیق کیے، ترجمے کیے۔ تین سو سے زیادہ ان کی تصنیفات و تخلیقات یادگار ہیں

۲۷ ؍ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو لاہور میں اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔ کراچی میں تدفین عمل میں آئی۔

ساغر نظامی:

سردار محمد محمد یار خاں نام اور ساغر تخلص تھا، نظامی، خواجہ حسن نظامی سے بیعت کی نسبت سے ان کے نام کا جز بنا۔ والد مرحوم کا اسم گرامی سردار احمد یار خاں تھا۔ جو عربی فارسی، انگریزی زبانوں پر بھی قدرت رکھتے تھے۔

ساغر کا قدیم وطن باندہ (یو پی) تھا۔ ان کے والد کا مستقل قیام علی گڑھ میں رہتا تھا۔ ساغر ۲ ؍ دسمبر ۱۹۰۵ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی تعلیم کا آغاز گھر پر ہوا۔ بعدہٗ گورنمنٹ ہائی اسکول، علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔

ساغر مرحوم کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۲۳ء میں ماہنامہ پیمانہ آگرہ کی ادارت سے ہوا۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں انھوں نے ماہنامہ مستقبل، ہفتہ وار علی گڑھ پنچ، ہفتہ وار استقلال علی گڑھ، ماہنامہ ایشیا دہلی، صبوحی وغیرہ ادبی اور مزاحیہ اخبارات و رسائل کی ادارت کی۔

ساغر نظامی ایک بلند پایہ ادیب افسانہ نگار اور صحافی کے علاوہ بہت بڑے شاعر بھی تھے، سیماب اکبر آبادی سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ اور نظم، غزل، رباعی میں انھوں

نے ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی بہت بلند مقام حاصل کرلیا تھا۔ آزادی کے بعد تو وہ ہندوستان کے صفِ اول کے چند شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔

قومی خدمت کے میدان میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ نیشنلسٹ خیال کے مالک تھے جواہر لال نہرو سے تعلقات تھے۔ انھی کی خواہش پر آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جہاں انھوں نے ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۴ء تک خدمات انجام دیں۔

حکومت ہند نے ان کی قومی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں "پدم بھوشن" کے اعزاز سے نوازا تھا۔ قومی علمی اداروں سے بھی انھیں کئی اعزازات سے نوازا گیا تھا۔

تاریخ، ادب، شاعری وغیرہ میں ان کی ایک درجن سے زیادہ تصنیفات و تخلیقات یادگار ہیں جن میں شبابیات (۱۹۲۵ء)، تہذیب کی سرگزشت (۱۹۲۷ء)، صبوحی (۱۹۳۲ء)، مشائخ مارہرہ (۱۹۳۳ء)، کہکشاں (۱۹۳۴ء)، بادہ مشرق (۱۹۳۵ء)، رنگ محل (۱۹۴۳ء)، موج و ساحل (۱۹۴۸ء)، مشعل آزادی (۱۹۵۷ء) بہت مشہور ہیں۔

دہلی میں مستقل سکونت تھی۔ وہیں ۲۷ر فروری ۱۹۸۳ء کو انتقال ہوا۔

ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ۱۰ر جولائی ۱۹۲۹ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نامور اور معزز استاد تھے۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی تعلیم کے بیشتر مراحل علی گڑھ میں طے ہوئے۔ یہیں سے ۱۹۵۲ء میں اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی بعد میں فارسی میں بھی ایم اے کرلیا اور "مومن — فن اور شخصیت" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۵۳ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں اردو لیکچرارشپ سے عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ جگہ عارضی تھی۔ بعد میں سینٹ اسٹیفنس کالج میں اور دہلی کالج میں خدمات تدریس انجام دیں۔ ۱۹۶۱ء میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئے۔ شعبے کے صدر بھی رہے اور پروفیسر کے عہدے تک ترقی کی اور ایک مدت تک استاد اور محقق و مصنف کی حیثیت سے زبان و ادب کی بہترین خدمات انجام دے کر ریٹائر ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب ڈیڑھ درجن سے زیادہ علمی، ادبی، تحقیقی کتابوں کے مصنف اور بہت سے علمی ادبی اور تعلیمی اداروں کے رکن ہیں۔ دہلی میں قیام ہے۔ وہ اپنی ذات سے نہایت شریف اور نیک طینت شخص ہیں۔

عبدالباری ندوی، مولانا:

برصغیر پاک و ہند کے مشہور مصنّف، اہل قلم اور نامور ندوی مولانا عبدالباری ۴ ذوالحجہ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۸۸۹ء کو "دکرسی" ضلع بارہ بنکی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم عبدالخالق ایک دین دار بزرگ تھے۔

مولانا نے ابتدائی بارہ بنکی میں حاصل کی پھر ندوۃ العلماء، لکھنؤ آ گئے۔ وہ مولانا علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جس کی مولانا شبلی نے خاص طور پر علمی تربیت فرمائی تھی۔

وہ ایک عرصے تک دارالمصنفین اعظم گڑھ کے شعبۂ تالیف و تصنیف میں خدمات انجام دیتے رہے۔ غالباً ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے، اور جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے، فلسفہ، اخلاق و تصوف، تعلیم وغیرہ میں آپ کی نہایت مفید اور بلند پایہ تصانیف اور تراجم یادگار ہیں۔

مولانا عبدالباری صاحب شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی سے بیعت تھے لیکن ان کی تربیت حضرت مولانا اشرف علی تھانوئیؒ نے فرمائی تھی۔

۳۰ جنوری ۱۹۷۶ء کو بروز جمعہ لکھنؤ میں جہاں ان کا مستقل قیام تھا، انتقال فرمایا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ڈالی گنج (لکھنؤ) کے قدیم قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

عبدالرزاق کان پوری، مولانا

مولانا عبدالرزاق کانپوری اکتوبر ۱۸۷۴ء میں سیالکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی الٰہی بخش اپنے وقت کے مشہور منجم اور رمال تھے۔ آباؤ اجداد فرخ آباد (یوپی) کے رہنے والے تھے، لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے والد نے ترک سکونت کر کے کان پور کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔

مولانا کان پوری نے اردو کی ابتدائی تعلیم پور میسوہ (ضلع آگرہ۔ یوپی) میں پائی۔

نظامیہ کی تحصیل مدرسہ عام فیض عام (کان پور) کے مشہور مدرس مولانا احمد حسن معقولی اور مدرسہ مسجد رنگیاں سے کی اور حدیث کا کچھ حصہ مولانا محمد علی مرحوم ناظم اول دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے ان کے قیام کان پور کے زمانے میں پڑھا۔

۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۶ء تک کلکٹری کان پور میں ملازم رہے۔ اکتوبر ۱۸۹۶ء میں میونسپل بورڈ میں سررشتہ دار ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۰۷ء میں ملازمت چھوڑ کر بھوپال چلے گئے اور تحصیل دار مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں تاریخ اسلام کے منتظم کے عہدے پر تقرر عمل میں آیا۔

البرامکہ، نظام الملک طوسی، تاریخ مآثر جلالی، تاریخ اسلام، عہد جاہلیت عرب، عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ آپ کی تصانیف ہیں، مولانا کان پوری اس دور کے مشہور محقق اور تاریخ دان تھے۔

۱۸ فروری ۱۹۳۸ء کو آپ کا انتقال ہوا۔

عبد العزیز میمن، مولانا علامہ:

میمن قوم نے تجارت کے میدان میں جو امتیاز حاصل کیا ہے وہ ملکی تاریخ کا ایک معلوم واقعہ ہے لیکن اسی قوم کے فرد عبد العزیز نے علم کے میدان میں مشرق سے مغرب تک جو عزت اور شہرت حاصل کی وہ پوری اسلامی اور عرب دنیا کا سرمایۂ فخر ہے۔

مولانا عبد العزیز میمن کے والد مکرم کا اسم گرامی عبد الکریم بن یعقوب بن ربانی تھا۔ وہ اکتوبر ۱۸۱۹ء میں بہ مقام گونڈل ضلع راجن کوٹ (مہاراشٹر۔ بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں دہلی چلے گئے۔ ان کے اساتذہ میں ڈپٹی نذیر احمد، محمد بشیر سہسوانی، شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی، مولانا عبد الرحمان شمس العلماء مولانا احمد حسن محدث امروہوی وغیرہ وقت کے مشہور محدث، علمائے دین اور اردو اور عربی کے نامور ادیبوں کے نام آتے ہیں۔

ایڈورڈ کالج، پشاور میں استاد عربی کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ مختلف اوقات میں اورینٹل کالج۔ لاہور، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی۔ علی گڑھ، کراچی یونی ورسٹی۔ کراچی میں خدمات تدریس انجام دیں۔

مولانا عبدالعزیز میمن ۱۹۵۱ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی سے ریٹائر ہوئے تھے بعد ۱۹۵۴ء میں پاکستان تشریف لے آئے تھے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۸ء تک کراچی یونی ورسٹی میں شعبۂ عربی کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد پنجاب یونی ورسٹی میں کچھ عرصہ عربی کے پروفیسر رہے۔

مولانا میمن مرحوم عربی زبان و ادب اور لسانیات میں بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے جو عربی مخطوطات ایڈٹ کیے، شروح لکھے یا کتابیں تصنیف کیں ان کی تعداد ایک درجن کے قریب ہے۔

عربی ممالک میں ان کے علمی کاموں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مجمع اللغۃ العربیہ، شام کے ممبر تھے، دمشق یونی ورسٹی میں انھیں توسیعی لیکچرز کے لیے بلایا گیا تھا۔ جامعۂ عباسیہ، بہاول پور میں بھی انھوں نے توسیعی لیکچرز دیے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں جہاں سوسائٹی عربی زبان و ادب اور تحقیق و لسانیات کے ذوق سے رفتہ رفتہ ناآشنا ہوتی جا رہی اور علمی انحطاط و زوال کے دور سے گزر رہی ہے، ان کی واقعی قدر و منزلت نہ ہو سکی۔

قدیم کتب اور مخطوطات کا انھیں بہت شوق تھا۔ نادر مخطوطات اور نہایت قیمتی اور کم یاب کتب کی ان کی ذاتی لائبریری تھی۔ ان کے علم و فضل اور علمی و تحقیقی خدمات کا اعتراف مشرق و مغرب کے اکابر نے کیا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے لکھا ہے کہ وہ اس عہد میں عربی زبان و ادب میں سند کا درجہ رکھنے والے اور تمام برِاعظم ہند و پاک کے لیے سرمایۂ فخر و نازش تھے“۔

مولانا میمن جس طرح علم و تحقیق میں اپنا منفرد مقام رکھتے تھے اسی طرح وہ کتاب و سنت کی عظمت کا بے میل عقیدہ رکھتے تھے اور سلف صالحین کے مسلک حقہ پر عامل تھے۔ وہ اپنے عقیدے میں کسی قسم کے میل اور طریقۂ سلف صالحین سے سرمو تجاوز کرنے کو گناہ سمجھتے تھے۔ عام لفظوں میں وہ جماعت اہل حدیث سے تعلق رکھتے تھے۔ درحقیقت وہ گروہی اور حزبی اختلافات سے بہت بلند شخصیت کے حامل اور اسلاف کرام کے لیے موجب فخر و نازش اور سعید و صالح خلف تھے۔

ان کے انداز میں ایک علمی غرور اور مزاج میں تمکنت ضرور تھی لیکن وہ نہایت شریف

اور سنجیدہ و متین بزرگ اور کریم ابن کریم تھے۔

مولانا یمین نے مستقل قیام کراچی میں اختیار کر لیا تھا، بہادر آباد میں اپنا مکان بنوالیا تھا۔ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۷۸ء کو یہیں انھوں نے انتقال فرمایا۔

عبداللہ، ڈاکٹر سید محمد:

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ منگلور، تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ میں ۱۵ر اپریل ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں اپنے والد مکرم حکیم سید نواحمد شاہ سے حاصل کی۔ مڈل مانسہرہ سے اور نویں جماعت ایبٹ آباد سے پاس کی تھیں ۱۹۲۰ء میں اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی دروازہ۔ لاہور) کی دسویں جماعت میں داخلہ لیا تھا لیکن تحریک ترک موالات میں حصہ لینے کی وجہ سے داخلہ نہ بھیجا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (علی گڑھ) چلے گئے۔ مارچ ۱۹۲۲ء میں وطن لوٹ آئے اور پنجاب یونی ورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد میٹرک، انٹر، بی اے کے امتحانات (صرف انگریزی) پاس کیے۔

۱۹۲۶ء میں پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں فہرست ساز کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۵ء میں اسلامیہ کالج، پشاور میں فارسی اور اردو کے استاد کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ ۱۹۳۸ء میں وہ دوبارہ لاہور آگئے۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۶۶ء میں ملازمت سے سبک دوش ہونے تک وہ اردو، فارسی، عربی کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ لیکچرار سے پروفیسر کے عہدے تک ترقی کی۔ شعبے میں ماتحت استاد سے لے کر ان شعبوں کی صدارت کے منصب تک پہنچے اور آخر میں یونی ورسٹی اورینٹل کالج، جس کے طالب علم بنے تھے اس کے پرنسپل ہو کر ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد یونی ورسٹی نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی چیرمین شپ کے لیے ان کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ وہ اپنی وفات تک اسی منصب پر قائم رہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اس عہد کے بہت بڑے ادیب، نقاد، محقق اور مصنف تھے۔ ادب، تنقید، سوانح، لسانیات، لغات، تعلیم، اقبالیات وغیرہ علوم و فنون میں تقریباً پچاس کتابیں اور سیکڑوں کی تعداد میں مقالات ان کی یادگار ہیں۔

ملک کے بیسیوں علمی، ادبی، تعلیمی اداروں سے ان کا زندگی بھر علمی، تعاون، تنظیم اور مشاورت کا تعلق رہا۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی (لاہور) کا قیام تو ان کی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

وہ اس کے جنرل سکریٹری بھی تھے۔ انھوں نے بیرونِ ملک اور اندرونِ ملک سیکڑوں علمی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی تھی اور بہت سے انعامات و اعزازات حاصل کیے تھے۔ حکومتِ پاکستان نے انھیں ہلالِ امتیاز سے اور حکومتِ ایران نے انھیں نشانِ سپاس سے سرفراز کیا تھا۔ انھوں نے ایک سرگرم اور بھرپور علمی و تعلیمی زندگی گزاری تھی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے "فارسی ادبیات میں ہندوؤں کا حصہ" کے موضوع ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا وجودِ گرامی ان اعزازوں اور ڈگریوں سے بہت بلند ہو گیا تھا۔ وہ ایک مثالی استاد اور علم و تحقیق کی علامت تھے۔ اردو کے فروغ و نفاذ کی مجسم تحریک تھے۔ ان کی اردو خدمات تاریخ زبان و ادب اردو میں کسی بھی محسن اردو سے ہرگز کم نہیں۔

علم اور مطالعے کی طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم کا اخلاق بھی بہت بلند تھا۔ تعلیم و تدریس اور تصنیف و تحقیق میں وہ ایک مثال، ایک مکمل تہذیبی اور مشرقی روایات کی حامل شخصیت تھے۔ اردو زبان کا یہ عاشق اور علم و ادب کا شیدائی جس کے عشق اور سوزِ قلب سے کوئی آشنا اور اردو کے لیے جہاد میں کوئی اس کا ہم مشرب اور ہم سفر نہ تھا، زمانے کی بے دلی سے گھبرا کر ۱۴ر اگست ۱۹۸۶ء کو اس دنیا سے آخرت کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی ان کے مراتب بلند فرمائے۔

عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر:

مشرق کے مایۂ ناز مصور عبدالرحمان چغتائی کے بھائی تھے۔ نومبر ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد معمار تھے۔ تعلیم کے مراحل لاہور میں طے ہوئے تھے۔ پیرس سے فنونِ اسلامی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔

لاہور میں اور لاہور سے باہر لدھیانہ، بمبئی، پونہ وغیرہ میں بہ سلسلۂ ملازمت ایک مدت بسر کی۔ بمبئی میں نو برس رہے تھے۔ اسلامی تاریخ و ثقافت پر ان کے کام کو سند کا درجہ حاصل ہے۔

۱۹ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

عبدالوحید، خواجہ:

خواجہ عبدالوحید مرحوم کا تعلق کشمیر کے ایک علمی خاندان سے تھا۔ وہ ۲۵ر جنوری ۱۹۰۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ جہاں دو پشت قبل ان کے خاندان کے بزرگ کشمیر

سے آکر آباد ہو گئے تھے۔ انھوں نے گورنمنٹ سنٹرل ماڈل اسکول اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ دینی تعلیم خصوصاً ترجمہ و تفسیر قرآن انھوں نے شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علیؒ لاہوری کی خدمت میں حاصل کی تھی۔

خواجہ صاحب کے والد خواجہ کریم بخش اور چچا خواجہ عبدالمجید کے علامہ اقبال اور اس وقت کے تمام اکابر اہل علم سے تعلقات تھے، حضرت علامہ سے تو رشتہ داری کا تعلق بھی تھا۔ خواجہ صاحب کا مکان ایک زمانے تک اصحاب علم و فضل کا مرکز بنا رہا تھا۔ خواجہ صاحب مرحوم کو شروع ہی سے ایک علمی و تہذیبی ماحول میسر آگیا تھا۔ اسی ماحول میں انھوں نے تعلیم کے مراحل طے کیے اور ان کے ذہن و فکر کا نشوونما ہوا۔ اسی ماحول نے ان کے علمی ذوق کو پروان چڑھایا اور اسے جلا بخشی۔ اٹھارہ بیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ان کی تحریرات اخبارات و رسائل میں شائع ہونے لگی تھیں۔

خواجہ صاحب نے عملی زندگی کا آغاز اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے دفتر میں ملازمت سے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ کراچی تشریف لے آئے تھے اور پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں وہ ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

خواجہ صاحب کا ملازمت کے دوران میں اور ملازمت کے بعد متعدد علمی، ادبی، تعلیمی، تاریخی، دینی اداروں سے تعلق رہا۔ وہ کسی کے بانی کسی کے رکن اور کسی کے عہدے دار کی حیثیت سے گوناگوں خدمات انجام دیتے رہے۔

صحافت سے ان کا خاص تعلق تھا۔ لاہور میں وہ انجمن خدام الدین کے انگریزی رسالے پندرہ روزہ اسلام کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور جون سنہ ۱۹۳۴ء سے مارچ سنہ ۱۹۴۰ء تک خدمات انجام دیں۔ کراچی میں انجمن اشاعت قرآن کے انگریزی رسالے پندرہ روزہ الاسلام کو پندرہ سال ایڈٹ کیا۔ ان دونوں رسالوں کے ذریعے خواجہ صاحب نے بہترین علمی و دینی خدمات انجام دیں۔ مختلف اردو اخبارات میں بھی وہ وقت کے علمی، تہذیبی، سماجی، دینی مسائل کے بارے میں لکھتے رہتے تھے۔

خواجہ صاحب کی اردو و انگریزی تصنیفات میں دو منزلیں ان نیشنل لائف، اسلامک بیک گراونڈ آف موڈرن سائنس اینڈ کلچر، اے ببلیوگرافی آف اقبال اور "موضوعات

قرآن اور انسانی زندگی" کے عنوان سے مفید کتب شائع ہو چکی ہیں۔ "تلاش سکوں" کے نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔

خواجہ صاحب مرحوم اخلاق کی بلندی، سیرت کی پختگی، دین داری، نیکی و پارسائی، مزاج کی شگفتگی، علمی ذوق، مطالعے کی وسعت اور ذہن و فکر اور عمل کی بہت سی خوبیوں سے متصف تھے۔ وہ ہماری قدیم مشرقی تہذیب اور مجلسی زندگی کی ایک یادگار شخصیت تھے۔

۲۷؍دسمبر ۱۹۷۹ء کو کراچی میں خواجہ صاحب نے انتقال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں مرحوم کے مراتب بلند فرمائے۔

عرشی، امتیاز علی خاں:

امتیاز علی خاں نام، عرشی تخلص اور رام پور وطن تھا، ۸؍دسمبر ۱۹۰۴ء مطابق ۱۹؍رمضان ۱۳۲۲ھ بہ روز پنج شنبہ رام پور کے محلہ ہجلوار میں پیدا ہوئے۔ والد گرامی کا نام ممتاز علی خان اور جد محترم کا اسم سامی مولانا اکبر علی خاں تھا۔ والد مرحوم کی تعلیم معمولی تھی لیکن ان کے دادا اپنے وقت کے جید عالم دین اور بلند پایہ محدث تھے۔

عرشی صاحب مرحوم پٹھانوں کی یوسف زئی قوم کے قبیلے اکوزئی کی شاخ حاجی خیل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جد امجد سوا سو سال قبل افغانستان سے ہندوستان پہنچے تھے اور رام پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

عرشی صاحب کی علوم مشرقی کی تعلیم رام پور کے مدرسہ مطلع العلوم اور مدرسہ عالیہ میں تکمیل کو پہنچی۔ پنجاب یونی ورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور ذاتی کوشش سے انگریزی زبان کی معقول استعداد بھی بہم پہنچائی۔

عملی زندگی کا آغاز کتب خانہ عالیہ، رام پور میں مسٹر چیمبین ناظم کتب خانہ کی نیابت سے ہوا تھا، بعد میں وہ خود ناظم کتب خانہ مقرر ہوئے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

۲۵؍فروری ۱۹۸۱ء مطابق ۱۹؍ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ کو بہ روز چہار شنبہ رام پور (یو۔ پی) میں انتقال ہوا اور اپنے آبائی محلے ہجلوار کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

حضرت عرشی مرحوم اردو اور فارسی کے خوش فکر اور رنگیں بیان شاعر بھی تھے۔ لیکن ان کی شہرت ایک بلند پایہ محقق اور نقاد کی حیثیت سے تھی۔ غالبیات میں بہت گہری نظر

رکھتے تھے۔ غالب کے خطوط اور دیوان کی تدوین ان کا بے مثل کارنامہ ہے۔ لسانیات اور تحقیق و تدوین میں ان کی متعدد یادگار تصانیف ہیں۔

ان کا شمار ہندوستان اور پاکستان کے صف اول کے چند ممتاز محققین میں ہوتا ہے۔ وہ نہایت شریف، منکسر المزاج، بردبار، متواضع، شہرت و خودنمائی سے دور، نفور، عزلت نشیں اور ہمیشہ مطالعہ و تحقیق میں مصروف رہنے والے بزرگ تھے۔

علی حسن خاں، نواب:

صفی الدولہ، حسام الملک شمس العلماء نواب علی خاں نام ارباب حضرت صدیق حسن خاں علیہ الرحمہ کے نامور بیٹے تھے۔ تقریباً ۱۲۸۳ھ (۶۷-۱۸۶۶ء) میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم کے ساتھ جدید اعلیٰ تعلیم سے بھی بہرہ مند تھے۔

نواب شاہجہاں بیگم نے انھیں ریاست بھوپال کا ڈائرکٹر آف ایجوکیشن مقرر کیا تھا۔ ایک عرصہ تک وہیں قیام رہا۔ ۱۹۰۳ء میں بھوپال چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے تھے۔

نواب شمس الحسن خاں اور نواب امیر حسن خاں، ان کے دو صاحبزادگان ذکر سید صاحب کے خطوط میں آیا ہے۔ دونوں کے نام سید صاحب کے خطوط بھی یادگار ہیں۔ نواب شمس الحسن کا انتقال کراچی میں ہوا۔

سرسید کی تعلیمی تحریک اور ندوۃ العلماء کی مذہبی اور تعلیمی تحریک میں نہ صرف شامل تھے، بلکہ اس کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ ندوہ کے کچھ مدت تک اعزازی ناظم بھی رہے تھے۔ دار المصنفین کے اساسی ارکان میں سے تھے۔ یوپی اور خصوصاً لکھنؤ کی ہر علمی، تعلیمی اور معاشرتی اصلاحی تحریک میں ان کا نام سر فہرست رہتا تھا۔

۱۶ر نومبر ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

غلام مصطفیٰ خاں صاحب، ڈاکٹر:

حضرت مخدومی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب ۱۹۱۲ء میں جبل پور (سی پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جبل پور میں حاصل کی اور میٹرک سے لے کر ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے حاصل کیں۔ ایم اے ڈاکٹر صاحب نے فارسی اور اردو دو زبانوں میں کیا۔ فن تجوید کی تحصیل بھی فرمائی۔ علمی زندگی کا آغاز شعبۂ تعلیم میں کیا۔ ناگ پور یونیورسٹی کے ماتحت مختلف کالجوں

میں تین سال تک خدمات انجام دیں پھر آٹھ سال تک اسی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان تشریف لے آئے۔ تقریباً آٹھ سال کراچی میں خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصہ اردو کالج میں شعبۂ اردو سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۶ء میں سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ مجموعی طور پر تقریباً پینتیس برس تعلیم و تدریس کی عظیم الشان خدمات انجام دے کر ۱۹۷۲ء میں ریٹائر ہوئے لیکن چار سال مزید خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ اب پروفیسر امریطس ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے سیکڑوں شائقین کو آپ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا اور بہت سے طلبہ نے آپ کی رہنمائی میں تحقیقی مقالے لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تحقیق میں رہنمائی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب کا شمار پاک و ہند کے نامور محققین کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔ اُن کے چودہ علمی و تحقیقی مقالے اردو دائرہ معارف اسلامیہ (لاہور) میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور پچاسوں، علمی، تحقیقی، تنقیدی مقالے رسالہ اردو (دہلی و کراچی)، معارف (اعظم گڑھ)، نقوش (لاہور)، اسلامک کلچر (حیدر آباد، دکن)، اورینٹل کالج میگزین (لاہور) ناگ پور یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی کے جرنلوں، اور برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض سے نکلنے والے بیسیوں علمی و تحقیقی مجلوں اور ان کے خاص نمبروں میں شائع ہوئے ہیں اور آپ کی تربیتھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ مقالے اور کتابیں بیشتر اردو میں ہیں اور انگریزی، فارسی اور عربی میں بھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کو اللہ تعالیٰ نے علم و فکر کے بہترین خصائص، اخلاق کے اعلیٰ محاسن اور سیرت کے بے شمار فضائل سے نوازا ہے۔ ان کا وجود گرامی علم و عمل کی جامعیت کبریٰ کا روشن نشان ہے۔ شرافت نفس میں وہ اس عہد کی ایک بے مثال ہستی ہیں۔ ان کا شمار اس دور میں علم و تحقیق کے اساتین میں ہوتا ہے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب کا مقام علم و فضل اس سے بہت بلند ہے، جس کا ہم جیسے ضعفائے علم تصور کر سکتے ہیں۔ حضرت کی توجہات سامی سے کتنے ہی خزف ریزے کندن بن چمک اٹھے اور علم و تحقیق کی دنیا میں ان کا کام سند سمجھا جانے لگا۔

مبداے فیاض نے حضرت ڈاکٹر صاحب پر علم و نظر کے کتنے ہی عوالم کو روشن کر دیا ہے۔ متعدد دانشِ عالم مثل عربی، فارسی، انگریزی اور ان کی تاریخ و ادبیات، مختلف علوم و فنون، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، تصوف، شریعت، طریقت، تاریخ، تنقید غرضے کہ کتنے ہی میدان ہیں جن کی بے شمار راہیں فیضانِ الٰہی سے حضرت کے ذہن و دماغ پر کھل گئی ہیں۔ حضرت کی فکر و نظر کی تابانیوں سے اس عہد میں انسان کی مادی زندگی سے لے کر اس کی ذہنی و فکری اور روحانی زندگی تک کے مختلف گوشے جگمگا اٹھے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیقاتِ علمیہ کا دائرہ صرف اردو تک محدود نہیں بلکہ عربی، فارسی، اور انگریزی زبان و ادبیات اور بہت سے علوم تک پھیلا ہوا ہے لیکن اردو کو بجا طور پر فخر ہے کہ ایسا محقق بے بدل اس عہد میں اس کے نصیبے کا ستارہ بن کر چمکا اور اپنے افکار و افادات سے اس کے دامن و گریبان کو زر نگار کیا۔

بعض شائقین کو حضرت کی تصنیفات تالیفات کی کمیت متحیر کرے گی لیکن ایسے نیازمندانِ شوق بھی ہو سکتے ہیں جن کے قلوب حضرت کے کاموں کے علمی و تحقیقی مرتبے، افادیت کے دائرے، نظر کے فیضان اور انسانی نفوس کے تزکیہ و اصلاح اور تعلیم و تربیت کے میدان میں حضرت ڈاکٹر صاحب کی فتوحات سے زیادہ متاثر ہوں۔

کیا ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے اس پہلو پر بھی کسی کی نظر ہے کہ آپ کی تربیتِ علمی سے اصحابِ علم و استعداد کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی ہے جو علم و عمل کے مختلف میدانوں میں معروفِ خدمتِ ملی ہے

عام طور پر کسی شخص کی خدمات کے اعتراف و فہم کے لیے حکومت کے اعزاز یا انعام کو پیمانہ قرار دے لیا جاتا ہے۔ اگر یہ پیمانہ ہی کسی کی شخصی عظمت اور خدمات کا اصول قرار دے لیا جائے تو جان لینا چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب کو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر متعدد انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے کوئی انعام باعثِ فخر نہیں ہوتا بلکہ اعزاز و انعام ان کی شخصیت کی نسبت سے شرف پاتا ہے۔ حضرت مخدومی ڈاکٹر صاحب ایک ایسی ہی شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو حکومت یا جس ادارے نے اپنے اعزاز و انعام سے نوازا، تو یہ بات فیصلے کرنے والوں کے صحیح اندازِ فکر اور شرافتِ نفسی پر دلیل ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے علمی مرتبے

اور ذاتی شرف میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ حضرت کے وابستگانِ دامن کو اس سے خوشی ضرور ہوئی۔

حضرت مخدومی ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ حیدر آباد (سندھ) میں سکونت پذیر ہیں۔

محمد عرفان، مولانا ابو المعارف:

مولانا محمد عرفان ہزارہ (صوبہ سرحد) کے رہنے والے تھے۔ حافظ قرآن تھے اور عالم دین بھی۔ درسِ نظامیہ کی باقاعدہ تکمیل کی تھی۔ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ عربی زبان پر انھیں عبور حاصل تھا۔ قومی خدمت کا شوق تھا اور تحریک خلافت اور ترک موالات میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ قومی خدمات کے شوق، سرگرمی اور انقلاب پسندی کی بنا پر انھیں صوبہ سرحد سے نکال دیا گیا تھا حکومت کا خیال تھا کہ اس دربدری کے عالم میں ان کی سرگرمیاں سرد پڑ جائیں گی لیکن ہوا یہ کہ ان کا جوش اور بڑھ گیا اور وہ زیادہ سرگرم عمل ہو گئے۔ ملک کی آزادی کی جد وجہد میں کئی بار گرفتار ہوئے، جیل گئے اور سنتِ یوسفی پر عمل پیرا ہونے کی توفیق نصیب ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں وفدِ خلافت برائے حجاز کے وہ رکن تھے۔ اور ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ میں موتمر اسلامی میں شرکت کے لیے جمعیت علمائے ہند نے جو وفد بھیجا تھا، اس میں شامل تھے۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہجہان پوری ثم الدہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، علامہ سید سلیمان ندوی، علی برادران سے بہت قریبی تعلقات تھے۔

مذہبی مسلک میں دیوبندی انداز فکر رکھتے تھے اور سیاسی طور پر نیشنلسٹ تھے۔ ایک مرتبہ کانگریس کے ٹکٹ پر الیکشن میں کھڑے ہو گئے تھے لیکن مولانا شوکت علی مرحوم کے کہنے سے الیکشن میں حصہ نہیں لیا۔

مجلس خلافت کے فنانس سیکریٹری تھے، روزنامہ خلافت بمبئی سے بھی تعلق تھا۔ اس لیے ان کا آخری دور بمبئی میں بسر ہوا۔

تمام عمر مجرد رہے اور نہایت پاک صاف زندگی گزاری۔ نسلاً پٹھان تھے اور حد درجہ غیور تھے۔

۱۴ر اپریل ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں اچانک انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔

مالک رام:

اردو زبان کے مشہور مصنف، نقاد، عربی زبان داں، غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد کے محقق جناب مالک رام کے نام کے ساتھ "بوہجا" کا اضافہ کیجیے تو پورا نام بنتا ہے۔ اروڑہ کھتری ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ والد ماجد کا نام نہال چند تھا۔ ۲۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہفتے کے دن پھالیہ ضلع گجرات میں جو اب پاکستان میں ہے، پیدا ہوئے۔

۱۹۲۴ء میں پنجاب یونی ورسٹی (لاہور) سے میٹرک کیا۔ اسی زمانے میں گجرات میں کالج قائم ہو گیا۔ ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ کالج، گجرات سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں ڈی اے وی کالج، لاہور سے بی اے اور ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے تاریخ میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اگلے دو سال میں یونی ورسٹی لا کالج (لاہور) سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی۔

عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ وہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک لاہور کے ہفت روزہ آریہ گزٹ، ماہنامہ نیرنگِ خیال اور روزنامہ بھارت ماتا میں کام کرتے رہے جون ۱۹۳۶ء سے انھوں نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ اُس وقت سے لے کر ۱۹۶۵ء میں ریٹائر ہونے تک وہ حکومت کے بعض محکموں میں خدمات انجام دیتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کا بیشتر وقت ہندوستان سے باہر مختلف ملکوں میں گزرا۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی میں اردو ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت اختیار کر لی اور ساہتیہ اکیڈمی سے ان کا ضابطے کا تعلق ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں انھوں نے مولانا آزاد کی غبار خاطر، تذکرہ اور خطبات ایڈٹ کیے۔

مالک رام کی اب تک ڈیڑھ درجن کے قریب تصنیفات و تالیفات اور ایک درجن کے قریب ان کے مرتبات شائع ہو چکے ہیں۔ اخبارات و رسائل میں چھپنے والے مقالات ان کے علاوہ ہیں۔ علمی، ادبی خدمات کے سلسلے میں انھیں بہت سے انعامات و اعزازات حاصل ہوئے ہیں۔

مالک رام گورکھی، پنجابی، انگریزی، اردو، عربی، فارسی وغیرہ زبانوں سے بہ خوبی واقف ہیں، ترکی بھی جانتے ہیں۔ لیکن ان کی علمی خدمات کا سب سے بڑا ذریعہ اردو زبان ہے۔ ادب، تنقید، تحقیق، تاریخ، اسلامیات وغیرہ کا خاص ذوق اور گہری نظر رکھتے ہیں۔

اب کہ ان کی عمر چوراسی برس کی ہو گئی ہے اور کہیں آنا جانا برائے نام رہ گیا ہے شب و روز اپنے گوشۂ عزلت میں مطالعے اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے ہیں۔

محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا:

مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، قاضی پورہ، بلیا (یوپی) کے ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ والد ماجد کا اسم گرامی مولانا حافظ عبد الرحیم تھا۔ مولانا محمد ابراہیم ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا فاروق چریاکوٹی، مولانا ہدایت اللہ (تلمیذ مولانا فضل حق خیر آبادی)، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عزیز الرحمن، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی وغیرہ بلند پایہ علمائے کرام کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ دیوبند سے ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں فراغت حاصل کی۔ حضرت شیخ الہند سے بیعت بھی تھے۔

مدرسہ فتح پوری (دہلی)، دار العلوم مئو (ضلع اعظم گڑھ)، مدرسہ قصبہ عمری (ضلع مراد آباد)، مدرسہ امدادیہ۔ دربھنگہ (بہار)، دار العلوم ڈابھیل (سورت)، دار العلوم ہاٹ ہزاری (چاٹگام) میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ دار العلوم دیوبند سے ان کا متعدد بار تعلق ہوا۔ پہلے ۱۳۳۱ھ میں، پھر ۱۳۴۴ھ میں، پھر ۱۳۶۲ھ میں وہ دار العلوم سے وابستہ ہوئے اور ہر بار کئی کئی سال تک خدمات انجام دیں۔ آخری بار ۱۳۶۶ھ میں بلایا گیا تھا اور تادم واپسیں وہ اسی سے وابستہ رہے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے بعد مسند صدارت پر فائز ہوئے اور ناظم تعلیمات بنائے گئے۔

حضرت مولانا بلیاوی نے تقریباً ساٹھ برس تک حدیث کا درس دیا تھا۔ ہندوستان اور ایشیا و افریقہ میں ان کے ہزاروں شاگرد پھیلے ہوئے تھے جنھوں نے حضرت سے حدیث پڑھی تھی۔ مولانا بلیاوی تفسیر، حدیث، اصول، عقائد، کلام اور دوسرے علوم میں یگانۂ روز تھے۔

متعدد دینی تصنیفات، شروح و حواشی اردو، عربی اور فارسی تحریر فرمائے۔ کچھ موجود ہیں اور کچھ ضائع ہو گئے۔

۲۴ رمضان ۱۳۸۳ھ مطابق ۸ فروری ۱۹۶۴ء کو دیوبند میں انتقال فرمایا اور قبرستانِ قاسمی میں آسودۂ خاک ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے۔

محمد امین زبیری، مولوی:

مولوی محمد امین زبیری، مولوی امانت حسین شفَا کے بیٹے تھے۔ جاے ولادت نینی تال (بھارت) کا قصبہ ''درد'' تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت زبیر بن العوام سے ملتا ہے اور زبیری کہلاتے تھے۔ ان کے بزرگوں نے ہندوستان کے مختلف مقامات پر قیام کیا۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں ان کے بزرگوں نے مارہرہ (ضلع ایٹہ۔ یوپی) کو اپنا مستقر بنایا، جس کے ارد گرد کا علاقہ انھیں جاگیر میں ملا تھا۔

تعلیم مارہرہ اور رام پور (یوپی) میں حاصل کی۔ اگرچہ رسمًا فارغ التحصیل نہ تھے، لیکن علمی شوق اور مطالعے کی بدولت ان کا شمار پاک و ہند کے اہل علم میں ہوتا ہے۔ تقریبًا دو درجن تصنیفات و تالیفات ان کی یادگار اور بے شمار مقالات اخبارات و رسائل میں منتشر ہیں۔

عملی زندگی کا آغاز ریاست گوالیار میں ایک معمولی ملازمت سے ہوا۔ کچھ عرصہ پرتاب گڑھ اور بارہ بنکی میں محکمۂ بندوبست اراضی میں گزرا، پھر بمبئی چلے گئے اور روزنامہ ہیرالڈ میں کالم نویس ہو گئے۔ متعدد اکابر کے پرسنل اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا اور اپنی محنت اور لگن سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ والیۂ ریاست بھوپال سلطان جہاں بیگم کو اپنے لیے ایک پرائیویٹ اسسٹنٹ کی ضرورت ہوئی تو زبیری صاحب کا نام پیش ہوا۔ امتحان ہوا، پاس ہو گئے اور خدمات انجام دینی شروع کر دیں۔ انھوں نے نہایت خلوص، جاں فشانی اور بیدار مغزی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے۔ والیۂ مرحومہ ان پر بہت اعتماد کرتی تھیں۔ ۱۹۳۱ء میں والیۂ معظمہ کے انتقال کے بعد زبیری صاحب نے پنشن لے لی تھی۔

پنشن لینے کے بعد انھوں نے اپنے بیٹے اور بھتیجوں کی تعلیم و تربیت کے لیے علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان آ گئے تھے اور کراچی میں مقیم تھے۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء مطابق ۲۰ صفر ۱۳۷۵ھ بروز جمعہ کراچی میں انتقال کیا۔ خدا مغفرت فرمائے۔

محوی صدیقی لکھنوی:

محمد حسین نام اور محوی تخلص تھا۔ نسبتًا صدیقی اور وطنًا لکھنوی تھے۔ ۱۵ مئی ۱۸۹۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، پھر فرنگی محل کے مدرسۂ نظامیہ میں، جب ان کے والد بھوپال گئے تو مدرسہ سلیمانیہ بھوپال میں تحصیل علم کی اور سند

فضیلت حاصل کی۔

الناظر، لکھنؤ کے نائب مدیر رہے (۱۹۱۱ء)۔ بھوپال میں محکمۂ تصنیف وتالیف سے وابستہ رہے (۱۹۱۳ء) کچھ دنوں مولانا آزاد سبحانی کے مدرسۂ الہیات کان پور میں مدرس بھی رہے (۱۹۱۹ء)۔ جامعہ ملیۂ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ تصنیف وتالیف سے تعلق رہا (۱۹۲۱ء)۔ حیدرآباد دکن گئے اور انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہو گئے (۱۹۲۲ء)۔ اور اسی زمانے میں اورنگ آباد کالج میں فارسی کے لیکچرار ہو گئے۔ مدراس یونی ورسٹی کے تحت اورنیٹل انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تو اس میں اردو، عربی اور فارسی کے استاد مقرر ہو گئے۔ ۱۹۵۲ء میں ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ایک عرصہ صوبہ مدراس کے ضلع ارکاٹ میں "میل وشارم" کے مقام پر گزارا اور "الارشاد" اور "معیار ادب" کے نام دو رسالے نکالے۔ پھر لکھنؤ واپس آ گئے اور یہاں سے رسالے جاری رکھے لیکن جلد ہی انہیں بند کر دینا پڑا۔

علامہ محوی بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد ہو گئے۔ مدراس کے علاقے میں خاص طور پر ان کی کوششوں سے اردو زبان کا فروغ اور علم وادب کا چرچا ہوا۔ ان کی تیرہ کتابیں چھپ چکی تھیں۔ متعدد غیر مطبوعہ یادگار چھوڑیں۔ بہ قولِ ماہر القادری "وہ اپنی ذات سے علم وفن کی ایک انجمن تھے"۔

آخر عمر میں وہ اپنے بیٹے منیر المحوی صدیقی کے پاس بھوپال تشریف لے گئے۔ ۱۹ ؍ نومبر ۱۹۷۵ء کو بدھ کے روز وہیں ان کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر پچانوے برس کی تھی۔

مہر، مولانا غلام رسول:

ہندوستان پاکستان کے نامور صحافی، بلند پایہ مصنف، صاحبِ طرز ادیب اور شاعر مولانا غلام رسول مہر ۱۵ ؍ اپریل ۱۸۹۵ء کو موضع پھول پور ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری محمد علی خاں (ف ۱۹۱۷ء) تھا۔ میٹرک کا امتحان مشن ہائی اسکول جالندھر سے اور بی اے کا امتحان اسلامیہ کالج۔ لاہور سے ۱۹۱۵ء میں پاس کیا۔

عملی زندگی کا آغاز پایہ گاہ وقار الامرا حیدرآباد دکن میں انسپکٹر آف اسکول کی حیثیت سے کیا۔ پانچ سال کے بعد ملازمت ترک کر دی صحافت کا شغلہ اختیار کیا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۷ء تک زمیندار لاہور کے عملۂ ادارت میں شریک رہے۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۹ء

تک اپنا اخبار انقلاب مولانا عبدالمجید سالک کے ساتھ مل کر نکالا۔ ۱۹۴۹ء میں انقلاب بند ہونے کے بعد ان کے اوقاتِ گرامی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف کے کاموں میں بسر ہوا۔ تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف و تراجم اور مرتبہ کتب ہیں ان کی یادگار ہیں۔

۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء کو لاہور میں انتقال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم و فضل کے کمالات کے ساتھ سیرت و اخلاق کے بہترین محاسن سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔

نصیر الدین ہاشمی:

نصیر الدین ہاشمی ۱۷ر رمضان المبارک ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۵ر مارچ ۱۸۹۵ء کو جمعہ کے دن حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام نامی مولوی عبدالقادر تھا۔ ہاشمی مرحوم کے جد بزرگوار غلام محمد شرف الدولہ مدراس کے رؤسا میں شامل تھے۔

ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی پھر مدرسہ دارالعلوم میں انھیں داخل کرا دیا گیا پھر جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں داخلہ ہوا۔ بعد میں مدراس یونی ورسٹی سے انھوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

تقریباً بیس سال کی عمر میں ملازمت کا آغاز دفتر قحط سالی میں حلقہ انسپکٹر کی حیثیت سے ہوا۔ ریاست کے کئی دفتروں میں ملازمت کے بعد مارچ ۱۹۵۰ء میں ناظم رجسٹریشن کی حیثیت سے باعزت طور پر ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

تصنیف و تالیف کا شوق طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ پہلی تصنیف ”دکن میں اردو“ ۱۹۲۲ء میں (پہلی بار) شائع ہوئی تھی اور ۱۹۶۴ء میں جب انھوں نے نقوش لاہور کے نمبر کے لیے اپنی ”آپ بیتی“ لکھی تھی تو اس وقت تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے تھے اور دوسری تصنیفات و تالیفات کی تعداد ۳۱ تک پہنچ چکی تھی۔ ان میں سولہ صفحے کا کتابچہ بھی ہے اور آٹھ آٹھ سو صفحے کی ضخیم کتابیں بھی ہیں۔ متعدد کتابیں اس وقت مسودات کی شکل میں بھی تھیں جو بعد میں شائع ہوئیں۔ وہ زندگی کے آخری دنوں تک تصنیف و تالیف اور تدوین کے کاموں میں مصروف رہے۔

نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے تاریخ و تنقید ادب، تاریخ و سوانح، نسوانیات میں اپنی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ مخطوطات کی فہرست سازی میں بھی انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

نظامی بدایونی :

نظام الدین حسین نام تھا، شہرت نظامی بدایونی کے عرف سے ہوتی۔ ان کی پیدائش ۱۸۷۳ء میں بدایوں کے صدیقی خاندان میں ہوئی۔ وہ اپنے وقت کے مشہور اخبار نویس، اردو کے بڑے ادیب، ایک اچھے شاعر، متعدد کتابوں کے مصنف اور قومی خدمت گزار تھے۔ تعلیم کے فروغ اور قومی اصلاح وتعمیر کے میدان میں انھوں نے عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ ان کا شمار ملک کے مشاہیر میں ہوتا تھا۔

نظامی مرحوم کی تعلیم گھر پر والد ماجد مولوی فخرالدین کے زیرِ نگرانی شروع ہوئی تھی، پھر بدایوں ہائی اسکول سے داخل ہوئے وہیں سے الٰہ آباد یونی ورسٹی کے زیرِ انتظام ۱۸۹۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا جو اُس زمانے میں انٹرنس کہلاتا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے علی گڑھ میں مزید تعلیم کے لیے داخلہ لیا لیکن چند ہی دن میں ان کے بزرگوں نے انھیں واپس بلا لیا اور اس طرح اس سے آگے ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ان کے دادا کے چچازاد بھائی مولوی حمیدالدین ڈپٹی کلکٹر کی بیٹی سے ان کی شادی کردی گئی اور ڈپٹی صاحب کے مشورے سے سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ ان کی پہلی اور آخری ملازمت محافظ خانہ مال وفوجداری ضلع شاہجہان پور میں محکمہ نقل کے منصرم کی تھی۔ جسے انھوں نے سات آٹھ سال تک خوش اسلوبی کے ساتھ چلایا، چوں کہ یہ ملازمت انھوں نے بزرگوں کے اصرار سے اختیار کی تھی، ان کا ذوق اس سے قطعاً مختلف تھا۔ وہ شروع ہی سے ملازمت کے بجائے کوئی آزاد مشغلہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔

مطالعہ وتحریر کا شوق انھیں زمانہ طالب علمی میں پیدا ہوگیا تھا۔ ملازمت کے زمانے میں بھی فارغ اوقات میں ان کا پسندیدہ مشغلہ تصنیف وتالیف تھا۔ چناں ان کے مضامین عالم تصویر، کان پور اور روہیل کھنڈ گزٹ، بریلی میں شائع ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے ایک اخلاقی ناول بھی "رضیہ مسعود" کے نام سے لکھا تھا اور شائع ہوا تھا۔

شاعری کا شوق بھی زمانہ طالب علمی سے تھا۔ نظم نگاری سے خاص دل چسپی تھی۔ مولوی عبدالحق بیخودؔ بدایونی سے اصلاح لیتے تھے۔ ایک مثنوی 'صبح امید' کے نام سے لکھی تھی اور مولانا الطاف حسین حالی کو اصلاح کے لیے بھیجی تھی۔ انھوں نے اس کی اصلاح تو کردی لیکن انھیں مشورہ دیا کہ انھوں نے ان کے مضامین بھی دیکھے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں شاعری کے مقابلے میں ان میں مضمون نگاری اور تصنیف وتالیف کی صلاحیتیں زیادہ ہیں۔ شاعری یوں بھی

انسان کو بے عمل بنا دیتی ہے اس لیے ان کا مشورہ ہے کہ وہ شاعری کے بجائے مضمون لکھا کریں۔ نظامی مرحوم نے حالی کی نصیحت کو گرہ میں باندھا اور مضمون نگاری پر زیادہ توجہ صرف فرمائی۔ اگرچہ تعلق ان کا شاعری سے بھی عمر بھر رہا۔ لیکن جب تک شاعری کا کوئی خاص داعیہ اور تحریک نہیں پیدا ہوتی تھی، شاعری کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔

ملازمت ترک کرنے کے بعد ۱۹۰۳ء میں انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار ذوالقرنین کے نام سے بدایوں سے جاری کیا۔ شروع میں ذوالقرنین منشی آغا جان لکھنوی کی شراکت میں نکلا تھا اور انھی کے وکٹوریہ پریس بدایوں میں چھپتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں نظامی مرحوم نے اپنا "نظامی پریس" قائم کر لیا تو ذوالقرنین بھی خود ہی نکالنے لگے۔ جسے انھوں نے کامل انتالیس سال بلا شرکتِ غیرے نکالا۔ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے اسے اپنے بیٹے مولوی احید الدین کے سپرد کر دیا تھا۔

حضرت نظامی کی خدمات کا سب سے بڑا میدان "صحافت" تھا۔ صحافت کے ذریعے انھوں نے قوم و ملت اور ملک و وطن کے ان تمام میدانوں میں عظیم الشان خدمات انجام دیں جن کی صحافت کے ذریعے توقع کی جا سکتی ہے اور ہر میدان میں اپنا امتیاز پیدا کیا۔ ملک کے عام اور مشترکہ مسائل میں قوم کی رہنمائی کی مسلمانوں کے تعلیمی، تہذیبی سماجی، اقتصادی مسائل میں ملت کے رہنما بنے۔ پریس اور صحیفہ ذوالقرنین کے ذریعے ادبی و علمی خدمات انجام دیں۔ اردو کے مسئلے میں رہنمائی کی، ادب کے فروغ میں حصہ لیا، بک ایجنسی قائم کر کے صحت مند بنیادوں پر کاروبار کا نمونہ پیش کیا اور سب سے بڑھ کر شب و روز کی محنت سے، اپنی سیرت اور اخلاق سے اور اپنی پوری زندگی کے عمل سے ملک و وطن اور قوم و ملت کی خدمات کی ایک قابلِ تقلید مثال قائم کی۔ ان کے حالات کے مطالعے سے ہمت بندھتی ہے اور زندگی میں آگے بڑھنے اور کچھ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

"ذوالقرنین" کے ذریعے انھوں نے آزاد قومی صحافت کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ اسے اپنی تعلیمی، سماجی اصلاحی تحریک کا ذریعہ بنایا۔ وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد کے اجراء و تعارف کا بہت بڑا ترجمان تھا۔ اس نے علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام اور اصلاح کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ اسے قومی اور ملکی مسائل میں اپنے نقطۂ نظر کی ترجمانی اور ملی رہنمائی کا ذریعہ

بنایا۔ اسلامی اور سرکاری مدارس کے اجرا کی تحریک کو اس کے ذریعے پروان چڑھایا۔ حج کمیٹی اور سنی وقف بورڈ کی تحریک اور ان کی تنظیم و اصلاح اور حکومت کو ان اداروں کے مسائل کی طرف توجہ دلانے کا ذریعہ ذوالقرنین بنا۔ ذوالقرنین تحریک آزادی اور وقت کے مسائل اور قومی و ملی زندگی کی تاریخ اور اس کے نصف صدی کے نشیب و فراز کا بہت بڑا ماخذ اور نظامی مرحوم کے قومی، ملی، تعلیمی، معاشرتی اصلاحی افکار کا سب سے بڑا خزینہ ہے۔

"نظامی پریس" انھوں نے ۱۹۰۵ء میں قائم کیا تھا۔ بدایوں اگرچہ لاہور، دہلی، لکھنو، کان پور وغیرہ بڑے تجارتی اور علم و ادب کے مرکزوں کے مقابلے میں بہت چھوٹا اور غیر ترقی یافتہ شہر تھا لیکن کتابت اور طباعت کے معاملے میں نظامی مرحوم کا ذوق اتنا بلند تھا کہ وہ کسی دوسرے درجے کی چیز کو گوارا ہی نہ کر سکتا تھا۔ انھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی محنت اور ذوق کی کارفرمائی سے اسے ہندوستان کا ایک بہترین پریس بنا دیا۔ اور غالب، رنگین و انشا، میر درد، جان صاحب کے دواوین، انیس و دبیر کے مرثیے نظیر اکبرآبادی کی بعض نظمیں چھاپ کر اہل علم اور اصحابِ ذوق کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ حتیٰ کہ انجمن ترقی اردو اور دارالمصنفین جیسے ادارے جن کی مطبوعات صحت زبان، حسن کتابت اور نفاستِ طباعت میں ہمیشہ معیار و مثال سمجھی جاتی تھیں، نظامی پریس کے کام کی نفاست اور عمدگی پر اعتماد کرنے لگے اور جب تک ان اداروں نے اپنے پریس قائم نہیں کر لیے اکثر نظامی پریس کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

قومی و ملکی سیاست نظامی مرحوم کا اصل میدان نہ تھا، لیکن تعلیم، سماجی اصلاح، قومی معاشیات سے صحافت کا ہمیشہ ایسا رشتہ استوار رہا ہے خصوصاً یونی ورسٹی کے قیام اور اس کی اصلاح کی تحریک کا قومی اور ملی سیاست سے اتنا گہرا تعلق رہا کہ ایک دردمند قلب اس سے بے نیاز رہ نہیں سکتا اور ایک قومی و ملی درد رکھنے والے صحافی کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اپنے قلم کو سیاست کی آلودگی سے محفوظ رکھ سکے۔ چناں چہ نظامی مرحوم کی زندگی میں ہم یہ مشاہدہ بار بار کرتے ہیں کہ انھوں نے عملی سیاست سے تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی خالص سیاسی مسائل پر کھل کر اور نہایت جرأت کے ساتھ اظہار کیا اور فکری و عملی طور پر قوم کی بہترین رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

خیال ہو سکتا ہے کہ نظامی مرحوم جو سرسید کی تعلیمی تحریک اور اس کے مقاصد کے بہت بڑے مبلغ تھے اس لیے وہ سرسید مرحوم کے اندازِ سیاست سے بھی متاثر ہوں گے۔ لیکن واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ دراصل انھوں نے جس زمانے میں شعور کی آنکھیں کھولیں سرسید مرحوم کی برٹش استعمار پرستانہ سیاست کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ علی گڑھ کے طلبہ کا ایک خاصا بڑا طبقہ ملک کی انقلابی سیاسی تحریک سے متاثر ہو چکا تھا اور کئی اولڈ بوائے علی گڑھ کی سیاست سے بغاوت کا بگل بجا چکے تھے اس لیے نظامی مرحوم سرسید کے اندازِ سیاست سے بہت کم متاثر ہوئے۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ وقت کی کسی حریت پسند جماعت یا انقلابی تحریک میں شامل ہو گئے ہوں لیکن ۱۹۲۶ء کے بعد انھوں نے صاف طور پر کانگریسی خیالات کو اختیار کر لیا تھا۔ اور قوم پرور اور حریت پسند رہنماؤں سے ان کے تعلقات قریبی ہو گئے تھے۔ انھوں نے ذوالقرنین کے ذریعے حریت پسند قومی و ملی جماعتوں اور تحریکوں کے لیے زندگی کے فروغ کا سروسامان فراہم کیا اور اپنے قلم سے ان کی تائید اور حمایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ وہ آزادی کی تحریک اور ملک اور قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے فرقہ وارانہ سیاست کو سخت مضر اور ہندو مسلم اتحاد کو نہایت ضروری خیال کرتے تھے ان کی زندگی کے سیاسی مقاصد میں ملک کے امن اور باشندگانِ ملک کے باہمی اتحاد کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

تعلیم کی اشاعت اور فروغ خصوصاً مسلمانوں میں اُس کی اشاعت کے لیے وہ ہمیشہ بہت بے چین رہتے تھے۔ اِس کے لیے انھوں نے اپنی بہترین ذہنی اور دماغی قابلیتوں اور قلم کی صلاحیتوں کو استعمال کیا۔ مسلمانوں کو وہ تعلیم کے حصول کے لیے اور حکومت کو اس کے لیے سروسامان فراہم کرنے پر ہمیشہ توجہ دلاتے رہے۔ اِس سلسلے میں وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے کاموں میں برابر سرگرم رہے۔ پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبہ متحدہ کے وہ اٹھارہ سال تک جوائنٹ سکریٹری رہے، زندگی کے آخری دور میں کئی سال سے اُس کے آنریری سکریٹری تھے۔ یہ تعلق محض رسمی نہ تھا۔ اُس کے لیے وہ اخبار میں مضمون لکھتے، جس شہر میں جلسہ ہوتا وہاں کے لوگوں سے خط و کتابت کرتے، انتظامات کے لیے وہاں کا سفر کرتے، صدر، مقررین وغیرہ کے انتخاب میں حصہ لیتے، پھر جلسے کی تاریخوں سے کئی کئی دن پہلے وہاں پہنچ جاتے اور انتظامات کی خود نگرانی کرتے، قرارداوں

کے مسودے تیار کرتے، ان کے مجوزین اور مؤیدین کی فہرستیں بناتے، جلسے کو کامیاب بنانے کے سب جتن کرتے اور جلسے کے بعد اس کی قراردادوں اور فیصلوں کو موثر بنانے کی مہم شروع کر دیتے اور سرکاری و غیر سرکاری متعلقہ اداروں کے پیچھے پڑ جاتے۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں بدایوں میں مسٹن اسلامیہ ہائی اسکول قائم ہوا۔ اس کے قیام میں سب سے زیادہ حصہ انھی کی کوشش کا تھا۔ وہ اس کے دوامی ٹرسٹی تھے اور مختلف اوقات میں اس کے پریسیڈنٹ، وائس پریسیڈنٹ، جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بریلی اور اٹاوہ کے اسلامیہ کالجوں کے ٹرسٹی بھی تھے اور ان کی ترقی و اصلاح کے کاموں میں بہت دل چسپی لیتے تھے۔ اسلامی مکاتب کھولنے کی تحریک کو پروان چڑھایا اور حکومت کی جانب سے ان کی امداد کے لیے کوششوں کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔

محمد احمد کاظمی کی تالیف "نظامی بدایوں" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی عام پبلک خدمات کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا اور بلا لحاظ مذہب و ملت وہ ہر کسی کی خدمت کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا چارٹر منظور کر لینے کی تحریک میں نہایت شوق سے حصہ لیا، زبان و قلم سے اسے کامیاب بنانے میں سعی کی۔ ذوالقرنین اس کا نہایت موثر ذریعہ تھا۔ مالی مدد کی ضرورت پڑی تو اس میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ لیکن جب بعض اصحاب کا رویہ توقعات کے خلاف پایا تو کھل کر ان کی مخالفت کی اور جب وہ وعدے پورے ہوتے نہ دیکھے جو چارٹر کے مؤیدین نے کیے تھے اور اندازہ ہوا کہ یونی ورسٹی کی منظوری قومی آزادی کی تحریک سے علاحدہ رہنے کے وعدے پر دی گئی تھی تو پھر ان کے قلم نے کسی کی رو رعایت نہ کی۔ لیکن چوں کہ چارٹر کی منظوری کی تحریک میں ان کے اخلاص کو استعمال کیا گیا تھا۔ وہ اس معاملے میں مخلص اور بے غرض تھے، اس لیے یونی ورسٹی کے ارباب بست و کشاد ان کی کڑوی کسیلی باتیں بھی خاموشی سے سنتے تھے۔ وہ مدت دراز تک یونی ورسٹی کورٹ کے ممبر رہے۔ یونی ورسٹی کے معاملات میں ان کی رائے کو اہمیت بھی دی جاتی تھی۔

ایک زمانے تک یوپی میں حج کمیٹی نہ تھی اور یوپی کی شایقین وزائرین کو جن کی تعداد ملک کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی، معلومات کی فراہمی اور رہنمائی میں بڑی مشکلات پیش آتی تھیں اور بہت وقت برباد ہوتا تھا۔ نظامی مرحوم نے یوپی حج کمیٹی کے قیام کی تحریک میں حصہ لیا۔ اس کے قیام میں ان کی کوششوں کا بڑا حصہ ہے اسی طرح سنی وقف بورڈ کی تحریک کو بھی ان کے پرزور قلم سے بڑی تقویت پہنچی اور اوقاف کے انتظام کی اصلاح میں ان کے افکار وخیالات سے بہت فائدہ اٹھایا گیا۔

حضرت نظامی محض ایک صحافی نہ تھے جو وقت کے مسائل پر اپنی کوئی رائے ضرور ظاہر کرتا ہے اور اس طرح گویا اپنے صحافی ہونے کا فرض پورا کر دیتا ہے، نظامی مرحوم ایک بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ اگر ذوالقرنین کی جلدیں دنیا سے ناپید ہو جائیں اور کسی مورخ اور محقق کی دسترس میں نہ رہیں تو ان کی علمی، ادبی، تاریخی، سوانحی تالیفات و تصنیفات ان کی حیاتِ جاوید کی ضمانت ہیں۔ ذوالقرنین کے نظامی نمبر اور محمد احمد کاظمی کی تالیف "نظامی بدایونی" میں دو درجن سے زیادہ ان کی تالیفات و تصنیفات کی فہرست دی گئی ہے۔ ان میں چند خاص یہ ہیں۔

انقلابِ دہلی، بدایوں — قدیم و جدید، سیرۃ الحمید، سیاحت ولی عہد اول،
سیاحت ولی عہد دوم، قاموس المشاہیر (دو جلد)، قومی حکومت کی کہانی،
مسلم اوقاف کا قانون، کارنامۂ رام پور، گلدستۂ دکن وغیرہ۔

علمی خدمات کے اعتراف میں حیدرآباد دکن سے ان کے لیے سو روپے کا وظیفہ مقرر ہو گیا تھا، جو اُن کے انتقال تک انھیں ملتا رہا۔

"مثنوی صبحِ امید" (۱۸۹۶ء) کے علاوہ ۱۹۳۰ء میں "تجلیاتِ سخن" کے نام سے ان کی نظموں کا مجموعہ بھی شائع ہوا۔ اس کے بعد بھی یہ شغل جاری رہا حتیٰ کہ ۲۸ مئی ۱۹۴۷ء کو وہ زندگی کی آخری بیماری میں مبتلا ہوئے تو وفات سے صرف تین دن قبل ۵ جون کو انھوں نے اپنی پوتی قیصر جہاں کے لیے "فلسفۂ شادی" کے عنوان سے ایک نظم کہی جس کی شادی ۲۰ جون کو ہونا قرار پائی تھی۔ ان کا کلام زبان کی صحت، سادگی اور جذبات کی سچائی کا بہترین نمونہ ہے۔ حقیقت پسندی اور جذبۂ اصلاح کی کارفرمائی کلام میں صاف نظر آتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان کا غیر مرتب کلام بھی مرتب کر کے چھاپ دیا جائے یا

"تجلیاتِ سخن" میں اضافہ کرکے اس کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر دیا جائے۔

علمی و عملی زندگی کے مختلف دائروں میں ٹھوس علمی خدمات انجام دینے اور شب و روز قوم و وطن اور ملک و ملت کی رہنمائی کے کاموں کے ساتھ ساتھ وہ نہایت پُرمزاح شخصیت کے مالک تھے۔ بڑے زندہ دل، یارباش، مجلس طراز، بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔

علم و عمل سے ان کی بھرپور اور کامیاب زندگی کا ایک راز یہ تھا کہ انھوں نے زندگی کو اپنے لیے ایک بوجھ نہ بنایا تھا۔ وہ تمام کاموں کو ایک دل چسپ مشغلہ سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ اس لیے وہ کاموں سے اکتاتے نہ تھے اور سیر و تفریح میں زندگی کا فرار نہ ڈھونڈھتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی تفریح ان کے احباب کا "جہل مرکب" تھا۔ اس جہل مرکب کو بے تکلف احباب کا مجمع کہیے یا زندہ دلوں کی انجمن! ہوتا یہ تھا کہ جب کسی کانفرنس کے لیے شب و روز کی محنت اور اعصاب کو تھکا دینے والے ہنگاموں سے فارغ ہوتے تو سب دوست ایک دوسرے کی اور خود اپنی بھی غلطیوں، حماقتوں، بے وقوفیوں اور بدحواسیوں پر گفتگو کرتے، تنقید کرتے اور ایک دوسرے کے لیے تفریح کا سامان فراہم کرتے، اعصاب کو سکون پہنچاتے، کاموں کی تکان دور کرتے اس طرح تفریح و تفنن کے ساتھ احتساب و تنقید اور خود احتسابی کا ایک عظیم الشان عمل انجام پاتا اور اس کے بڑے فوائد ہوتے۔ دراصل بہ عنوان "جہل مرکب" فرزانوں کی یہ انجمن تھی اور اس کے سراپا تقدس ارکان تھے:

"حضرت نظامی، مولانا طفیل احمد منگلوری، میر نثار حسین، میر جعفر حسین، خان بہادر بشیر الدین، میر محمد حسین، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، ڈاکٹر ضیاء الدین، میر ولایت حسین، مولوی حبیب اللہ خاں، انوار احمد و غیرہم۔"

ان حضرات کی شکلیں دیکھیے تو ماشاء اللہ سب کے چہروں مختلف وضع کی خوبصورت داڑھیاں ہیں، وضع پر نظر ڈالیے تو یوپی کے شرفا کے لباس میں ملبس، گمان کیجیے تو وقت کے علما و فقہا کی کسی مجلس کا تصور ذہن میں آئے اور نام دیکھیے تو "جہل مرکب" اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے۔ اب ان میں سے کوئی بھی اس دنیا میں موجود نہیں۔

ایک اور انجمن "اخوان الصفا کے نام سے شاہجہاں پور کے قیام" کے دوران میں وہاں قائم کی تھی۔ مولانا طفیل احمد، مولوی ہیرا احمد اور حضرت نظامی مرحوم اس کے رکنِ رکین تھے۔ اس کے دیگر ارکان میں شاہجہان پور کے اور مولانا نظامی مرحوم کے زمانہ ملازمت و قیام شاہجہان پور میں دوسرے اضلاع کے حضرات میں، جو شاہجہان پور میں ملازمت یا کسی اور وجہ سے مقیم تھے، یہ نام ملتے ہیں:

> "مولوی عبداللطیف خاں بریلوی، مولوی اکبر علی تھانوی (مولانا اشرف علی تھانوی کے بڑے بھائی)، شاہجہان پور کے حاجی محمد سعید خاں، مولوی مسیح الزماں خاں، منشی فخرالدین خاں، مولوی احمد زماں خاں وغیرہم"

ان کے دوستوں میں مولانا طفیل احمد منگلوری جو ایک جان دو قالب کی مثال تھے، کی نظامی مرحوم سے پہلی ملاقات شاہجہان پور ہی کی مقدس سرزمین پر ہوئی تھی جہاں وہ مرزا پور سے بہ سلسلۂ ملازمت تبدیل ہو کر آئے تھے۔ یہ ملاقات ایسی تاریخی اور مبارک ثابت ہوئی کہ ان کے دوستانہ تعلقات میں ۱۹۴۶ء میں حضرت منگلوری کے انتقال تک فرق نہ آیا۔ ان کے انتقال کا نظامی مرحوم نے اتنا اثر لیا کہ شاید کسی کے انتقال کا لیا ہو!

۲۸ رمئی ۱۹۴۷ء کو انھیں بخار آیا۔ دس گیارہ روز علالت کا سلسلہ جاری رہا۔ ۸ رجون کو ان کا انتقال ہو گیا۔ وطن مالوف و مولد ہی ان کا مدفن بنا۔ اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔

مرحوم نماز روزے کے پابند اور مشرق کی اعلیٰ تہذیب و اخلاق کا نمونہ تھے۔ وضع دار تھے، تعصب سے دور و نفور کشادہ دل، وسیع النظر، خوردوں پر رحیم و شفیق اور بلا لحاظ مذہب و ملت ہر کسی کی خدمت کرنے والے شخص تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا فضل فرمایا تھا اور سعید و صالح اولاد سے بھی نوازا تھا۔ زاہرہ خاتون اور امینہ خاتون دو بیٹیاں، مولوی احید الدین نامی ایک بیٹے اور بہت سے پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں یادگار و سوگوار چھوڑیں تھیں۔

وحید قیصر ندوی:

مولانا علامہ سید سلیمان ندوی کے عزیز شاگرد، ندوہ کے فارغ التحصیل، بہار کے ایک خانوادۂ سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ہجرت کرکے مشرقی پاکستان چلے گئے تھے۔

وہ ایک اچھے ادیب اور صحافی تھے۔ روزنامہ جنگ، کراچی کے ڈھاکہ میں نمائندہ تھے۔ انجمن ترقی اردو، ڈھاکہ سے بھی تعلق تھا۔ مشرقی پاکستان میں ان کا شمار اردو کے خادموں میں ہوتا تھا۔ غالباً دسمبر ۱۹۶۹ء میں ڈھاکا میں انتقال ہوا۔ ماہر القادری مرحوم نے جنوری ۱۹۷۰ء کے فاران میں بہ سلسلۂ "یادِ رفتگاں" ان کا ذکر کیا ہے۔

ہمایوں مرزا:

ہمایوں مرزا دسمبر ۱۸۷۰ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ والدِ گرامی کا نام سید الفت حسین شاہ فریاد تھا۔ شاد عظیم آبادی نے ان کی سوانح عمری لکھی ہے۔

ہمایوں مرزا کی اردو، فارسی، عربی کی تمام تر تعلیم گھر پر ہوئی۔ پٹنہ ٹریننگ اکیڈمی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر انگلینڈ چلے گئے اور نومبر ۱۸۹۴ء میں بیرسٹر ہوکر وطن لوٹے۔ جنوری ۱۸۹۵ء سے بہ حیثیت ایڈووکیٹ کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت کا آغاز کیا۔ لیکن اسی سال وہ حیدرآباد دکن چلے گئے اور وہاں کی ہائی کورٹ میں پریکٹس کا آغاز کیا۔ وہیں انھوں نے ڈاکٹر صفدر علی مرزا کی بیٹی صغرا بیگم حیا سے ۱۹۰۱ء میں شادی کرلی اور پھر حیدرآباد کو انھوں نے ہمیشہ کے لیے اپنا وطن بنالیا۔ حیدرآباد میں انھوں نے ایک پرہجوم مجلسی و تہذیبی زندگی گزاری۔ کئی علمی، تہذیبی ادارے قائم کیے۔ بہت سے اداروں سے ان کا تعلق رہا۔

انھوں نے اپنی بیوی صغرا کے ساتھ بیرونِ ملک اور ملک کے مختلف تاریخی مقاموں متعدد شہروں کی سیاحت کی۔ نقوش کے آپ بیتی نمبر (۲) میں ہمایوں مرزا کی ۱۹۳۶ء تک کی خودنوشت موجود ہے۔

مرزا صاحب کو اپنی بیوی سے اور بیوی کو ان سے بہت محبت تھی۔ ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد میں ان کا انتقال ہوا۔ ہمایوں نگر کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کی بیوی نے ان کی قبر پر ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کرایا جو ان کی محبت کی یادگار ہے۔

مطبوعات مولانا آزاد صدی

مولانا ابوالکلام آزاد کے صد سالہ جشن پیدائش کی تقریب میں
مولانا مرحوم کی شخصیت و افکار اور عہد پر علمی، ادبی، تاریخی مطالعے اور جائزے
برعظیم پاک و ہند کے ممتاز اہل علم اور اصحاب فکر کے قلم سے

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد (شخصی مطالعہ): از ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی۔ مولانا آزاد کی شخصیت، سیرت اور افکار و خدمات کے بارے میں مصنف کا مطالعہ اور تاثرات صفحات: ۱۴۲، قیمت: ۳۵ روپے (مجلد)

۲۔ امام الہند مولانا آزاد: از مولانا امداد صابری۔ مولانا کی ہمہ جہت شخصیت، خصائصِ فکر، کمالِ اخلاق و تہذیب، محاسنِ سیرت اور ان کے علمی و عملی کارناموں کا تعارف۔ صفحات: ۳۰۴، قیمت: ۸۰ روپے (مجلد)

۳۔ اردو کا ادیب اعظم: از عبدالماجد دریابادی۔ مولانا آزاد سے متعلق مصنف کے مضامین، تقاریر، شذرات، کتابوں پر تبصرے اور دونوں کے مابین مراسلت کا مجموعہ۔ صفحات: ۲۴۰، قیمت: ۳۰ روپے (مجلد)

۴۔ خطوطِ ماجدی: مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے علمی، ادبی، لسانی اور تاریخ کے تین سو خطوط اور مشاہیر کے بارے میں جس میں بیانات کا مجموعہ۔ صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۶۰ روپے (مجلد)

۵۔ ابوالکلام آزاد: مرتبہ عبداللہ بٹ۔ مولانا آزاد پر مشاہیر علم و سیاست کے مضامین کا مجموعہ۔ پہلی اشاعت: ۱۹۴۳ء اہم اضافوں کے ساتھ آزاد صدی ایڈیشن۔ صفحات: ۱۵۲، قیمت: ۳۵ روپے (مجلد)

۶۔ آسپکٹس آف ابوالکلام آزاد (انگریزی): مرتبہ عبداللہ بٹ۔ مشاہیر و معاصرین علم و سیاست کے مضامین کا مجموعہ۔ آزاد صدی ایڈیشن۔ اہم اضافوں کے ساتھ۔ صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۳۵ روپے (مجلد)

۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد (شخصیت، سیرت اور کارنامے): مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ مولانا آزاد کی سیرت اور علمی، ادبی و سیاسی خدمات پر مقالات، تبصرے اور تقریر۔ صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۳۰ روپے (مجلد)

۸۔ ابوالکلام و عبدالماجد (ادبی معرکہ): از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری۔ الہلال کی ایک ادبی لسانی بحث کی روداد اور اجزائے بحث کی تدوین و محاکمہ۔ صفحات: ۱۴۴، قیمت: ۳۵ روپے (مجلد)

۹۔ ابوالکلام آزاد --- ایک مطالعہ: مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری۔ مولانا آزاد کی شخصیت اور بہ حیثیت ادیب، خطیب، صحافی، عالم دین، سیاسی افکار و خدمات کا تعارف و تبصرہ۔ صفحات: ۲۲۸، قیمت: ۶۰ روپے (مجلد)

۱۰۔ انجمن خدام کعبہ (تاریخ اور مقاصد و خدمات): از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری۔ موجودہ صدی کی پہلی اسلامی انقلابی تحریک پر بلند انداز فکر، ایثار عمل اور عبرت کا ایک حسرت کن منظر۔ صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۳۵ روپے (مجلد)

۱۱۔ اردو کی ترقی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا حصہ: از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری۔ اردو کی علمی ترقی، فروغ اور لسانیات میں مولانا آزاد کی خدمات اور افکار کا تعارف۔ صفحات: ۱۴۴، قیمت: ۳۵ روپے (مجلد)

۱۲۔ پیغام کلکتہ (۱۹۲۱ء): آل انڈیا خلافت کمیٹی کا ترجمان، زیر نگرانی: مولانا ابوالکلام آزاد، زیر ادارت: مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ تاریخِ ملت اسلامیہ ہند کا ایک اہم ماخذ (عکسی اشاعت)۔ صفحات: ۲۰۸ (بڑا سائز)، قیمت: ۱۵۰ روپے (مجلد)

۱۳۔ مولانا حسرت موہانی --- مجاہد آزادی کامل: از شگفتہ رضوی۔ مکمل آزادی کے لیے مولانا حسرت کی جدوجہد۔ سرگزشت مع ۱۹۲۱ء کا ضبط شدہ خطبۂ صدارت (عکس)۔ صفحات: ۲۳۲، قیمت: ۳۵ روپے (مجلد)

۱۴۔ میر کارواں مولانا ابوالکلام آزاد: از ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی۔ مولانا آزاد کی زندگی، سیرت اور افکار و خدمات پر مشاہدے، مطالعے اور تحقیق کا حاصل۔ صفحات: ۲۳۲، قیمت: ۳۵ روپے (مجلد)

۱۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے معاصرین: مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری۔ نو معاصر مشاہیر سے مولانا آزاد کے تعلقات و روابط کی داستان اور افکار و سیرت کا موازنہ۔ صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۷۵ روپے (مجلد)

۱۶۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی - ایک سیاسی مطالعہ: از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری۔ شیخ الہند کی سیاسی خدمات پر تبصرہ اور سیاسی خطبات، فتووں اور خطوط کا مجموعہ۔ صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۵۱ روپے (مجلد)

۱۷۔ افادات آزاد: مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری۔ ادبی و مذہبی استفسارات کے جوابات و ملفوظات کا فکر انگیز مجموعہ۔ تصحیح و اضافہ شدہ آزاد صدی ایڈیشن۔ صفحات: ۲۰۰، قیمت: ۶۰ روپے (مجلد)

۱۸۔ تحریک ہجرت: از ڈاکٹر معین الدین عقیل، مرتبہ: شاہد حسین خان۔ ۱۹۲۰ء میں برعظیم پاک و ہند سے ہجرت افغانستان کی تاریخ اور افکار و دستاویزات۔ ایک عظیم قومی عمل کی عبرت انگیز روداد۔ صفحات: ۱۴۳، قیمت: ۵۰ روپے (مجلد

۱۹۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ: از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری۔ ساتویں صدی ہجری کے عظیم محدث، مصلح، مجدد اور مجاہد کی زندگی اور کارناموں کا تذکرہ۔ صفحات: ۱۱۶، قیمت: ۳۵ روپے (مجلد)

۲۰۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت: از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری۔ مولانا آزاد کی صحافت کے خصائص اور خدمات کا جامع تذکرہ۔ اخبارات کے مضامین کے اشاریے۔ صفحات: ۲۳۲، قیمت: ۶۵ روپے (مجلد)

۲۱۔ ایک علمی خاندان: از شگفتہ رضوی۔ مولانا آزاد، ان کے والد، ہمشیرگان، برادرِ بزرگ، اہلیہ، خسر اور برادرِ نسبتی کے حالات اور علمی ادبی خدمات کا تذکرہ۔ صفحات: ۳۴۶، قیمت: ۷۰ روپے (مجلد)

۲۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد (آثار و افکار): مرتبہ و مؤلفہ پروفیسر محمود واجد ہاشمی۔ مولانا آزاد کے شاگرد ایم ای ذکریا کے نام مولانا کے خطوط، مولانا سے متعلق ڈائری اور انٹرویو مع تبصرہ۔ صفحات: ۱۲۰، قیمت: ۳۰ روپے (مجلد)

۲۳۔ ارمغان آزاد: مؤلفہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری۔ مولانا آزاد کا کلام اور ۱۹۱۰ء تک کے دستیاب شدہ مضامین کا مجموعہ۔ مع تنقید و تبصرہ۔ صفحات: ۲۵۰، قیمت: ۷۵ روپے (مجلد)

۲۴۔ انڈیا ونس فریڈم (اردو): از ابوالکلام آزاد، راوی پروفیسر ہمایوں کبیر، مترجم: محمد مجیب، تکمیل ترجمہ تیس صفحات اور حواشی و مقدمہ از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری۔ صفحات: ۳۲۸، قیمت: ۰۰۰ روپے (مجلد)

مکتبہ شاہد

۱ / ۹ علی گڑھ کالونی۔ کراچی ۷۵۵۰۰

تاریخِ ملّتِ اسلامیہ ہندوستان کے ایک اہم دور کی سب سے مستند کتاب حوالہ

مولانا محمّد علی
اور
اُن کی صحافت

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کے قلم سے

مولانا محمد علی شاعر، ادیب، خطیب، سیاستدان سب کچھ ہی تھے

لیکن

اُن کے ذہنی و فکری کمالات کا اظہار سب سے زیادہ صحافت کے میدان میں ہوا

کامریڈ اور ہمدرد کے اجراء کی تاریخی سرگذشت

کامریڈ اور ہمدرد میں کام کرنے والے اہلِ قلم اور کارکنوں کے حالات کا مُرقع،

اور

کامریڈ اور ہمدرد کے مقالات افتتاحیہ اور ہمدرد کے تمام اہم مشمولات کے اشاریے!

اس آئینے میں آپ وقت کے اہم مسائل کا عکس اور ہندو مسلم سیاسی راہنماؤں کے افکار و سیرت کے حقیقی خد و خال دیکھ سکیں گے

شعر و ادب، تذکرہ و سوانح، صحافت و سیاست اور تاریخ ملک و قوم کے ہر پہلو اور

مولانا محمد علی کے افکار و سوانح پر تصنیف و تحقیق

کے لیے حوالہ کی ایک ناگزیر کتاب

قیمت ۷۰ روپے　　مجلد　　سفید کاغذ

مکتبہ شاہد

۱۰/۹ علی گڑھ کالونی۔ کراچی ۷۵۸۰۰

MS
Maktaba-e-Shahid

9/1, Aligarh Colony,
Karachi-75800.